لندن کی ایک رات نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اُردو)

مقالہ نگار

نزاکت اقبال

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

لندن کی ایک رات نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار

نزاکت اقبال

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: لندن کی ایک رات نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی مطالعہ

پیش کار: نزاکت اقبال

رجسٹریشن نمبر: 1208/MPhil/Urdu/S16

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان وادب اردو

ڈاکٹر روبینہ شہناز ________________

نگران مقالہ

ڈاکٹر نازیہ یونس ________________

معاون نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ________________

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈئر محمد ابراہیم ________________

ڈائریکٹر جنرل

____

تاریخ

اقرار نامہ

میں نزاکت اقبال حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے نگران ڈاکٹر روبینہ شہناز اور معاون نگران ڈاکٹر نازیہ یونس کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

نزاکت اقبال

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

فہرست ابواب

مقالے کا دائرہ کار

میری تحقیق کا عنوان ''لندن کی ایک رات نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ'' ہے۔ میں نے اپنے مقالہ کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب میں نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات کا تعارف اور بنیادی مباحث، برصغیر کی سیاسی و سماجی صورت حال کا نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی عہد کا جائزہ اور نو آباد کاروں جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں کے اپنے عہد اور مابعد اثرات کا تقابلی جائزہ و تجزیہ پر مشتمل ہے۔

دوسرے باب میں 'لندن کی ایک رات' کا موضوعاتی مطالعہ جس میں عمومی، مارکسی، اور نو آبادیاتی و مابعد نو آبادیاتی موضوعات شامل ہیں۔ کسی ایک موضوع کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک معاشرہ یا ملک میں تمام موضوعات مل کر خاص قسم کے حالات و واقعات کو جنم دیتے ہیں، ان موضوعات کو اپنے عہد کی ضرورت و اہمیت اور نو آبادیاتی و مابعد نو آبادیاتی اثرات کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں 'لندن کی ایک رات' کے کرداروں کا نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تناظر میں نفسیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ کرداروں کو نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی عہد کی ذیل میں دیکھا گیا ہے خاص طور پر انگریز نو آباد کار کے عہد اور مابعد اثرات کے رد و قبول کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ نو آبادی کا نو آباد کار کے اثرات میں پیدا ہونے والی مخصوص ذہنیت میں کرداروں کو نفسیاتی طور لحاظ سے دیکھنے اور پرکھنے پر مشتمل ہے۔

باب چہارم میں ناولٹ لندن کی ایک رات کے اسلوب، تکنیک کا جائزہ نو آبادیاتی دور کیے اثرات کے تناظر میں لیا گیا ہے۔ جس میں نو آبادیاتی عہد میں تشکیل پانے والے اسلوب کو شعور کی رو، اور سرریئلزم کو اپنے وقت یا عہد کے اثرات کی کاوش پر مشتمل ہے۔

باب پنجم میں مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات پر مشتمل ہے۔

Abstract

When the conception of colonialism idea started or intiated, there did is not found any prestigious opinion that to whom people included in it but in this vision or ideology one of the most prominent persanality is Mr Adward saeed seems clearly. In colonialism victor and defeater have a combination even that victor have everlasting impacts on it. This conception and symptoms investigated in post colonialism.

In the regime of colonialist and after post colonial effect have changed in very large scale.the colomialists implement heir civilization, culture,social and political policies to arrange thier occupation which have comfortable and ease in this reigon and a suitable envirment available for post colonialist but sometime there laid after post colonial teneor.these impacts included in life and after all segments of society post colonial effect have been presisely mentioned and its colonial priod have been studied in my thesis"The night of london colonial and post colonial study".The above mentioned topic consist on five chapters.

In 1st chapter the start of colonial and post colonial period and its policies aspecially after in1857 have been discussed. In this chapter shows that how colonialist used tatictss to brain washing by astonished way and currently shows its impacts on occupied area.

2nd chapter novlet comprises on the intensive reading in which social and economic topics and colonial and post colonial topics comprised in this chapter colonial and post colonial idea its relation and effcets are discussed .The psychologial study of the charaters heve been mentioned.

In 3rd chapter colonial and post colonial impacts and brain storming are as following had they did selflessnes and effect and rules of occupied nation.

Chapter 4th on the night of london there are many methods and criterias here colonil and post colonial analysis mentioned the literature of colonial and post colonial period its methods and anylasis exprience discussed.

In 5th chapter comprised on the genral anlysis in which many outcomes and advantages have been presented.

مقالے کا مقصد

بر صغیر میں نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی دور اپنے عہد اور مابعد اثرات کے حوالے سے منفرد پہنچان رکھتا ہے۔ بر صغیر کی تاریخ میں نو آبادیاتی اور مابعد آبادیاتی دور تہذیبی و ثقافتی تبدیلی کا سبب بنتا ہے۔ اس عہد کا مطالعہ اور تجزیہ خاص اہمیت کا حامل ہے نو آباد کار کے ایک طرف اپنے عہد کے اثرات ہیں اور اس کے بعد مابعد نو آبادیاتی صورت حال نے بھی اپنا رنگ دکھانا جاری رکھا۔

مقالہ ''لندن کی ایک رات'' نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ میں ایک طرف اس عہد کے پس منظر میں اس ناولٹ ''لندن کی ایک رات''کا موضوعاتی اور خاص طور پر نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی موضوعات کو دیکھنا خاص اہمیت کا حامل ہے۔ دوسری طرف اس ناولٹ کے کرداروں کی ذہنی تشکیل میں اس دور کے کردار کا جائزہ لینا ایک منفرد خصوصیت ہے اور نو آبادیاتی عہد کے اسلوب اور تکنیک کا جائزہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔

اظہارِ تشکر

تکمیل مقالہ کے اس مواقع پر میں اللہ تعالی کے بعد اپنے والدین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر میرے لیے آسانیاں پیدا کیں ان کی محبت و خلوص کا شمار ممکن نہیں۔ میں اپنی نگران محترمہ ڈاکٹر روبینہ شہناز سربراہ شعبہ اردو، جنہوں نے میری سربراہی بھی کی اور ہمیشہ مجھے مطالعہ کرنے کے لیے نئی کتابیں پڑھنے کی نصیحت کی۔ ان کی شفقت و خلوص پر ہم ان کے ممنون ہیں۔

شریک نگران ڈاکٹر نازیہ یونس کا بے حد شکر گزار ہوں جن کا سمجھانے کا انداز نرالا ہے۔ دوران تحقیق جہاں بھی مشکل در پیش ہوئی مجھے آسان ترین الفاظ میں سمجھا کر اس مشکل کو آسانی میں بدل دیا اور میں تحقیق کام مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ڈاکٹر صاحبہ دوبارہ شکریہ۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ سے بہت کچھ سیکھا۔ ڈاکٹر نعیم مظہر کی رہنمائی میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ میں شعبہ کے تمام اساتذہ کرام کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ساجد جاوید کی نوازش کہ انہوں نے اس تحقیقی عنوان کے بارے میں اہم کتب سے نوازا۔

میں اپنے عزیز علی شان کا شکر گزار ہوں۔ جس نے میرے تحقیقی کام میں میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔

نزاکت اقبال

اسکالر ایم۔ فل اردو

”لندن کی ایک رات“ نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

باب اول:

نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات تعارف

الف) موضوع کا تعارف:

مجوزہ تحقیقی کام (لندن کی ایک رات، نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ) سجاد ظہیر کے ناولٹ ”لندن کی ایک رات“ کے نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ وتجزیہ پر مشتمل ہے اور خاص طور پر اس ناولٹ کے کرداروں کا نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تناظرات میں جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ناولٹ ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا اور ۱۹۳۸ء میں پہلی دفعہ شائع ہوا۔ درج بالا ناولٹ ایک طرف محکوم قوم اور معاشرہ کے نمائندہ رجحانات کا عکاس ہے تو دوسری طرف نو آباد کار کے ظاہری طور پر چلے جانے کے بعد (مابعد نو آبادیاتی اثرات) سے پیدا ہونے والی صورت حال کا بھی آئینہ دار ہے اور انہی تناظرات میں ناولٹ لندن کی ایک رات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوں کہ لندن کی ایک رات نو آبادیاتی عہد میں منظر عام پر آیا اس لیے اسے ایک طرف متعلقہ دور کے تناظر میں دیکھنا اہمیت کا حامل ہے تو دوسری طرف نو آباد کار کے وہ اثرات جن سے نو آبادی ابھی تک جان نہیں چھڑا سکی ان عناصر کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ناولٹ ”لندن کی ایک رات“ نہ صرف اپنے تخلیقی عہد کا نمائندہ ہے بلکہ مابعد نو آبادیاتی اثرات کی بھی بخوبی نمائندگی کرتا ہے۔

تحقیق کی اہمیت:

مجوزہ تحقیقی کام (لندن کی ایک رات نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ) کے ناولٹ ”لندن کی ایک رات“ کا نو آبادیاتی عہد اور مابعد نو آبادیاتی عہد کے تناظر میں جائزہ پر مشتمل ہے۔ اس ناولٹ کو برصغیر میں نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی عہد کے نمائندہ کی حیثیت سے دیکھنا اور اس کے کرداروں کا نو آبادیاتی اور مابعد

نو آبادیاتی اثرات کے تناظر میں جائزہ لینا مجوزہ تحقیق کی انفرادیت ہے۔ نو آبادیاتی عہد تو کسی حد تک اختتام پذیر ہو گیا ہے مگر اس کے مابعد اثرات سے نو آبادی (برصغیر) ابھی تک پیچھا نہیں چھڑا سکی۔

بیان مسئلہ:

اردو ادب کی دنیا میں سجاد ظہیر کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا شمار ''کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا'' اور ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ انہیں زیادہ تر بطور ترقی پسند دیکھا گیا ہے۔ سجاد ظہیر اپنے عہد کا نمائندہ ادیب ہے۔ غلام معاشرہ میں نو آبادی کے نمائندہ کی حیثیت سے ان کی آواز بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مجوزہ تحقیق (لندن کی ایک رات نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ) میں نو آباد کار اور نو آبادی کے باہمی تعلق، مخصوص حکمت عملی اور نو آباد کار چلے جانے کے بعد کے معاشرہ پر اثرات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

سجاد ظہیر کی شخصیت پر ایم اے کی سطح کے تین مقالہ جات انڈیا کی مختلف جامعات میں لکھے گئے ہیں۔ مگر وہ تینوں ایک ہی طرح کا کام ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' کو دیگر ناولوں کی ذیل میں تہذیبی اور نو آبادیاتی عہد کے تناظر میں سرسری طور پر دیکھا گیا ہے۔ مگر کرداروں کو نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی عہد کے اثرات کے تناظر میں نہیں دیکھا گیا۔ سجاد ظہیر کو زیادہ تر بطور ترقی پسند ہی زیر بحث لایا گیا ہے۔

تحدید، موضوعاتی اور زمانی تعین:

مجوزہ تحقیقی کام (لندن کی ایک رات، نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ) سجاد ظہیر کے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کے تجزیہ پر مشتمل ہے اس میں نو آباد کار کے طریقہ کار اور نو آبادی کی سوچ مخالفت یا تقلید اور ان کے خاص تعلق کا تجزیہ کیا گیا ہے اور بہ لحاظ عہد نو آبادیاتی دور کے نمائندہ رجحانات کا جائزہ شامل ہے۔

مقاصد تحقیق:

مجوزہ تحقیقی کام میں درج ذیل مقاصد شامل ہوئے:

۱۔ نو آباد کار اور نو آبادی کا تعلق (برصغیر کے تناظر میں)

۲۔ برصغیر نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تناظر میں

۳۔ برصغیر پر نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی اثرات کا جائزہ

۴۔ ''لندن کی ایک رات'' کا نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی اثرات کے تناظر میں جائزہ

تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل سوالات پیش نظر ہوں گے:

۱۔ نو آبادیاتی نظام سے کیا مراد ہے اور نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی عہد نے برصغیر پر کیا اثرات مرتب کیے؟

۲۔ ناولٹ لندن کی ایک رات میں سجاد ظہیر نے نو آباد کار اور نو آبادی کے باہمی تعلق کو کس طرح پیش کیا ہے؟

۳۔ لندن کی ایک رات میں نو آبادی کی مخصوص ذہنیت اور نو آباد کار کے طریقہ کار کی پیش کش کس طرح کی گئی ہے؟

پس منظری مطالعہ:

انسان اپنے ابتدائی دور میں خانہ بدوشی کی زندگی گزرتا رہا پھر ایک وقت کے بعد اسے جہاں پانی ملا (دریا کنارے) اس نے وہاں مستقل آبادی بنالی۔ نئی آبادی بنانے کی یہ پہلی شکل تھی اس وقت جگہ کی کوئی تقسیم نہیں تھی اور مالکیت کا تصور بھی نہیں تھا۔ اگلے مرحلہ میں مختلف قبائل مختلف علاقوں پر تسلط قائم کرتے ہیں

اور زمین مختلف قبائل میں تقسیم ہو جاتی ہیے، اب وسائل کے حصول کے لیے ایک طاقت ور قبیلے نے دوسرے قبیلے کی جگہ پر تسلط جمانا شروع کیا۔ اس سے اگلے مرحلہ میں مختلف ممالک وجود میں آتے ہیں، اب طاقت ور ملکوں نے غریب ملکوں پر تسلط قائم کرنا شروع کر دیا اور یہ تسلط مختصر اور طویل وقت تک قائم رہا مثال کے طور پر برطانیہ کا برصغیر پر تسلط۔ درج بالا تینوں نئ آبادی کی اشکال تھیں۔ موجودہ عہد میں فوج اور طاقت کے ذریعے تسلط نے ایک نئ صورت اختیار کی ہے کہ ایک طاقت ور ملک خاص طریقہ کار سے منڈیاں کنٹرول کر کے غریب ملکوں کو اپنی منشا کے مطابق استعمال کرتے ہیں جیسے آج کل پاکستان اور امریکہ کی صورت حال ہے۔ اس نئ آبادی کو بنانے کے عناصر میں طاقت اور تشدد مختلف شکل میں شامل ہیں۔ اگر نو آبادیاتی تسلط کے ارتقا پر نظر ڈالیں تو آج یہ پہلی صورت حال سے مختلف شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

نظری دائرہ کار:

مجوزہ تحقیقی کام سے جہاں برصغیر کی نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی صورت حال سامنے آئی ہے وہیں اس عہد کے اثرات کی تصویر بھی سامنے ہمارے سامنے آتی ہے اور نو آبادی اور نو آباد کار کے تعلق کی نوعیت کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ نو آباد کار کے چلنے جانے (مابعد نو آبادیاتی) سے پیدا ہونے والے اثرات منظر عام پر آتے ہیں۔

تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ تحقیقی کام میں دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا جائے گا، جس میں بنیادی اور ثانوی مآخذ سے استفادہ کیا جائے گا۔

ب) نو آبادیات، مابعد نو آبادیات بنیادی مباحث:

اردو میں عموماً لفظ کالونی استعمال ہوتا ہے "کالونی" کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں مرکز شہر سے ملحقہ آبادی کا تصور ابھرتا ہے۔ جو ایک طرف تو الگ حیثیت اور پہچان رکھتی ہے تو دوسری طرف وہ بہت حد تک مرکزی شہر سے وابستہ ہوتی ہے۔ نو آبادیات میں کالونی (coloni) کا مطلب اس سے مختلف اور وسیع ہو جاتا

ہے۔ یہاں مرکزیت کا دائرہ عمل ایک شہر اور اس سے وابستہ کالونی سے نکل کر مختلف خطوں اور براعظموں تک پھیل جاتا ہے۔ مرکز دور ہونے کے باوجود بہتر حکمت عملی سے اپنی کالونی کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ انسانوں کے ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ ابتدائی دور میں جب انسان مختلف قبائل کی شکل میں رہتے تھے اس دور میں بھی طاقت ور قبیلے نے ہمیشہ کمزور قبیلے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی یہ سوال خاصا اہمیت کا حامل ہے کہ ایک قبیلے نے کیوں ایسا کیا کہ وہ دوسرے کو یرغمال بنائے؟ ایک قوم نے دوسری اقوام کو کیوں زبردستی زیر رکھنے کی کوشش کی؟ تمام سوالوں کا بنیادی جواب ایک ہی سامنے آتا ہے کہ وسائل کے حصول کے لیے یہ ایک تسلسل کے ساتھ تاریخی چکر چل رہا ہے۔ طاقت ور ہمیشہ من مانی کرتے ہوئے کمزوروں سے ان کے نہ صرف وسائل چھین رہا ہے بلکہ ان کی جانیں تک ضائع کر رہا ہے۔ قبائلی نظام کے ارتقاء کے بعد جب مختلف ملک معرض وجود میں آئے تو ان کی نظر ہمیشہ کمزور کو تلاش کرتی رہی اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے مختلف طریقے اپنائے جاتے رہے ازل سے یہ قانون چلتا آرہا ہے کہ طاقت ور کمزور کو دبہ کر رکھتا آیا ہے یعنی ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کی بات صادق آتی ہے۔ ہر خطہ مختلف قدرتی وسائل سے مالا مال ہوتا ہے اور کسی نہ کسی حوالے سے اہمیت کا حامل ہوتا ہے وہاں پر رہنے والی قوم نے انہیں استعمال کرنا شروع کیا اور آبادی کے تناسب سے وسیل کم ہوتے گئے تو اس قوم یا ملک نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا اور جہاں اس کا بس چلا یعنی کمزور ملک دیکھا اس کے وسائل حاصل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی اور ان وسائل کو حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جاتا رہا انگریزی میں نو آبادی کے لئے ''کالونی'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے۔

> Colonialism word comes from the Roman "Colonia" which meant farm or settlement and referred to Romans who settled in other lands but still retained their citizenship.[1]

لفظ ''Colonia'' کی جگہ اردو میں بھی انگریزی لفظ ''Coloni'' استعمال ہوتا ہے نو آبادیاتی تناظر میں دو الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں بلکہ فریق بھی یہی دو ہی ہوتے ہیں ایک ''نو آباد کار'' اور دوسرا ''نو آبادی''۔ ان دونوں میں فاتح اور مفتوح کا تعلق ہوتا ہے۔ فاتح کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے کیوں کہ وہ پہلے بھی اپنے مقابلے میں کمزور کو دیکھ کر وار کرتا ہے اور مفتوح ہمیشہ مغلوب ہوتا ہے۔

نو آبادیات ایک ایسا نظام ہے جس میں ایک طاقت ور طبقہ کمزور کو یرغمال بنا کر اس کے وسائل پر قبضہ کرتا ہے اور انسانی تاریخ کے طویل ارتقا میں یہ عمل کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے اگرچہ اس کے انداز بدلتے رہے ہیں مگر بنیادی مقاصد میں کوئی خاص فرق نہیں آیا، لیکن نو آباد کار کے طریقہ ہائے کار بدلتے رہے ہیں۔ مثلاً قبائل کا ایک خاص طریقہ تھا اس کے بعد قبائل کی تعداد میں اضافہ ہوا تو ان کے علاقہ میں وسعت آئی یعنی انہوں نے مزید خطے زیر کر لیے اس کے بعد مختلف ملکوں نے وسائل کے لیے دوسرے ترقی پزیر ملکوں پر قبضہ کا سلسلہ شروع کیا اور آج امریکہ اپنے مقاصد کے لیے ایک نیا بیانیہ اور انداز اپنائے ہوئے اسی نظام کو لے کر چل رہا ہے۔

بنیادی طور پر نو آبادیاتی علاقہ میں دو طرح کے لوگ بسے ہوتے ہیں ایک تو اصل مقامی باشندے جو پہلے سے وہاں رہائش پذیر تھے جس کو نو آبادی کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرا وہ جو بیرونی آنے والا (نو آباد کار) ہے جو ایک حکمت عملی، مخصوص طریقہ کار سے قابض ہوتا ہے اور پھر اپنے مقصد کی طرف بڑھتے ہیں۔

نو آبادیاتی دور میں نو آباد کار اور نو آبادی کے درمیان خاص قسم کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ یہاں بات برطانوی نو آبادیات کے تناظر میں کی جا رہی ہے، اور اسی عہد کو دیکھنا مقصود ہے اور برطانوی عہد کے تناظر میں Colonial اور Post-Conlonial صورت حال (Neo-Colonialism) کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ کیوں کہ اگر اس (برطانوی) عہد سے قبل کے نو آباد کار کی طرف جائیں تو مسلمان بھی بحثیت نو آباد کار کے یہاں گروہ در گروہ آتے رہے ہیں اور قبضہ بھی کیے رکھا اگرچہ مسلمانوں اور غیر مسلموں (یورپی) کے طریقہ کار اور مقاصد مختلف تھے مگر مسلمان بھی باہر سے ہی تھے۔ چند ایک نے تو باقاعدہ لوٹ مار کی اور وسائل سمٹنے کی اپنی پوری سعی کی۔ لیکن اس باب میں برطانوی عہد کو مکمل طور پر زیر بحث لانے اور بعد کے (مابعد نو آبادیاتی) اثرات کا جائزہ لیا جانا مقصود ہے۔ کیوں کہ یہ عہد مابعد اثرات کے حوالوں سے منفرد ہے۔

> Post.colonial is a theory which observed or recognized in the occupied reigon after colonialsm.[۲]

بحثیت مسلمان ہمارا یقین ہے کہ تمام حالات و واقعات فطری ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ایک حد تک انسان کو ایک صورت حال کو بدلنے کا اختیار حاصل ہے۔ نو آبادیاتی صورت حال بھی پیدا کرنے میں ایک بہت بڑا حصہ خود نو آبادی ڈالتی ہے اگر باہم مربوط رہے اور طاقت جمع رکھے تو اس طرح کی صورت حال پیدا ہی نہ

ہو مگر نو آباد کار بھی تراکیب کے جال بچھا کر اور خاص طریقوں سے مقامی باشندوں کو ہم خیال بناتا ہے۔ گویا شکاری تو ہمیشہ شکار کی تاک میں رہتا ہے۔ جیسے موقع ملا جھپٹ پڑا۔

نو آبادیات کے حوالے سے ایک بنیادی سوال اکثر ذہن میں ابھرتا ہے کہ یہ نو آبادیاتی کی صورت حال کیونکر پیدا ہوتی ہے اور کیونکر اس کو وسعت دی جاتی ہے۔

> انسان نے قدیم غیر طبقاتی نظام سے نکل کر خاندان، جائیداد اور ریاست کی تکون میں قدم رکھا تو وہ اعلیٰ وادنی طبقات میں تقسیم ہو کر استحصال کا شکار ہونے لگا وہاں اس نے دیگر انسانی گروہوں پر قبضوں اور فتوحات سے ابتدائی نو آبادیات کا آغاز کیا۔[۳]

بہ عین یہی معاملات جو ایک گروہ کو درپیش تھے وہی معاملات ایک ملک کو درپیش آئے اور وہ ملک انتشار کا شکار ہوا اور پھر طاقت ور ملک جو انتظار میں تھا اس نے صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر اپنا قبضہ قائم کر لیا۔ بر صغیر میں نو آبادیاتی دور کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک عہد ۱۶۰۰ء سے پہلے کا جس کو مسلمانوں کا اور دوسرا ۱۶۰۱ء سے بعد کا جسے یورپی عہد کا نام دے سکتے ہیں۔ یورپی اقوام سے بر صغیر میں پہلے پرتگیزی لوگ یہاں (بر صغیر) وارد ہوتے، اسکوڈے گاما سے عہد شروع ہوا یہ عہد دیگر اقوام (نو آباد کاروں) کے مقابلے میں قلیل ہے اور اس کے بعد دوسرا دور ولندیزیوں کا ہے انہوں نے مشرق (بر صغیر) سے تجارت کے لئے ایک کمپنی بھی تشکیل دی گئی۔

فرانسیسی دور بر صغیر میں یورپی نو آبادکاری کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ فرانسیسی عہد جس میں برطانیہ بھی بر صغیر میں گھس چکا تھا اور ان دونوں کی باہمی مڈھ بھیڑ ہونا ایک لازمی امر تھا کیونکہ یہ دونوں ملک یہاں کی تجارت میں اجارہ داری چاہتے تھے ان کے لیے تجارت میں ایک دوسرے کی حصہ داری نا قابل قبول تھی اس لیے وقفے وقفے سے ان دونوں ملکوں میں تصادم ہوتا رہا اور آخر میں برطانیہ بہتر حکمت عملی کی وجہ سے کامیاب ہوا۔

> انگریزوں کے سامنے فرانسیوں کے قدم نہ جم سکے اور انہیں بالآخر برطانوی کمپنی کے لئے میدان خالی چھوڑنا پڑا[۴]

اس دور کے ایک سپہ سالار انواب انوار الدین کو فرانسیسی فوجوں نے مہارت سے شکست فاش سے دو چار کیا اس کے بعد فرانسیسیوں کے لیے قدرے میدان ہموار نظر آنے لگا مگر اس کے مقابلے میں برطانوی بہتر نظم و نسق سے لڑے اور فرانسیسی فوج کو علاقے خالی کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان دونوں اقوام کا واسطہ یا تسلط

تقریباً ایک ہی علاقہ سے تھا۔ کرناٹک کی لڑائی اور، جنگ پلاسی کے بعد برطانوی نو آباد کار مضبوط سے مضبوط ہوتا گیا۔

برصغیر میں نو آبادیاتی عہد سکندر اعظم، محمد بن قاسم، منگول، تغلق، لودھی، مغل اور یورپی اقوام پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسیوں سے ہوتا ہوا برطانوی عہد تک آتا ہے۔ مابعد اثرات (انگریز نو آبادکار کے) ابھی تک مسلسل چل رہے چوں کہ انگریز سب سے طاقت ور نو آبادکار تھے اس لیے مابعد اثرات بھی دیرپا ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ دور (برطانوی) خاص اہمیت کا حامل اس لیے بھی ہے کہ یہ دور اپنے اندر مختلف ارتقائی مراحل رکھتا ہے، جن سے ہم تا حال گزر رہے ہیں یعنی اس عہد کے تناظر میں مابعد نو آبادیاتی کیفیت زیادہ دیرپا رہی ہے۔ ایک طویل نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی صورت حال کو دیکھ کر بے اختیار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقوام عالم کی نظریں ہمہ وقت (حال بھی) برصغیر پر کیوں مرکوز رہی ہیں؟ ایسی یہاں (برصغیر) کونسی خاص بات یا مفادات تھے جن کو حاصل کرنے کے لیے ملکوں اقوام کو برصغیر کی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور وہ مختلف اوقات میں اسے نو آبادی بناتے رہے ہیں۔

۱۶۰۰ء میں "ایسٹ اِنڈیا کمپنی" کا قیام عمل میں آیا اور ایک وقت میں خود کمپنی کے اختیارات کے حوالے سے مباحث برٹش پارلیمنٹ میں ہوتی رہی۔ کمپنی نے برصغیر کو اتنا لوٹا جتنا ان کا بس تھا۔ مختلف حوالوں سے اب تو اعداد و شمار بھی واضح ہونے لگے ہیں۔ کمپنی میں ملازمین کو بہت سے اختیارات حاصل تھے۔ جن کو وہ اپنی مرضی سے استعمال کرتے تھے اور مقامی نو آبادی کے وسائل کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے۔ برطانیہ نے بھی کوئی کمی نہ چھوڑی اور غریب ملازم چند سالوں میں ارب پتی ہو گئے۔

> ایسٹ اِنڈیا کمپنی کی تاریخ قریباً اڑھائی سو سال پر پھیلی ہوتی ہے۔۔۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے ایک قانون نے کمپنی سے تجارت کا حق چھین لیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد برٹش پارلیمنٹ نے کمپنی اختیار حکومت کو بھی ختم کر دیا۔[۵]

ایسٹ اِنڈیا کمپنی ایک طویل عرصہ تک پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور ان سے پہلے مقامی عہدے داروں، سالاروں کے ساتھ لڑائیوں میں الجھی رہی مگر پھر بھی اس دور میں بھی کمپنی نے دولت سمٹنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ دوسری طرف وہ مختلف محاذوں پر مخالفین سے برسرپیکار رہی اور مسلسل منزل کی طرف گامزن رہی کبھی بھی کمپنی نے نقصان کا سودا نہیں کیا۔ کمپنی نے ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت برصغیر سے برطانیہ منتقل کی۔ تجارت کا تو بس ایک لبادہ اوڑھ رکھا تھا اصل میں تو یہاں کے وسائل کو لوٹنا مقصود تھا وہ مکمل

طور پر اس مقصد میں کامیاب رہی یا دوسرے لفظوں میں چھینی ہوئی دولت اور وسائل جن میں خام مال بھی شامل تھا، اسے برصغیر سے برطانیہ منتقل کیا اور خوب ترقی کی منزلیں طے کیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر بحیثیت ایک "کالونی" کے براہ راست برطانیہ کے زیر نگیں ہو گیا ملکہ وکٹوریہ برصغیر کی ملکہ بن گئیں یہ بھی اس وقت قدم اٹھایا گیا جب " کمپنی بہادر " بہت سے وسائل اپنے مخالفین کے خون سمیت سمیٹ چکی تھی۔ توپ دم کرنا اور سر عام پھانسی سے مخالف لوگوں کو ختم کیا گیا۔ اس میں دہشت ایک اہم عنصر کے طور پر استعمال کی گئی۔ لوگوں کو دردناک سزائیں دی گیں اس میں کمپنی بہادر کا ایک ہی مقصد تھا کہ آئندہ کے لیے کوئی سر اٹھانے سے پہلے سو بار سوچے کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ دہشت کے ذریعے بہت حد تک مقامی نو آبادی کو دبا کر رکھا گیا اور اٹھنے والے سروں کو کچل دیا جاتا۔ من پسندوں کے نوازنے کا سلسلہ بھی یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

> نو آبادیاتی صورت حال، فطری اور منطقی صورت حال نہیں ہے۔۔۔اسے پیدا کیا جاتا اور تشکیل دیا جاتا ہے اس لیے مخصوص مقاصد کو سامنے رکھا جاتا ہے۔[۶]

جب ایک قوم یا ملک کسی دوسری جگہ پر قبضہ کرتا ہے یا کسی طرح اس خطہ پر کنٹرول حاصل کرتا ہے تو اس کے بہت سے مقاصد ہوتے ہیں برطانوی بھی اپنے انہی مقاصد کے حصول کے لئے یہاں آئے۔ برطانوی بادشاہت سے الگ ہونے کے بعد (۱۹۴۷ء) مابعد نو آبادیاتی صورت حال پیدا ہوتی ہے جیسے مابعد نو آبادیات کہا جاتا ہے جیسے انگریزی میں "Neo Colonialism" یا "post colonialism" کہا جاتا ہے۔ ایک عرصہ تک انگریزوں نے برصغیر کو نو آبادی بنائے رکھا اور اپنے معاشی مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے ایک خاص طریقہ کار اختیار کیا۔ اگر ایک سطح تک اس بات کو مان لیا جائے کہ مفتوح یا نو آباد کار کے مابعد اثرات فطری ہوتے ہیں تو برصغیر کے حوالہ سے یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ مسلمانوں نے انگریزوں کے مقابلے میں برصغیر پر طویل عرصہ حکومت کی اور انہوں نے بھی مقامی نو آبادی پر اپنے اثرات مرتب کیے اب مابعد نو آبادیاتی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو انگریزوں کے آنے کے بعد مسلمانوں جو کہ بحیثیت نو آباد کار آئے تھے ان کے اثرات زائل ہو گئے وہ دیر پا نہیں تھے یا دیر یا ثابت نہیں ہو سکے مگر انگریزوں سے آزادی (ادھوری آزادی) حاصل کرنے کے بعد ہم آج بھی اس دور سے نہیں نکل سکے۔

The idea or thought which captured or occupied the specific reign by the specific group to abondone the basic needs or requirements. [۷]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نو آبادیات نے مختلف اشکال تبدیلی کی ہیں لیکن کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔ دوسری طرف مابعد نو آبادیاتی اثرات بھی موجود رہے ہیں۔ ایک قوم (خطہ) اسی وقت ہی زیر ہوتی ہے جب وہ مختلف حوالوں (سیاسی، معاشی، ثقافتی) سے زوال پذیر ہوتا ہے۔ ان میں سب سے اہم مضبوط اور مرکزی حکومت کا ناہونا ہے۔ برصغیر میں جب انگریزوں نے تسلط قائم کیا تو یہاں برصغیر میں بھی ایک انتشار کی کیفیت تھی۔ اس لیے انہوں نے آسانی سے یہاں قدم جمالیے۔ اس انتشار کو "تقسیم کرو اور حکومت کرو" فارمولے کا نام دیا جاسکتا ہے۔

ایک پیروکار کو پنڈت نے ایک خاص وقت تک "چلا" کاٹنے کے لیے کہا کہ تم نے یہ تصور کر کے ۴۰ دن ایک غار میں گزارنے ہیں کہ میں گائے ہوں اس نے ایسا ہی کیا جب مقررہ وقت ختم ہوا تو پنڈت اس کے پاس آیا اور کہا کہ اب تم باہر آجاؤ تو اس آدمی نے جواب دیا کہ غار کا دہانہ زیادہ کھولا نہیں میرے سینگ اس سے اٹک جائیں گے۔ یہی صورت حال ترقی پذیر ملک پاکستان کی ہے۔ ہمارے حکمرانوں کے پاس اپنا کوئی نظام ہی نہیں یہ کہتے ہیں کہ اگر ان کے بنائے ہوئے اصول چھوڑ دیں تو ہم چل نہیں سکتے اس لیے مجبوراً انہی اصولوں کو اپنا رکھا ہے۔

> کولونیل ازم ایک نیاڈراما تھا (برصغیر کے لیے نہیں) جس کا اسکریٹ یورپ نے لکھا اور جیسے کھیلنے کے لیے افریکا، اشیا کی سرزمین کو منتخب کیا۔۔۔ [۸]

برصغیر ایک عرصہ سے نو آبادی چلا آرہا ہے (مابعد نو آبادیاتی صورت حال ابھی بھی جاری ہے) ایک وقت تک انگریزوں نے یرغمال بنائے رکھا مگر یہ برصغیر کے لیے نیا نہیں تھا، دوسرا ٹھیک ہے مان لیا کہ برصغیر کو انگریزوں نے یرغمال بنائے رکھا مگر اب تو وہ چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ مگر ہم اب بھی انہی کے بناتے ہوئے راستوں پر چل رہے ہیں۔ ملک (پاکستان کے حوالہ سے خصوصی) پر آج بھی وہی خاص طبقہ حکمرانی کر رہا ہے جس کو انگریزوں کے عہد میں بھی ان کی آشیر باد حاصل رہی انہی کا پسندیدہ طبقہ آج بھی ہم پر مسلط چلا آرہا ہے۔ بس ان مہروں کی شکل بدلتی رہی ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل ہمارے حکمرانوں اور بیوروکریسی کو مشکل نہیں تھی انگریز برصغیر میں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے تھے اور ان کی خاص مقاصد کے تحت ذہن سازی کے بعد انہیں کوئی بھی منصب سونپا جاتا تھا مگر اب وہی مہرے اچھی خاصی رقم خرچ کر کے لندن سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور یہاں (پاکستان) آکر حکمرانی کرتے ہیں۔

> انگریزوں کا ہندوستان میں آنا ہندوستان کی اپنی داخلی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا۔ ان کے ابتدائی مقاصد میں ہندوستان سے تجارت تھی۔۔۔[۹]

میرے خیال میں ایسٹ انڈیا کمپنی یا برطانوی حکومت کا یہ مقصد نہیں تھا کہ برصغیر پر تسلط قائم کیا جائے ان کا مقصد تجارت تھا اور تجارت میں مغل حکمرانوں سے زیادہ سے زیادہ سہولتوں کا حاصل کرنا۔ اس کے لیے کمپنی نے ہر حربہ استعمال کیا رشوت کی ضرورت پڑی وہ دی خوشامد کے رنگ میں کام نکلتا تھا تو خوشامد کی۔ اگے چل کر مغل حکمرانوں کی کمزوریوں اور باہمی انتشار کی وجہ سے حالات سازگار ہوتے گئے اور وہ اپنے قدم مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے گئے۔ یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ جب کمپنی کا تسلط مقصد نہیں تھا تو فوج کیوں رکھی یہ سوال اہمیت کا حامل ہے۔ ایک تو مرکزیت کمزور ہونے دوسرا دیگر گروہوں کا لوٹ مار کا بازار گرم کرنے کے نتیجے میں کمپنی نے اپنی تجارت، مفاد اور مال کی حفاظت کے لیے فوج رکھی جس میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ کمپنی نے ابتدا سے ہی جارحانہ پالیسی رکھی کہ تجارتی مقاصد کے حصول میں رکاوٹ بننے والوں کو راستے سے ہٹاتے جاؤ اور وہ اپنی اس حکمت عملی میں کامیاب رہی۔

مابعد نوآبادیات جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے نوآبادیات کے بعد کے اثرات کا دور ہوتا ہے، اس کا زیادہ تر تعلق تہذیب و ثقافت سے ہوتا ہے جس میں نوآبادکار ایک علاقہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور وہاں مقامی لوگ (مقامی مہرے) انتظام و انصرام سمبھالتے ہیں اور لوگ اسے آزادی کے نام سے جانتے ہیں۔

> اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف تک ہندوستان میں کمپنی نے قدم جما لیے تھے اہم سیاسی اور تجارتی کامیابیوں کے بعد اپنی اس خواہش کے لیے کوشاں ہوئی جیسے ثقافتی غلبے کی خواہش کہنا چاہیے۔۔۔[۱۰]

مابعد نوآبادیات میں ثقافتی مطالعہ اور اس کے اثرات خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انگریزوں نے اس سلسلے میں خاص ذہن سازی کا ایک تسلسل کے ساتھ انتظام کیا(لندن کی ایک رات میں عارف اس کی مثال ہے) اور اس لحاظ سے مقامی نوآبادی کو یہ باور کروایا کہ ان کی تہذیب و ثقافت ادنی درجے کی ہے اور

گوروں کی اعلیٰ ہے۔ کمپنی سیاست کے ساتھ ساتھ ثقافتی لحاظ سے بھی اپنا تسلط چاہتی تھی۔ اور اسی سلسلے میں انگریز نو آباد کار نے اپنے تسلط کو قائم رکھنے اور اسے پھیلانے کے لیے نو آبادی کو خاص رخ پر ڈھالنے کی طرف خاص توجہ دی اور یہی اس کی کامیابی کا راز بھی ہے مقامی آبادی کو یہ باور کر وایا کہ اصل میں ہماری ثقافت کی تقلید کرو تمہاری ثقافت قابل عمل نہیں۔ مقامی آبادی میں اکثریت اس بات کی قائل ہو گئی۔

جب کسی ملک پر تسلط ہوتا ہے اور وہ نو آبادی کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو وہاں کی آبادی میں دو گروپ بن جاتے ہیں ایک مخالفت کرنے والا یعنی آزادی کے لیے کوشش کرنا والوں کی، ان کی تعداد ابتداء میں بہت کم ہوتی ہے۔ اور نو آباد کار کو یہ کم تعداد بھی ہضم نہیں ہوتی کیوں کہ یہ چنگاری کسی وقت بھی بھڑک سکتی ہے اور دوسرا گروپ جس کی اکثریت ہوتی ہے وہ تقلید میں ہی عافیت سمجھتا ہے بر صغیر میں تقلید کرنے والے آج بھی عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور مخالفت کرنے والوں نے اپنی جانیں گنوا دیں اور اگر بچ نکلے تو ان سے سب کچھ چھین لیا۔ ان کے لیے جینا محال کر دیا گیا۔ اپنے گھر (بر صغیر) میں ان کے لیے اس طرح کے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ انہیں زندگی کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

> انگریزوں نے (بر صغیر میں) اجتماعی نسل کشی کی بجائے طاقت کے استعمال کی ایک اور صورت دریافت کی۔ ۳۰ کروڑ آبادی کے ہندوستان پر صرف چند ہزار بر طانوی سپاہی ملازمین نے قبضہ کیے رکھا۔۔"

بنیادی طور پر قبضہ کو دو طرح کے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور خاص طور پر نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تناظر میں اس کی دو شکلیں سامنے آتی ہیں ایک تو بر طانوی قبضہ تھا جس میں انگریزوں نے قتل و غارت کی اور اپنے مخالف باغیوں کو بری طرح سزائیں دیں اور انہیں نشان عبرت بنایا تاکہ دیگر عوام میں ہمارے خلاف ہتھیار نکالنے والا اپنے نتائج دیکھ لے یہ ظاہری قبضہ کی صورت ہے۔ دوسری صورت مابعد نو آبادیات کی ذیل میں آتی ہے انگریزوں نے ایک طویل مدتی منصوبہ بندی سے حالات کو ہموار رکھنے کی کوشش کی۔ اس میں ثقافتی غلبہ خاصا اہم ہے جس میں شعبہ تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے جو ایک بہت اہم ہتھیار کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

انگریز نو آباد کار نے بر صغیر پر تسلط کو بر قرار رکھنے اور اسے طول دینے کے مختلف ہتھکنڈوں استعمال کیے اس میں سب سے پہلے تو ظاہری طاقت کا استعمال اہم ہے جس کے تحت باغیوں کو سر عام پھانسیاں دی گئیں

اور بہت سے لوگوں کو توپ دم کیا یہ سب سے پہلا اور اہم طریقہ تھا کہ کوئی ہمارے سامنے سر نہ اٹھا سکے باقیوں کے لیے ایک طرح کا سبق ہو کہ مخالف رستے کے انتخاب سے ہمارا حال بھی انہی جیسا ہو گا۔

> ہندوستان، آئرلینڈ، افریقی ممالک جائیداد تھے۔ انہیں حکمت عملی و تدبیر اور سازش و منصوبہ بندی ہی سے ہتھایا گیا طاقت سے غلام بنے اور اس وقت تک غلام رہے جب تک طاقت ایک اثر صورت ظاہر رہی۔۔۔"[۱۲]

طاقت کے استعمال میں برطانیہ (نو آباد کار) کو برتری حاصل تھی اور اس بات کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس طاقت سے راستے کو صاف کرنے میں بہت حد تک مدد ملی اس کے بعد یعنی جب ۱۸۵۷ء عام معافی کا اعلان ہوا تو یہی طاقت مختلف صورتوں میں ڈھل گئی۔ اور مختلف حوالوں سے مخصوص طرز پر ذہن سازی میں اہم کردار ادا کیا، جو مابعد قبضہ میں موئثر ثابت ہوا۔

دور غلامی میں نو آبادی کو قدم قدم پر اپنی پہچان کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ تقلید پسند گروہ کے لیے نو آباد کار ایک "امام" کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور انہیں اپنی تہذیب و ثقافت بری لگنے لگتی ہے۔ نو آباد کار انہیں پوری طرح یہ باور کروا دیتا ہے کہ دنیا میں وہ افضل ہیں اسی طرح ان کی تہذیب و ثقافت بھی برتر ہے اور مقامی (نو آبادی) تہذیب و ثقافت محض فضول ہے۔ نو آبادی میں اکثریت انہی کی زبان بولتی ہے اور اس بات پر فخر کرتی ہے کہ انہیں اپنی زبان نہیں آتی اور اسی طبقہ کو نوازا جاتا ہے۔

زبان کے معاملے میں نو آبادی کو بتایا گیا کہ دنیا میں افضل ترین زبان انگریزی ہے۔ اس زبان کو بولنے والے مہذب ہوتے ہیں اور مابعد نو آبادیات میں آج بھی ہمارا حال ایسا ہے اپنی علمیت اور بڑا پن ظاہر کرنے کے لیے آج بھی ہم انگریزی کا سہارا لیتے ہیں۔ ہماری عوام میں سے اکثریت خواندہ نہیں ہیں مگر پھر بھی ہمارے وزراء اور عدالتی کاروائی تمام تر انگریزی میں ہوتی ہے۔ ہمارے منتخب کردہ نمائندے ایوان میں انگریزی میں تقریریں کرتے ہیں۔ جو کہ ترقی پذیر ملکوں کی عوام کی اکثریت کے لیے محض شور کی حیثیت رکھتی ہے۔

> پوسٹ کالونیل کو سمجھنے کے لیے ہمیں پاکستان میں بیوروکریسی کی ساخت اور کردار کو برطانوی سامراج کے ہندوستان پر قبضے اور کالونیل دور کے مختلف مراحل کے پس منظر میں سمجھنا ہو گا۔۔۔"[۱۳]

انگریزی نو آباد کار ایک حکمت عملی اور تدبیر سے بر صغیر کی زبان اردو، فارسی کی جگہ پر انگریزی لے آیا اور باقی زبانوں کے جاننے والے ان پڑھ شمار کیے جانے لگے۔ یہاں سے بر صغیر میں دو نظام تعلیم کی ابتداء ہوتی ہے ایک طرف نو آبادی میں سے انگریزی پڑھنے والا طبقہ اور دوسری طرف مدارس میں عربی، فارسی اور دیگر مقامی زبانیں میں پڑھنے والے لوگ تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ نو آباد کار کا پیرو کار طبقہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور انہی کو نوازا جانے لگا جب کہ دیگر مطلوبہ حدف حاصل کرنے میں پیچھے رہے۔ اور معاشرہ میں دوسرے درجہ کے شہری بن کر رہ گئے۔ عزت، رتبہ اور معیار محض انگریزی زبان بن کر رہ گئی اور آج بھی ہم بیورو کریسی سمیت اعلیٰ طبقہ نو آباد کار کے بتائے ہوئے انہی راستوں پر چل کر حکومت کر رہا ہے۔

اعلیٰ طبقہ سے مراد یہاں وہ طبقہ ہے جن کو نو آبادیاتی دور میں جاگیروں سے نوازا گیا۔ بادشاہ کا ساتھ دینے والوں یا آزادی پسندوں سے نو آباد کار نے سب کچھ چھین لیا۔ کسی کے پاس تھوڑی بہت زمین تھی بھی تو اس پر بہت زیادہ ٹیکس لگا دیا گیا اور ان کی زمینیں اپنے حلیفوں میں بانٹ دی گیں اور انہی حلیف جاگیر داروں سے ہی لوگ انگریزی پڑھ کر بیورو کریسی میں گئے اور عوام کو پوری طرح لوٹنے میں نو آباد کار کے لیے آلہ کار بنے اور بدلے میں چند مراعات حاصل کیں۔ وہی طبقہ آج پاکستان کی رگوں سے خون چوس رہا ہے۔

نو آباد کار انگریز نے بر صغیر میں مقامی طرز حکومت کا طریقہ اختیار کیا اور مقامی راجوں اور اپنے ہی بنائے ہو جاگیر داروں کے ذریعے حکومت کی۔ مقامی لوگوں کے لیے تھوڑے سے اختیارات کا ملنا غنیمت سے کم نہیں تھا انہوں نے اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے مقامی آبادیوں سے خوب مالیا اکٹھا کر کے نو آباد کار کے سپرد کیا۔

> قبضے کا بنیادی اصول ہے کہ قبضے کو زیادہ دیر بر قرار نہیں رکھا جاسکتا۔ جب تک مقامی لوگوں کے ایک گروپ کو مفادات میں شراکت دار نہ بنالیا جائے۔۔۔[۱۴]

انگریز نو آباد کار نے بڑی حکمت عملی سے بر صغیر میں اپنے شراکت دار پیدا کیے اور انہی کے ذریعے اپنے مفادات کا حصول ممکن بنایا۔ اگر مقامی لوگوں کی حمایت حاصل نہ کی جاتی تو یہ قبضہ زیادہ دیر بر قرار نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ایک طرف بیورو کریسی کا محکما قائم کیا گیا جو آج بھی مابعد نو آبادیات کے تناظر میں جوں کا توں موجود ہے اور دوسرا طبقہ اسی معاشرہ سے پیدا کردہ جاگیر دار کا تھا۔

نسلی برتری کا تصور یہاں برصغیر میں بہت سرائیت سے اور مختلف اشکال میں آج تک موجود چلا آرہا ہے انگریز نو آباد کار نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نو آبادی کو یہ پوری طرح باور کر دار دیا کہ وہ نسلی لحاظ سے ادنی درجے کے ہیں اور ان کے لیے "کالے لوگ" "نیٹوز" اور دیگر حقیر الفاظ متعارف کروائے گئے۔ ان کالے لوگوں کو یہ بھی ذہن نشین کروادیا گیا کہ گورے اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور گوری چمڑی والوں کی تہذیب و ثقافت دنیا میں اعلیٰ درجہ کی حامل ہے یہ احساس دلانے کے بعد نو آبادی کو اپنا پیروکار رکھنے میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئیں اور وہ آنکھیں بند کیے نو آباد کار کی ہو بہو نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی تہذیب و ثقافت ان کو حقیر نظر آنے لگتے ہیں۔ نو آبادی نے اپنے آپ کو مکمل طور پر انگریز کے رنگ میں رنگنے کی پوری طرح سعی کی اور آج مابعد نو آبادیاتی دور میں ہم اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ وہ رنگ ہم پر اس حد تک چڑھ گیا ہے کہ اترنا محال ہو گیا ہے۔

انگریز نو آباد کار برصغیر سے ۱۹۴۷ء میں رخصت ہو گیا مگر ان کے بنائے ہوئے مہرے جن سے انہوں نے شطرنج کی بازی کھیلی تھی وہ آج بھی اسی طرح کی روش اپنائے ہوئے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی ہماری دولت کا رخ لندن کی طرف ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا دارالحکومت اسلام آباد نہیں لندن ہے۔ ترقی پذیر ممالک کا یہ المیہ ہے کہ حکمران طبقہ کا رویہ عوام کے ساتھ سردار، نوکر کا ہے۔ اکثر علاقوں میں یہ مہرے عام کسانوں اور مزدوروں کو اپنے سامنے زمین پر بٹھاتے ہیں۔ اپنے برابر بیٹھنا وہ اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

> جس طرح نو آبادیاتی دور میں انگریز حکمران مقامی روایت اور اداروں کو حقارت سے دیکھتے تھے آج بھی ہمارا طبقہ اعلیٰ انہی جذبات کا اظہار کرتا ہے۔۔۔[۱۵]

مابعد نو آبادیاتی تجزیہ کرتے ہوئے اگر ہم اپنے معاشرہ میں آس پاس کے لوگوں کا جائزہ لیں تو اعلیٰ طبقہ مقامی لوگوں سے مناسب فاصلہ رکھتا ہے اور عام مزدوروں اور محنتی لوگوں کے لیے "کمی" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ وہ جاگیر دار کی کوئی چیز اپنے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔

دوہرے نظام تعلیم کے تحت جس طرح کے آج کل امتحان ہو رہے ہیں ایک غریب مزدور یا عام کسان اپنی اولاد کو اس سطح کی تعلیم دلانے سے قاصر ہے ہمارا اشرافیہ اور اعلیٰ طبقہ جانتا ہے کہ اگر یکساں نظام تعلیم نافذ کر دیا گیا تو ایک موچی، مراثی کا لڑکا ان کی اولاد کو کبھی آگے نہیں نکلنے دے گا اور ہماری شان میں اس طرح کمی واقع ہو جائے گی اسی اصول کے تحت یکساں نظام نہیں لاگو کیا جاتا کہ حکومت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اشرافیہ اور طبقہ اعلیٰ نام نہاد جمہوریت کے راگ الاپتے ہوئے آج بھی جمہوری کے نام پر ڈراما کر رہا ہے اور

نو آبادیاتی عہد کا یہ ورثہ تمام عوام جن کی اکثریت ہے ان کو بحیثیت انسان ماننے کو بھی تیار نہیں اور مسلسل استحصالی رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ آج امیر طبقہ امیر تر اور غریب طبقہ غربت کی چکی میں پس رہا ہے۔ غریب آدمی کے لیے جمہوریت محض ایک ڈراما ہے ہو گا دو وقت کی روٹی بمشکل سے خاندان کو مہیا کرنے والے کسان، مزدور کے لیے ایک ووٹ کی پرچی کیا قدر و قیمت رکھتی ہے یہ ہم ایک جاگیر دار کے سامنے بیٹھے کسان کے چہرے کے تاثرات سے بخوبی لگا سکتے ہیں جو اس کے ڈر سے کانپ رہا ہوتا ہے اور وہاں اس نے زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ "لندن کی ایک رات" ناولٹ میں جیسا کہ نو آبادی کی جان کی قیمت بیان ہوئی ہے کہ ایک برابر ہے دس، پندرہ یعنی اگر گورے ایک کی جان جاتی ہے تو "کالے لوگ" پندرہ بھی اس کے بدلے میں کم ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی جائزہ سے یہی درج بالا بات صادق آتی ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کا قاتل عام ہو رہا ہے ان بے کسوں کی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی مگر گورے کسی کو کوئی مسلہ بنتا ہے تو دنیا کو سر پر اٹھا لیا جاتا ہے یہی تجربہ انگریز نے نو آبادیاتی عہد میں کیا، مقامی نو آبادی کو یہ بات باور کروادی گئی کہ ان کی عزت، مال، دولت گوروں کے مقابلے میں ہیچ حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا میں گوروں کی تہذیب ثقافت، زبان سب سے اعلیٰ و ارفع ہے نو آبادی پر یہ احسان ہے کہ ہم نے (انگریزوں) ان کو زیر کیا ہے۔

> ہندوستان ہمیشہ سے انسانی جھونپڑوں کے ہجوم میں چمکتے دمکتے محلات کی سرزمین تھی
> جہاں متوسط طبقے کا وجود نہیں تھا اور نہ حملہ آور (انگریز) تک جمہوریت کا کوئی جھونکا
> اس کی خاک کو چھو کر گزرا تھا۔۔۔[۱۶]

یہ ایک الگ بحث ہے جو لا حاصل ہے کہ اگر برصغیر کے سابقہ بادشاہوں (نو آباد کاروں) جو کہ مسلمان تھے انہوں نے محلات کی جگہ تعلیمی ادارے بنائے ہوتے تو کیا ہوتا۔ اب ہم جس طرح ہر نظریہ کو درآمد کر رہے ہیں کہ وہ یہاں کے مذاق اور زمین کے لیے مناسب یا یہاں چل سکتا ہے یا نہیں؟ کیا جمہوریت یہاں کارگر ثابت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ انگریز نو آباد کار سے پہلے والی آمریت میں برصغیر کی دولت وسائل کا رخ تو کم از کم باہر کی طرف نہیں تھا اور اس جمہوریت میں اس کا رخ موڑا گیا جو مابعد بھی اثر دیکھا رہی ہے اور ہمارے رہنماؤں کی جاگیریں لندن سے نکل رہی ہیں دولت کا رخ مابعد نو آبادیات میں بھی اس سمت میں ہی چل رہا ہے جس سمت پر انگریز نے اسے ڈالا تھا۔

یہاں تک تقریباً نو آباد کار کے مقاصد کے جواب سے ایک رخ زیر بحث آیا ہے کہ انگریز یہاں دولت اور وسائل کے حصوں کے لیے آیا تھا۔ کتنے پونڈ اور کب برطانیہ منتقل ہوئے یہ اعداد شمار بھی منظر عام

پر آ گئے ہیں دوسرا اہم مسئلہ بڑھتے ہوئے صنعتی انقلاب کے لیے خام مال کے حصول کا تھا تا کہ اپنی صنعتوں کا پیٹ بھرا جا سکے۔

برطانیہ ایک زرعی ملک سے صنعتی ملک میں تبدیل ہوا اور جی۔ڈی۔پی میں زرعی حصہ صنعتی حصہ سے کم ہو تا گیا۔ صنعت کو چلانے کے لیے خام مال کی ضرورت ہوتی ہے اس مقصد کے لیے انگریز نو آباد کار نے برصغیر کو زراعت سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور ریلوے لائنوں کا ایک جال بچھا کر خام مال برطانیہ منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ مابعد نو آبادیات میں برصغیر اور خاص کر پاکستانی جی۔ڈی۔پی کے اعداد و شمار دیکھیں تو آج بھی سب سے زیادہ حصہ زراعت پر مشتمل ہے اور ہم صرف خام مال ہی باہر کے ممالک کو برآمد کر رہے ہیں اور پھر اسی خام مال سے تیار کردہ سامان کی منڈی بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں آج تک کوئی مخلص اس بارے میں سوچنے والا رہنما نہیں ملا۔ نو آباد کار کے تقلید پسند آج بھی حکومت کرتے ہیں اور خدمت کے دعوے دار ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتداء اور درمیانی دہائیوں میں دنیا میں اس طرح کے حالات پیدا ہوئے ہیں کہ برطانیہ کے اپنے وجود کیے خطرات پیدا ہو گئے اور نو آبادیوں کو مجبوراً خیر آباد کہنا پڑا ورنہ انگریز نے کمال مہارت اور چالاکی سے اس طرح کی پالیسویں اور اداروں کی بنیادوں کو استوار کیا کہ آج بھی ہم ان سے جان نہیں چھڑا پائے۔

برصغیر میں نو آباد کار اور نو آبادی کے تعلق کی تاریخ خاصی قدیم ہے اور یہ مختلف صورتوں میں آج تک چل رہا ہے۔ ہم برطانوی نو آباد کار کے مابعد نو آبادیاتی اثرات سے ابھی تک نہیں نکل پائے۔ (یا نکلنا نہیں چاہتے) وقت کے ساتھ ساتھ دنیا کا منظر نامہ بدلنے لگا اور ۹/۱۱ کے واقعات کا ایک تسلسل شروع ہوا جو آج تک چل رہا ہے مگر ابھی تک پلڑا برطانیہ کی طرف ہی جھکا ہوا ہے امریکی اثرات گو زیادہ ہیں مگر وہ بیرونی یا خارجی ہیں لیکن برطانوی نو آباد کار کے اثرات داخلی ہیں۔ ہماری ترقی کے گراف، ہماری زبان اور کلچر تک کے جانچنے کے پیمانے آج بھی برطانیہ کے معیارات ہیں۔ برصغیر کی نو آبادی کو اپنی تہذیب و ثقافت جس میں زبان بھی شامل ہے" کے بارے میں اس حد تک احساس کمتری کا شکار کر دیا گیا کہ ہم آج تک اسی احساس میں گرفتار ہیں۔ ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی واپس اپنی اصلیت کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔

> مابعد نو آبادیاتی مطالعہ ثقافت اور فکر کو استعمار کی مخفی اور عیاں زنجیروں سے رہائی دلاتا ہے۔۔۔[۱۷]

ہماری ثقافت و فکر کو میرے خیال میں جکڑنے والی زنجیر دراصل خود ہمارے اپنے اندر ہے۔ نو آباد کار تو ہماری ذہن سازی کر کے چلا گیا کہ یہ کام اس طریقے اور ان اصولوں پر سر انجام دیا جا سکتا ہے اور ہم نے

اسے بخوبی اور احسن طریقے سے سر انجام دیا اور آج تک اپنا فرض سمجھاتے آرہے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے جیسی کہ ایک مثال دی ہے کہ ایک ہاتھی کا بچہ ابتدا میں جب زنجیر سے باندھا جاتا ہے تو وہ مسلسل اس زنجیر کو توڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کچھ عرصہ بعد جب وہ جوان اور طاقت ور ہو جاتا ہے تو وہ زور لگانا اور اپنی کوشش ترک کر دیتا ہے دراصل وہ ذہنی طور پر اس قید کو قبول کر لیتا ہے حالانکہ اب تھوڑی سی محنت سے وہ آزادی حاصل کر سکتا ہے مگر وہ طاقت استعمال نہیں کرنا چاہتا اور اسی قید کو بخوشی قبول کر لیتا ہے۔

پاکستان میں لوگوں کو احساس دلانے کی ضرورت ہے۔ اور ایک معیاری اور ''پیداواری'' طریقہ تعلیم لاگو کرنے کی ضرورت ہے جو اپنے معاشرہ اور کلچر سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہم کہاں تک ایک کے بعد دوسرے کے تابع رہیں گے۔ ہم سب کچھ ہوتے ہوئے اس سے نہ فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہیں اور اس پر عمل کرنے کے لیے ہماری مثال ایک اڑتی پتنگ کی ہے جس کی ڈور اگر اپنے ہاتھ میں نہ لی تو اب موجودہ دور میں ہمارے لیے معیار اب امریکہ یا چین طے کرے گا۔

موجودہ عہد میں ہمارے رہنماؤں کے دماغ ایک اور سمت میں سوچنے لگے ہیں اور بات بات پر ہمیں چین کی مثال دی جاتی ہے ٹھیک ہے ہمیں ان سے ترقی کا سبق حاصل کرنا چاہیے لیکن مسلسل ایک بات کرنے سے ہمارے لوگ ادھر ہی نکل کھڑے ہوتے ہیں کیوں کہ ہمارے پاس اپنا تو کچھ ہے نہیں ہم نے صرف نقل کرنا اور تقلید کرنا ہی سیکھا ہے۔

ج) نوآبادیات اور مابعد نوآبادیات کے برصغیر پر اثرات:

برصغیر میں نوآبادیاتی اثرات کے مقابلے میں مابعد نوآبادیاتی اثرات بہت زیادہ اہمیت کے حامل اور دیرپا ہیں۔ انگریزوں کی حکمرانی یا تسلط کا دورانیہ ایک طویل عرصہ پر پھیلا ہوا ہے اس میں دو بنیادی کردار ہیں ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری طرف خود برطانوی بادشاہ۔ برصغیر ان دونوں کے تحت طویل عرصہ تک پامال ہوتا رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ تقریباً دو سو پچاس سالوں پر محیط ہے۔ اس میں کمپنی نے طرح طرح کے طریقوں سے برصغیر کو لوٹا اور یہاں کے وسائل کو اپنی تجوریوں میں بھرا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر میں غداری کی رسم ڈالی اور پہلے جو چوری چھپے غداری کے واقعات تھے وہ اب ایک تسلسل کے ساتھ رونما ہونے لگے اور ایک طرف غداری اور دوسری طرف جاسوسی۔ یہاں کے مقامی درباریوں کو خریدا اور بیچا جاتا رہا۔ اس سودے میں غدار ہمیشہ ہی نقصان میں رہا اور فائدہ کمپنی اٹھاتی رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد اور بعد میں بھی کمال شاعرانہ انداز میں انگریز نے ان مقامی افراد کو اپنے لیے

استعمال کیا اور پھر ان کی طرف دیکھنا بھی گوارانہ کیا۔فاتح اور مفتوح کے تعلق میں اثرات کا بہاو ہمیشہ اوپر (نوآبادکار) سے نیچے (نوآبادی) کی طرف ہوتا ہے۔مگر ان اثرات کو قبول اور رد کرنے کا کوئی خاص معیار نہیں ہوتا۔برصغیر کے لوگوں نے ہمیشہ آنے والوں کے اثرات کو بخوشی ورضا قبول کیا اور خود کو مکمل طور پر اس رنگ میں رنگ لیا۔

انگریز نوآبادکاروں نے ایک طویل مدتی منصوبہ بندی کے تحت برصغیر کو زراعت پر جامد رکھا۔صنعتی لحاظ سے اسے ترقی نہیں کرنے دی۔مابعد آبادیات میں آج بھی ہم زراعت پر اکتفا کیے بیٹھے ہیں دوسری طرف ہماری جی۔ڈی۔پی میں موسمیاتی تبدیلی کی وجہ سے زراعت کا حصہ مسلسل کم ہورہا ہے نوآبادیاتی عہد میں ہم خام مال ہی پیدا کر رہے ہیں۔اس سے آگے ہمارے بس میں نہیں کہ اپنے خام مال کو استعمال کر سکیں۔جب تک وہی نوآبادکار کے مہرے جاگیر دار سردار اس ملک سے جڑے ہوئے ہیں۔

مابعد نوآبادیات میں ہم اپنے ورثے میں ملنے والی تہذیبی و ثقافتی کم ظرفی کو بخوبی سنبھالے ہوئے ہیں۔انگریزی لالف اسٹائل اور انگریزی کو انگریزی لب ولہجہ میں بولنا ہمارا اعلیٰ وارفع ہونے کی دلالت ہے۔نظام تعلیم دو حصوں میں تقسیم چلا آرہا ہے۔ایک طرف ایلیٹ کلاس کا نظام تعلیم ہے جو کہ مکمل طور پر انگریزی میں ہے اور دوسری طرف عام لوگوں کے لیے نظام تعلیم ہے۔مقابلے کے ہونے والے تمام امتحان انگریزی میں لیے جاتے ہیں اس طرح عام لوگ اس مہنگی تعلیم کی وجہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

ایلیٹ کلاس کے بچے آج بھی یورپ سے ڈگری حاصل کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں مقامی ڈگری ہولڈر کو پیچھے کر دیا جاتا ہے۔برانڈ کے چکر میں ہم خود برانڈڈ ہو چکے ہیں جس طرح تین سو پچاس سالہ دور میں انگریزوں کا عوام سے کوئی تعلق یا براہ راست کا رابطہ نہیں تھا آج بھی وہی طریقہ کار ہے آج بھی ہمارے حکمران ظل سجانی ہیں اور ان کے راستے میں آنے والے لوگ کیڑے مکوڑے ہیں۔

دنیا میں بہت سے ملک نوآبادی رہے ہیں اور ان کی ایک طویل تاریخ موجود ہے مگر وہ نوآبادیاتی اثرات کو زائل کرنے میں مکمل طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔اب ان کے معیارات بدل چکے ہیں، ان کے ہیرو ان کے اپنے لوگ ہیں مگر ہم اپنے ورثہ پر آج بھی نوآبادیاتی عہد کی طرح قائم ودائم ہے۔

د) سجاد ظہیر، سوانحی کوائف:

دنیا میں انسانوں کی بہت سی تعداد، امیر اور غریب دونوں اس طرح زندگی گزارتے ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا پہچانتا، وہ اپنی زندگی کے ایام پورے کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور ان کا کوئی قابل

ذکر کام نہیں ہوتا انسان کا نام اور خدمات ہی دنیا میں اسے ایک طویل عرصہ تک زندہ رکھتے ہیں۔ ان سے ایک اہم نام سجاد ظہیر کا ہے۔

سجاد ظہیر ۰۵۔ نومبر ۱۹۰۵ء کو موجودہ ہندوستان کے علاقے لکھنو میں پیدا ہوئے۔ سات بہنوں، بھائیوں میں چھٹے نمبر پر تھے۔ سجاد ظہیر کے والد کا نام وزیر حسن تھا وہ پیشہ لحاظ سے ایک وکیل تھے۔ اس شعبہ میں انہوں نے بہت نام کمایا اور انہیں انگریز کی طرف سے ''سر'' کے خطاب سے نوازا گیا سجاد ظہیر نے تعلیم کا آغاز گولڈن جوبلی اسکول سے کیا۔ ۱۹۲۲ء میں لکھنو کرسچین کالج میں داخلہ لیا، وہاں ان کے مضامین میں انگریزی، فارسی اور ہسٹری شامل تھی۔

> ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں (سجاد ظہیر) نے کالج کی لائبریری سے انگریزی اور فرانسیسی کتابیں حاصل کرکے پڑھ لیں ان میں اناول فرانس اور پیل کی کتابوں نے ان کے دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔[۱۸]

سجاد ظہیر کا تعلق ایک مالی لحاظ سے خوش حال گھرانے سے تھا۔ ان کے خاندان کا شمار ہندوستان کے پڑھے لکھے خاندانوں میں شمار ہوتا تھا گھر میں بھی بہت سی کتابیں پڑھنے کو مل گئی تھیں اور ابتداء سے ہی ایک مخصوص طرز پے رجحان سازی شروع ہوگئی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے لگی۔ سجاد ظہیر دوست احباب میں اور خاص کر پاکستان میں گزرنے والے وقت میں ''بنے بھائی'' کے نام سے جانے جاتے تھے پاکستان میں سجاد ظہیر نے چند سال چھپ کر گزرے اور پھر ہندوستان کو ترجیح دی۔ کمیونسٹ پارٹی کو پاکستان میں بھی پروان چڑھانے کا خواب ادھورا ہی رہا۔ سجاد ظہیر کے گھر کا ماحول مکمل طور پر سیاسی رنگ میں رنگا ہوا تھا اور سر وزیر حسن کا تعلق لکھنو اور دیگر ہندوستان کے نامور سیاست دانوں سے تھا اور وہ ان کے گھر میں ان لوگوں کا آنا جانا تھا۔ سجاد ظہیر بھی مختلف اوقات میں ان کے خیالات سے آگاہ ہوتے ہے۔ سر وزیر حسن بھی کانگرس کے ان لوگوں کے ہم خیال تھے جو یہ چاہتے تھے کہ برطانوی سرپرستی میں ہندوستان کو نیم خودمختاری دی جائے۔

سجاد ظہیر لکھنو میں ہونے والے کانگرس کے بہت سے جلوسوں میں شامل ہوتے رہے اور وہیں وہ ان کے خیالات و نظریات سے متعارف ہوتے ہیں۔ ان نظریات کی روشنی میں سجاد ظہیر کے سامنے اپنے وطن کا ایک مخصوص خاکہ بنتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں کارل مارکس کا نام لینا بھی جرم تھا۔ سجاد ظہیر نے بی۔ اے کے لیے جامعہ لکھنو میں داخلہ لیا۔ وہاں پر مضامین کا انتخاب، ہندوستان کی صورت حال

اور دنیا کا منظر ایک صفحہ پر اکٹھے نظر آتے ہیں بی۔ اے میں ان کے مضامین میں اکنامکس (معاشیات) ہسٹری اور انگریزی شامل تھے۔ معاشیات کا تعلق بنیادی طور پر طلب و رسد کے ساتھ اور خاص کر دولت کی پیداوار اور تقسیم کے طریقہ کار سے ہے۔ ان حالات میں سجاد ظہیر کے سامنے ایک طرف دنیا کا معاشی منظر نامہ آتا ہے اور دوسری طرف ہندوستان میں دو طبقے نظر آتے ہیں ایک وہ جو دولت میں کھیلتا ہے اور دوسرا جو ان کے لیے محنت تو دن بھر کرتا ہے مگر ایک وقت کا کھانا بھی بمشکل کھا سکتا ہے۔ وہ محنتی طبقہ زندگی کی بنیادی سہولیات سے مرحوم ہے۔

عبد الرف ملک، اکنامکس کے پروفیسر مکرجی کے حوالے سے ایک بات کرتے ہیں جو ابتدائی طور پر بنے بھائی کے گوش گزار کی گئی وہ بات اس انداز میں کی گئی کہ اس بات کا ان پر گہرا اثر ہوا اور شائد یہ بات حالات سے مطابقت بھی رکھتی تھی۔ اس بات میں ایک خاص قسم کی کشش تھی، جو آہستہ آہستہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کر رہی تھی۔ اور لوگوں خاص کر زندگی کی سہولتوں سے مرحوم طبقہ کے دلوں میں گھر کر رہی تھی

آج کل بہت سے اکنامسٹ مارکس کے نظریوں کو غلط بتاتے ہیں۔ لیکن تم
ان لوگ ان کی باتوں میں نہ آنا۔۔۔[۱۹]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سجاد ظہیر کا جھکاؤ کمیونزم کی طرف بڑھتا گیا یہ واقع یا دیگر واقعات ایک دم انکے سامنے نہیں آتے ان کے پیچھے ایک طویل ذہن سازی اور جدوجہد شامل ہے۔ اور اس جدوجہد کے بعد آخر میں ایک نتیجہ سامنے آتا ہے۔ مارچ ۱۹۲۷ء میں سجاد ظہیر کے سامنے ایک دوسری دنیا آتی ہے جب وہ تعلیم کے سلسلہ میں لندن (برطانیہ) جاتے ہیں اور وہاں کے حالات واقعات کو دیکھتے ہیں۔ جامعہ آکسفورڈ کا انتخاب کرتے ہیں وہاں بھی مضامین کا انتخاب خاصہ اہمیت کا حامل ہے ایک طرف ماڈرن ہسٹری تو دوسری طر ف معاشیات لیکن اس دفعہ ساتھ سیاسیات شامل ہو گئی۔ یہ تینوں مضامین ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط ہیں۔

یہ وہ وقت ہے جب دنیا میں کمیونزم ابھر کر سامنے آتا ہے اور ایک کامیاب انقلاب (انقلاب روس) ایک مثال کے طور پر دنیا میں سامنے آتا ہے۔ جب عام لوگوں نے اور مزدوروں نے حکومت کرنے کا حق حاصل کیا ہے اور دنیا میں دو طرز حکومت کے نمونے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں ایک طرف سرمایا دارانہ طرز حکومت ہے اور دوسری طرف کمیونزم ہے۔ جس کی طرف لوگوں کا رحجان بڑھتا جا رہا ہے اور پہلا نظام دوسرے سے خطرا محسوس کرنے لگتا ہے۔

سجاد ظہیر قیام لندن کے دوران باقاعدگی سے مزدوروں کے جلسے جلوسوں میں شامل ہوتے رہے اور اس دوران وہ لندن یعنی ایک یورپی ملک میں ایک عام مزدور کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی زندگی کو اپنے ہندوستان میں عام مزدور اور کسانوں کی زندگی سے تقابل کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں مزدوروں کسانوں کے مسائل ایک سے ہیں اور ان کا حل بس ایک کامیاب انقلاب میں پوشیدہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمادار منافع کا بہت بڑا حصہ لے جاتا ہے جب کہ کام وہ کم کرتا ہے جب کہ عام محنت اور زیادہ مشقت کرنے والا مزدر بس خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

> لندن میں سجاد ظہیر قانون کے طالب علم تھے لیکن ان کا سارا وقت رالف ماکس، ڈیوڈ گیٹ اور مارکس کو پڑھتے اور دیگر مارکسی ادیبوں کی صحبت میں گزرتا تھا۔۔۔[۲۰]

سجاد ظہیر کے والد بھی وکیل تھے اور وہ انہیں بھی وکالت کروانا چاہتے تھے مگر وہ اپنے لیے ایک الگ راستے کا انتخاب تقریباً کر چکا تھا اور وہ وکیلوں اور سرمایا داروں کو لوٹنے والا تصور کرتا تھا جیسا کہ وہ خود اپنے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں ایک کردار کی زبانی اس بات کا بار بار اظہار کرتے ہیں۔ یہ دور دنیا میں عجب منظر نامہ تخلیق کر رہا ہے ایک طرف تو پہلی جنگ عظیم لڑی جاچکی ہے کمیونزم عروج پکڑ چکا ہے اور دوسری جنگ کے بادل سر پر منڈلا رہے ہیں۔ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔

۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے سال ہندوستان میں خاص اہمیت کے حامل ہیں اور یہ سجاد ظہیر کی کوششوں میں خاص موڑ بھی ہیں ایک طرف ''انگارے'' رسالہ کے شعلے برصغیر میں بلند ہوتے ہیں تو دوسرے سال ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس ہوتا ہے۔ ان پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے یہاں اب اس موضوع پر بحث کی ضرورت نہیں۔ ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر بیرسٹری کی سند لے کر ایک وکیل کے ساتھ ساتھ ایک پکے کمیونسٹ بن کر برصغیر واپس آتے ہیں اور اب وہ میدان جنگ (اشتراکیت کے ابلاغ کے لیے) میں کودنے کو مکمل طور پر تیار ہیں کیونکہ یہ راہ پر خار ہے اور اس راستے میں پھول بالکل بھی نہیں ہیں۔

سجاد ظہیر نے آلہ آباد میں بیرسٹری کی پریکٹس شروع کی مگر یہ بات ان کے لیے مکمل طور پر دوسری تھی ان کے سامنے ایک بہت بڑا طبقہ غربت ذدہ ہندوستان میں بری طرح جکڑا ہوا تھا اور نسلی امتیازات دولت کی غیر منصفانہ تقسیم تھی سجاد ظہیر جس میدان میں نکلے اس میں وکالت اور والد کی دولت وثروت کا تعلق ایک ساتھ تھا انہوں نے بطور ایک سیاسی کارکن کام شروع کیا۔ معاشرہ کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کے بعد ان

کے خیال میں نجات اور دولت کی برابر تقسیم کے لیے سرخ انقلاب تک کا وسیع راستہ طے کر کے جانا تھا اور ابھی تو اس کی پہلی سیڑھی تھی۔

سجاد ظہیر نے برصغیر میں ادب کا رخ موڑ کر ان کی نظر آسمان سے زمین کی طرف موڑ دی کہ ادب میں عام لوگوں کے مسائل زیر بحث لائیں اور ادب کو" ادب برائے زندگی" کی اصل صورت سے روشناس کر وایا۔ پہلے جن لوگوں کی ادب میں کوئی جگہ نہیں تھی اب وہ موضوع ادب بن جاتے ہیں۔ ادب کا رشتہ پہلی بار مقصد سے جوڑا جاتا ہے جہاں مرحوم طبقہ ہیرو ہے اور وہ طبقہ یہاں اپنے مسائل کے ساتھ موجود ہے۔

> سجاد ظہیر نے مارکسزم کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ وہ مارکسی نظریات کو برتنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ان کو طبقاتی جدوجہد، سماجی انقلاب اور کمیونزم کی فتح پر پورا یقین تھا۔[۲۱]

سجاد ظہیر کمیونزم کو عملی صورت میں برصغیر میں دیکھنے کے خواہاں تھے، کیوں کہ ہندوستان میں بھی معاشرہ ایک طرف ساہوکاروں اور دیگر معاشرہ کے خون پینے والوں جو کہ تعداد میں بہت کم تھے، ان سے بھرا ہوا تھا تو دوسری طرف عام مزدور اور کسان جن کی تعداد کروڑوں میں تھی۔ وہ ایک وقت کے کھانے کو ترس رہے تھے اس کا ایک حل مارکسی خیالات کی عملی صورت کا نفاذ تھا۔ سجاد ظہیر نے محض لکھنے کی حد تک نہیں بلکہ میدان جنگ میں کود کر عام سپاہیوں جیسا کام کیا اور ان کے ساتھ مل کر صورت حال کو عملی طور پر بدلنے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ جس راستے میں ظاہر ہے رکاوٹیں اور مسائل ہی مسائل تھے۔

و) سجاد ظہیر اور کمیونزم:

سجاد ظہیر کا ابتدائی دور سے ہی رجحان کمیونزم کی طرف تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ قیام لندن کے دوران بین الاقوامی لیڈروں اور ان کے کمیونسٹ خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد وہ مکمل طور پر کمیونسٹ ہو گئے اور اس نظام کو برصغیر میں اسے عملی صورت میں نافذ کرنے کا خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء کا سال بہت اہمیت کا حامل ہے،جب پوری تیاری سامنے آتی ہے۔ سجاد ظہیر کا دور دنیا بھر میں معاشی حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ نو آبادیوں پر قبضہ کرنے اور صنعتی ترقی میں عام مزدوروں اور کسانوں کے پسینے میں یہ دور خاصا اہم ہے۔ ایک طرف صنعت کار طبقہ عام لوگوں کو لوٹ رہا ہے اور دوسری طرف عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ معاشی بحران نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور غیر یقینی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

ہم (سجاد ظہیر اور دوست ہم خیال) رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ ہمیں اطمینان نہیں تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ مصیبتیں اور آفتیں آتی رہی ہیں۔۔۔[۲۲]

بنیاد طور پر ابتداء میں سجاد ظہیر کے گھر کا ماحول اور اپنے شہر میں ہونے والے جلسوں اور معاشرے میں بڑھتے ہوئے تفاوت نے سجاد ظہیر کو سوچ کی اس ڈگر پر ڈال دیا۔ کمیونزم میں انقلاب کو بہت اہمیت حاصل ہے اور انقلاب خون مانگتا ہے، میدان میں لڑنا مرنا پڑتا ہے۔ سجاد ظہیر نے بھی ایک پر سکون زندگی چھوڑ کر ایک مشکل راستے کا انتخاب کیا اور قلمی جدوجہد کے مقابلے میں میدان میں اترنے کو ترجیح دی اور مختلف لوگوں کو ہم خیال بنایا۔ اس راستے میں انہیں طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں اور کئی بار جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ بہر حال انہوں نے معاشرے کو بدلنے میں اور حقوق کی آگاہی میں اہم کردار ادا کیا۔ سجاد ظہیر اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ لندن میں رہ کر برصغیر کے لوگوں اور ادب کو اس طرح نہیں بدلہ جا سکتا جس طرح کہ وہاں پر عام لوگوں میں گھل مل کر ان پر اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ منشور وغیرہ سب کچھ اکٹھا کرنے اور تمام خاکہ تیار کر کے وہ جب برصغیر میں واپس آئے اور یہاں عملی طور پر جدوجہد کا آغاز کیا۔ سجاد ظہیر کو والد نے لندن میں آئی۔ سی۔ ایس کے لیے بھیجا تھا کہ میرا بیٹا افسر بنے گا اور ہندوستانیوں پر حکمرانی کرے گا مگر یہ بات انہیں قابل قبول نہیں تھی اور اس کی بجائے وہ ایک مختلف کٹھن راستے پر چل پڑے، جس میں وہ حکومتِ وقت کے لیے بھی قابل قبول نہیں تھے۔

میرے والد نے مجھے ۱۹۲۷ء میں انگلستان اس لیے بھیجا تھا کہ میں انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں، آفسر بنوں۔۔۔[۲۳]

سجاد ظہیر نے ناولٹ "لندن کی ایک رات" میں عارف کے کردار کی شکل میں آئی۔ سی۔ ایس کرنے والوں اور آفسروں کی خوب حالت زاد بیان کی ہے کہ ایک سول آفیسر کیا کرتا ہے اور کس طرح وہ ایک ریموٹ کنٹرول سے چلتا ہے اور خوشامد میں اپنی زبان تک کو چھوڑ دیتا ہے اور مکمل طور پر نو آباد کار گوروں کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ تھوڑے سے اختیارات کے عوض اپنے لوگوں کا خون بہاتا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی سوچ یا نظریہ اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک اس کی ضرورت نہ ہو۔ ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھتی ہے اور ایک خلا بن جاتا ہے اس خلا کو پر کرنے کے لیے ہوائیں اس خطہ کا رخ کرتی ہیں اور پھر وہ خالی جگہ پر ہو جاتی ہے۔ مزدور عام کسان اور خود سجاد ظہیر کیوں اس نظریہ سوچ کے حامی بنے؟ سجاد ظہیر کا خاندان

لکھنو کا ایک امیر خاندان تھا اور ان کے والد کے پاس اچھی خاصی دولت تھی، مگر سجاد ظہیر نے الٹا امیر طبقہ اور وکلا حضرات کو اپنے ناولٹ میں طنز کا نشانہ بنایا۔ پوری دنیا میں جب سرمایادار نے غریبوں کا خون نچوڑ کر دولت اکٹھی کرنی شروع کی تو یہ نظریہ ابھر کر سامنے آیا اور پوری دنیا میں اس نظریہ نے خود کو منوایا اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں اسے اپنایا گیا۔ سجاد ظہیر کے لیے بھی ایک منزل کا نشان ماسکو ہی تھا، مگر وہ اس خیال کو رد کرتے ہیں کہ غریب مزدوروں اور کسانوں کی اپنے حقوق کے لیے اٹھنے والی بلکہ کسی بھی طرح کے اجتماع یا احتجاج کو ماسکو سے جوڑا جاتا ہے، اگرچہ ایسا ہے نہیں۔ حقوق کی باتیں مزدوروں کو تو سمجھ آتی ہیں مگر ان باتوں کو سرمایادار سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

سجاد ظہیر کا ابتدائی دور جو ۱۹۲۷ء سے پہلے کا ہے، یعنی برصغیر میں اس دور میں ایک سجاد ظہیر کے ذہن میں ایک تناور درخت کا بیج بویا جاتا ہے اور یہاں برصغیر میں اس بیج کو ہوا، پانی اور ضروریات کی بنیادی خوراک ملتی رہتی ہے۔ لندن کے دور میں جب وہ نامور کمیونسٹوں سے ملتے ہیں ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں تو وہ بیج ایک خاص ماحول پا کر جلد پروان چڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور مضبوط بنتا جاتا ہے۔ سجاد ظہیر کو اس بات کا ادراک تھا کہ یہ عملی صورت میں برصغیر کے اندر رہ کر ہی ممکن ہے۔ اس لیے جب نظریے کا پودا مکمل طور پر تیار ہوتا ہے تو وہ اپنے اثرات معاشرے پر مرتب کرتا ہے اور پورے برصغیر میں ثمرات پھیل جاتے ہیں، یعنی ایک وقت میں یہ ایک سوچ تھی اور برصغیر میں واپس آکر اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کی اور بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔

و) کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند تحریک (مختصر جائزہ):

ایک مثل مشہور ہے کہ ایک ایک ہوتا ہے اور دو گیارا۔ اگرچہ دنیائے عالم میں کئی مثالیں موجود ہیں کہ فردِ واحد نے دنیا میں کوئی انتہائی اہمیت کا کام کیا ہو یا دنیا کی تاریخ کو بدل دیا ہو، مگر ایک ٹیم ورک اپنی اہمیت آپ ہے، سجاد ظہیر نے ایک مہم سر کرنے کی ٹھانی۔ اس انقلاب کے لیے عام طبقہ کی حمایت از حد ضروری تھی۔ مثلاً: جس طرح روسی عوام نے زار حکومت کا تختہ الٹ دیا اسی طرح سجاد ظہیر نے بھی طرح طرح کے طریقوں سے لوگوں کو ہم خیال بنانے کی کوششیں کیں اور ایک سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کی۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں سجاد ظہیر نے ۱۹۳۱ء میں شمولیت اختیار کی ایک دوسرا راستہ جس میں مشکلات پیش آنی تھیں، یہاں بھی اسی کا انتخاب کیا گیا، جس میں وہ حکومتِ وقت کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں تھے اور کئی بار انہیں دیگر ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں سجاد ظہیر کو اس پارٹی کی بنیادی کمیٹی کا رکن

منتخب کیا گیا۔ اس پارٹی میں سجاد ظہیر کو بنیادی اہمیت حاصل رہی۔ اس پارٹی کو کئی دفعہ پابندیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا اور وہ پابندی ۱۹۴۲ء میں اٹھائی گئی۔ سجاد ظہیر کو کئی دفعہ جیل کی ہوا کھانا پڑی مگر وہ آخر تک اپنی جدوجہد کرتے رہے اور عام لوگوں کے شعور کی بات کرتے رہے۔

اس تمام جدوجہد کی بہترین تنظیم اور رہنمائی یہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے کی۔۔۔"[۲۴]

برصغیر کی سیاسی تاریخ میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے اس کے ساتھ جدوجہد اور وفاداری آخری وقت تک سجاد ظہیر نے نبھائی اور تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان بھی اس مقصد کے لیے آئے، مگر یہاں انہیں سخت مایوسی ہوئی اور ایک عرصہ جیل میں قید رہے اور سجاد ظہیر تقسیم برصغیر کے وقت ایسا بندہ تھا جو نہ پاکستانی تھا اور نہ ہندوستانی بعد میں نہرو کی سفارش پر انہیں بھارتی شہریت دی گئی۔ ترقی پسند تحریک کے لیے راہ ہموار کرنے کے لیے ایک طویل جدوجہد موجود ہے۔ لندن میں نانکنگ رسٹورنٹ کا نام اور پیرس میں پہلی بین الاقوامی کانفرنس جن میں مارکسی نظریہ کے حامی اکھٹے ہوئے اور آنے والے وقت کے بارے میں فیصلے کیے۔ سجاد ظہیر لندن میں موجود طالب علموں سے جو ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے انہیں ہم خیال بنانے کی پوری کوشش کی اور اس دور میں اکثریت مارکسی خیالات سے متاثر بھی تھی اور اس سلسلے میں "انڈین پروگریسیو رائٹر ایسوسی ایشن" کا قیام عمل میں لایا گیا۔

ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس کلکتہ میں ہوا جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور آگے کا لائحہ عمل طے کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک نے دنیا بھر کے ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب کو بھی متاثر کیا اور ادب برائے زندگی کی پیروی کی صورت میں ایک اہم موڑ آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کا سلسلہ آزادی کی جدوجہد کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید آج دنیا کی تاریخ الگ ہوتی۔۔۔"[۲۵]

"ادب برائے ادب" کے بعد ایک فضا موجود تھی کہ اب کوئی تبدیلی ہونی چاہیے اس تبدیلی کو ترقی پسند تحریک نے پُر کیا۔ اس تحریک نے گویا ادبی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی اور اس پر عمل اور ردِ عمل دونوں سامنے آنے لگے۔ اس تحریک کی ایک انفرادیت وہ ابتدائی خطبہ بھی رکھتا ہے جو پہلے جلسہ کے دوران منشی پریم چند نے دیا۔ ترقی پسند تحریک بھی ایک اہم تبدیلی تھی، جب پوری دنیا میں اہم تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ برصغیر میں یہ بھی ایک اہم تبدیلی تھی۔

ترقی پسند تحریک نے ادب کو تبلیغ (مقصد) کا ذریعہ بنا کر اور عملی جدوجہد کے ذریعے ملک میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ اس تحریک کے تحت ادب کو ایک مقصد کے تحت لکھا جانے لگا اور عام کسانوں، مزدوروں اور معاشرہ کے پسے ہوئے طبقہ کو موضوعِ ادب بنانے کی سعی ہونے لگی۔ مخالفت اپنی جگہ مگر اس تحریک نے معاشرہ و ادب پر اہم اثرات مرتب کیے۔

حوالہ جات

۱۔ Ania Loomba, colonolism, Post-Colonialism, Routledge, New Yark1998, page 1

۲۔ Bill Ashcroft,Gareth Griffiths,Helen Tiffin,key concept in post colonial studies,By Routledge 11 ,New Fetter Lane,London 2010 page 31

۳۔ روش ندیم،ڈاکٹر مقدمہ، مشمولہ:اردو غزل مابعد نو آبادیاتی مطالعہ، محمد روف، روہی بکس، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۷

۴۔ محمد روف، اُردو غزل مابعد نو آبادیاتی مطالعہ، روہی بکس، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۲

۵۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، دارالشعور، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۷

۶۔ ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۳

۷۔ Lokangaka Losambe and Devi Sarinjeive,Pre colonial and post colonial Drama and theatre in Africa,New Africa books, Claremont, south Africa 2001 pagre 33

۸۔ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات اُردو کے تناظر میں، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۶

۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، برطانوی راج، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۲

۱۰۔ ناصر عباس نیر، ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳

۱۱۔ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳، ص ۱۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۳۔ محمد مسعود خالد۔ نو آبادیاتی انتظامی ڈھانچے کا تسلسل، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن، ص ۳۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، برطانوی راج، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء ص ۹۷

۱۶۔ بیورے نکولس، برطانوی ہند کا مستقبل، مترجم: ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فرقان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۲۳

۱۷۔ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء ص ۲۶

۱۸۔ عبدالروف ملک، سید سجاد ظہیر، مارکسی دانشور اور کمیونسٹ راہنما، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۰

۲۱۔ سبط حسن، الہٰ آباد سے اشک آباد تک۔ یادوں کا سفر، (مضمون)، مغنی آتشِ نقش، سجاد ظہیر، مرتب، سید جعفر احمد، دانیال پریس، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۳۷

۲۲۔ سجاد ظہیر، یادیں (رپوتاژ) سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر، مرتب، ڈاکٹر سید جعفر احمد، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۰

۲۳۔ رضیہ سجاد ظہیر، سرگزشت، مضمون، سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر، مرتب، ڈاکٹر سید جعفر احمد، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲۶

۲۴۔ سجاد ظہیر، طویل اور مسلسل سفر کی کہانی، مضمون، سجاد ظہیر، شخصیت اور فکر، مرتب ڈاکٹر سید جعفر احمد، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۴۰

۲۵۔ اندر کمال گجرال، افتتاحی خطبہ پیش لفظ، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور قومی پسند تحریک، مرتب، گوپی چند نارنگ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۸

باب دوم:

''لندن کی ایک رات'' عمومی مطالعہ (نو آبادیاتی، مابعد تناظر میں)

الف) لندن کی ایک رات میں عمومی موضوعات:

''لندن کی ایک رات'' موضوعات کے لحاظ سے بہت وسعت رکھتا ہے۔ ایک معاشرہ یا، ملک میں تمام موضوعات ایک دوسرے سے باہم مربوط ہوتے ہیں۔ کسی ایک موضوع کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تمام موضوعات ایک ساتھ سفر کرتے ہیں سجاد ظہیر اس ناولٹ میں سیاسی، معاشی، ثقافتی، تہذیبی، موضوعات کو بخوبی ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اور ان پر جا بجا گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

''لندن کی ایک رات'' میں موسم کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اسی ناولٹ کے ذیلی قصوں میں سے ایک اہم قصہ بھی ہے اور پوری کہانی کے ساتھ ساتھ برابر چلتا ہے اور لندن کے موسم کی تصویر کشی بہت عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ موسم کا ذکر اس ناولٹ میں تین طرح سے ملتا ہے سب سے پہلے تو یہ تمہیدی حصہ میں شامل ہے یعنی پوری کہانی اس سے شروع ہوتی ہے اور دوسری طرف کہانی کے کرداروں پر موسم مسلسل اثر انداز ہوتا ہے اور سب سے اہم نقطہ یہ کہ کہانی کا رخ متعین کرنے میں موسم کا کردار خاص اہمیت کا حامل ہے۔ لندن شہر کا موسم اکثر و بیشتر سرد ہی رہتا ہے اور اکثر یہ موسم کام اور روز مرہ معمولات میں رکاوٹ بھی بنتا ہے مگر آج سردی اور دھند ہونے کے باوجود لوگ اپنا اپنا کام معمول کے مطابق کر رہے ہیں۔ شہر کی رونق میں کوئی کمی نہیں۔

> لندن میں دھند پھیلی ہوئی ہے، ناول بڑی سادگی سے مگر بہت Preciseانداز میں شروع ہوتا ہے۔[1]

''لندن کی ایک رات'' میں موسم کے اتار چڑھاؤ کو نو آباد کار کے تسلط سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اس کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ (یہ آگے چل کر زیر بحث آئے گا) دوسرا کہانی کے پلاٹ کی تکمیل کے حوالہ سے اور تیسرا جو سب سے اہم نقطہ ہے، کہ موسم پر گفتگو سے اور موسم پر بحث کرنے سے اختلاف کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنا اپنا تجربہ پیش کرتا ہے۔ ناولٹ میں موسم کے اتار چڑھاو کو ایک خاص طرح سے نو آبادیات سے جوڑا گیا ہے۔ یہاں یہ لازم نہیں کہ ایک شخص کا تجربہ دوسرے سے ملتا

ہو۔ اس میں اختلاف کے باوجود لڑائی جھگڑے کا امکان نہیں ہوتا۔ اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے کہ اگر ایک شخص کو گرمیاں پسند نہیں تو دوسرے کو سردیاں کسی کو بہار پسند ہے تو کسی کو خزاں گویا ہر شخص کو اختلاف کا حق حاصل ہے۔

انگلستان میں باہمی گفتگو کا ایک مرکزی ٹاپک موسم ہے کہ ہر بندہ خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتا ہو وہ اس عنوان پر بھرپور گفتگو کر سکتا ہے۔ بغیر کسی روک ٹوک کے۔ موسم کی تاریکی کا ایک حوالہ نو آبادیاتی عہد بھی ہے۔ منظر نگاری میں موسم اہمیت کا حامل ہے۔

نعیم موسم پر مختلف رائے رکھتا ہے کہ یہ انگریزوں نے جان بوجھ کر یہ طریقہ اپنایا ہے کہ یہ ایک ایسا ٹاپک ہے کہ ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والا افراد اس پر رائے زنی کر سکتے ہیں۔ اس عنوان پر بحث کرتے ہوئے لڑائی جھگڑے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں دیگر عنوانات پر بحث، تکرار کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور لوگوں کے درمیان اختلاف کو ہوا ملتی ہے اور یہ بنیادی اختلافات آگے چل کر بڑے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

نعیم انگریزوں کی اس بات پر بھی شکوک کا اظہار کرتا ہے کہ یہ بھی ان کی ایک چال ہے۔ اور سوچی سمجھی سازش ہے۔ جب کہ انہوں نے اختلافی ٹاپکس اپنی نو آبادیوں میں اختلاف کو ہوا دینے اور ان پر حکومت کرنے میں آسانی کے لیے رکھ چھوڑے ہیں۔ اور خود اپنے لیے وہ ٹاپک ڈھونڈا ہے جس پر ہر شخص اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں گفتگو کر سکتا ہے۔ یعنی اس میں اجتمائیت کا عنصر ہے۔

پورے ناول میں لندن کا موسم چھایا ہوا ہے۔[۲]

''لندن کی ایک رات'' میں ایک رات کی کہانی ہے یعنی یہ ناولٹ ایک رات پر پھیلا ہوا ہے اور مختلف اوقات میں کرداروں کے درمیان موسم پر گفتگو ہوتی ہے۔ شائد ایک قصہ میں پوری رات گزارنا سجاد ظہیر کے لیے مشکل ہوتا اس لیے وقفے وقفے سے لندن کا موسم موضوع بحث بنتا ہے۔ وسری بات یہ کہ موسم کرداروں پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے یہ خاصا اہمیت کا حامل نقطہ ہے۔ لندن شہر اور موسم ناولٹ کے پلاٹ کا حصہ ہیں۔ کسی حد تک پلاٹ کی مربوطی کا سبب بھی ہے۔

موسم کے بیان سے جلد اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ قصے کا موڈ متعین کرنے کے لیے ہے۔[۳]

گویا جب کرداروں کے پاس بات کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو وہ موسم پر دل کھول کر بات چیت کرتے ہیں۔ ایک اور اہم بات یہ کہ '' لندن کی ایک رات'' میں لندن کے موسم کا تقابل برصغیر کے موسم کے ساتھ

کیا جاتا ہے کہ یہاں سردیاں کیسے آتی اور ختم ہوتی ہیں۔ بارش دونوں جگہوں پر کیسے برستی ہے، بادل کیسے برستے ہیں۔ کالی گھٹا کی صورت میں بادل اڈ آتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے، طوفان آتا ہے۔ جب کہ لندن / برطانیہ میں بارش اور بادل آنے کی صورت حال بالکل مختلف ہوتی ہے اور اگر عمومی حیثیت سے دیکھا جائے تو بھی برصغیر اور یورپ کا برطانیہ سمیت موسم مکمل طور پر مختلف ہے۔ غرض کہ "لندن کی ایک رات" میں بالخصوص اور دنیائے عالم پر بلعموم لندن کا موسم چھایا ہوا ہے۔ اور برابر اثر انداز ہو رہا ہے۔

"لندن کی ایک رات" میں عشق و عشقی، چاہت اور نفرت کی داستان بھی نظر آتی ہے۔ لندن کے موسم کی طرح یہ داستان بھی پوری کہانی میں برابر ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ایک سطح پر تو ایک احساس سا ہونے لگتا ہے کہ اس کہانی کا مرکزی نقطہ بھی عشق و محبت ہیں۔

یہ ناول (لندن کی ایک رات) محبت اور سیاست کے ملے جلے ماحول میں ڈوبا ہوا ہے۔[۴]

"لندن کی ایک رات" کی پوری کہانی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت کی کہانی ہے بنیادی طور پر عشق ایک مرکزی کہانی ہے اس کے ساتھ الگ ذیلی کہانیاں چل رہی ہیں۔ مگر کوئی کہانی بھی یہاں مکمل شکل میں موجود نہیں ہے اور وہ قارئین کی توجہ کے بالکل خلاف نتائج پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک طرف اگر دیکھا جائے تو ناولٹ میں کہانی کا آغاز بھی عشق کی داستان سے ثابت ہوتا ہے۔ اور وہی ابتدائی عشق کی داستان مختلف صورتوں میں کہانی کے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اعظم پلیٹ فارم پر جین کا انتظار کر رہا ہے۔ جین بار بار وعدہ خلافی کر رہی ہے۔ وہ کئی بار اعظم سے ملنے کا وعدہ کر چکی ہے مگر نہیں آئی۔

اعظم کو احساس ہے کہ وہ اس کا وقت برباد کر رہی ہے۔ اور بار بار اسے زچ پہنچا رہی ہے۔ مگر وہ جین کے عشق میں بے بس ہے۔ اس نے جب بھی وعدہ کیا، یہ ناچاہتے ہوئے بھی اس کا انتظار کرتا ہے اور خود اپنے آپ سے کئی دفعہ وعدہ کر چکا ہے کہ اب وہ اسے چھوڑ دے گا۔ اس سے وعدہ خلافی پر لڑائی کرے گا۔ اس کو برا بھلا کہے گا۔ مگر وہ ہر دفعہ اس کے سامنے جاتے ہی سب گلے شکوے بھول جاتا ہے۔ لیکن وہ ہر دفعہ اعظم سے معافی مانگتی ہے اور یہ پھر سے گلے شکوے بھول جاتا ہے۔ سجاد ظہیر یہ بات جانتے تھے کہ خالص اشتراکیت پر بات کرنا اس کے لیے ملکی حالات کے تناظر میں اور قارئین کے لیے مسائل پیدا کرے گا۔

اعظم سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اپنی مشرقی ذہنیت سے باہر نہیں آ پا رہا اور محبوب کے سامنے گلہ کرنا اسے وعدہ خلافی یاد کروانا گویا عشق کی توہین ہے۔ دل میں لاکھوں گلے شکوے ہوتے ہیں۔ مگر محبوب کے سامنے زبان اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور وہی الفاظ زباں سے ادا ہوتے ہیں۔ جو محبوب کی منشاء کے مطابق

ہوں۔ سجاد ظہیر کو اعظم اور شیلا گرین کی محبت سے کیا غرض وہ کامیاب ہو یا ناکام ہو اصل مقصد تو اس اصل کہانی کو قارئین کے ذوق کے مطابق بنانا تھا نہ کہ یہ عام سا بے نتیجہ قصہ سنانا۔

مگر خود فریبی کے احساس کے باوجود اعظم کچھ عملی طور پر کرنے سے قاصر ہے۔ وہ مغرب میں رہنے کے باوجود عشق کے مشرقی تصور سے باہر نہیں نکل پا رہا۔ ہر دفعہ وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہے۔ مراوت کے مارے وہ پھر اپنی انا کی قربانی دیتا ہے کہ شاید آخری بار ہو مگر وعدہ خلافی کا یہ عمل بار بار دہرایا جا رہا ہے اور اعظم محض اسی چکر میں پھنسا ہوا ہے کہ اگلی بار سے برا بھلا کہوں گا۔ اس عشق میں اعظم خود کو مکمل بے بس پاتا ہے، وہ اپنی محبوبہ جین کے سامنے ایک ٹھوس بات کرنے کے لیے خود کو بمشکل تیار کرتا ہے مگر عین مواقع پر وہ اپنے ہی پروگرام پر عمل نہیں کر پاتا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی مجبوری یا عذر بتا کر اعظم کو دوبارہ قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

ہر دفعہ اعظم اس کے نئے وعدہ اس کے انداز و اداؤں سے مار کھا جاتا ہے۔ جین کی سراپا نگاری اس کے ذہن میں نقش ہے۔ اور بار بار اس کو یاد کرتا رہتا ہے کہ اس کی آنکھیں۔ بدن، چہرا کیسا نظر آتا ہے۔ اور وہ اس کی ہنستی ہوئی آواز پر اعتبار کرنے کو مجبور ہو جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا بجا ہو گا۔ اور وہ ہر دفعہ نئے عظم سے جین کا انتظار شروع کرتا ہے مگر ہر دفعہ ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ نہیں آتی اور کوئی خوبصورت سا بہانہ بنا دیتی ہے۔

آج بھی اعظم کی کیفیت عجیب و غریب ہے کہ غصہ کی شدت سے وہ بے چین ہے کہ آج وہ پھر نہیں آئی۔ اعظم کی قسمت میں انتظار اور صرف انتظار ہے۔ مگر راؤ کے ریلوے اسٹیشن پہ اچانک نمودار ہونے سے اعظم کچھ بہتر محسوس کرتا ہے اور وہ اسے اور باتوں میں لگا دیتا ہے جس سے اعظم کا ذہن جین سے تھوڑا ہٹتا ہے۔ اور راؤ اسے تسلی دیتا ہے۔ کہ وہ کسی خاص وجہ سے لیٹ ہو گئی ہو گی نہیں تو ضرور آ جاتی ہے۔ اور ایک خواتین کے اہم مسئلہ کی اہمیت بناتا ہے کہ اور جین کے لیٹ آنے کی عجیب منطق بتاتا ہے کہ:

۔۔۔سنگار کرنے میں بے چاری لیٹ ہو گئی ہو گی۔۔۔[۵]

اعظم کا ذہن بار بار روایتی انداز میں سوچتا ہے کہ شائد اسے کوئی اور مجھ سے امیر پیسے والا پسند آ گیا ہو اور وہ اسے زیادہ وقت دیتی ہو اور مجھے صرف ہفتہ میں ایک دفعہ۔ کیوں کہ میرے پاس پیسے نہیں اور وہ جان بوجھ کر ایسا رویہ رکھے ہوئے ہے کہ اعظم خود ہی مجھ سے تنگ ہو کر مجھے چھوڑ جائے گا۔ نعیم کے ہاں پارٹی میں

بھی سب جوڑے ساتھ ناچ رہے ہیں۔ مگر اعظم، جین کو یاد کر کے انتہائی مضطرب ایک کونے میں بیٹھا ہے۔ اور یہ ساری پارٹی اسے بے رنگ نظر آ رہی ہے کیوں کہ وہاں جین موجود نہیں۔

اعظم کئی دفعہ اکیلے بیٹھے ہوئے سوچتا ہے کہ میں اپنے آپ کو دو سال سے دھوکہ دے رہا ہوں۔ یہ سوچ کے کہ وہ مجھے پیار کرتی ہے مگر یہ محض میری خام خیالی ہے ایسا کچھ نہیں مگر نعیم کے ہاں پارٹی میں جب جین آتی ہے تو وہ راؤ سے سفارش کروا کے اعظم کو دوبارہ راضی کر لیتی ہے اور پھر ایک خوب صورت سا بہانہ تراش لیتی ہے۔ اور اعظم دوباراہ سب گلے شکوے بھول کر اس کے ساتھ ناچنے لگتا ہے۔ اعظم کو گھر سے اپنی چھوٹی بہن کا خط موصول ہوتا ہے مگر وہ سرسری پڑھ کے رکھ دیتا ہے اس کی بہن لکھتی ہیں۔ "ہم سب کو آپ کے آنے کا انتظار ہے"۔

اعظم پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا وہ صرف جین کو سوچتا ہے اور اسی کا خیال ہر لمحہ اس کے دل میں موجود ہے۔ ہر دفعہ جین اسے غنچہ دے جاتی ہے۔ اعظم اور جین کا عشق دو طرفہ نہیں ہے جین کے بار بار وعدہ خلافی سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف وہ وقت پاس کر رہی ہے۔

یہ عشق (اعظم اور جین کا) یک طرفہ ہے۔ صرف اعظم کی طرف سے ہے جین ایک عام سی لڑکی ہے۔[۲]

اعظم بے عمل طالب علم ہے جو محض تصور پرست اور اصلیت جاننے کے باوجود خود کو ہلکان کر رہا ہے اور اپنا قیمتی وقت اور والدین کے پیسے ضائع کر رہا ہے۔ مسلسل نظر انداز ہونے کے باوجود وہ خود کو اس کیساتھ نتھی کر کے رکھنا چاہتا ہے اور اب اعظم کا یہ حال ہے کہ وہ اپنا مقصد جس کے لیے وہ لندن آیا تھا فراموش کر بیٹھا ہے۔ اصل کام تعلیم حاصل کرنا ہے نا کہ کسی گوری میم کے لیے وقت ضائع کرنا اور خود کو ذلیل کرنا۔

دوسری عشق کی کہانی راؤ اور شیلا کی ہے یہاں اعظم کے معاملے کا الٹ ہے راؤ محض وقت گزاری کر رہا ہے اس کی کئی گوریاں دوست ہیں اور اسے جو مل جائے اس کے ساتھ ناچ کر مختلف موضوعات پر گپ شپ کر کے وہ وقت گزار لیتا ہے اور کسی لڑکی کی اسے کوئی فکر نہیں ایک نہیں تو دوسری سہی۔ مگر ایک بات جو ان سب میں مشترک ہے کہ ہر کردار کے ساتھ عشق کی داستان کسی کسی حوالے سے جڑی ہوئی ہے۔ خواہ وہ محض ماضی کی یاد کی صورت میں ہو یا دل لگی یا محض وقت گزاری مگر سب حقیقی مقصد کو فراموش کر کے زندگی کے نصب العین کو پس پشت ڈال چکے ہیں۔ اور پڑھائی کی بجائے زیادہ وقت عشق بازی میں صرف کر رہے ہیں۔

مختلف گوریوں سے دل لگی کر کے وقت ضائع کرنا راؤ کا بہترین مشغلہ ہے۔ والدین کی طرف سے ملنے والی رقم وہ مختلف پارٹیوں اور شراب نوشی میں صرف کر دیتا ہے اور پڑھائی کی طرف کم توجہ دیتا ہے۔

تیسری کہانی ہیرن پال اور شیلا گرین کی ہے مگر یہ ایک ایسا عشق کا واقعہ ہے جو اب ماضی کا بھی حصہ بن چکا ہے اس عشقیہ کہانی کو شیلا گرین اور ہیرن پال کے عشق کی داستان کہا جا سکتا ہے۔ نعیم لڑکیوں سے عموماً دور ہی رہتا ہے اور اس کا کسی لڑکی سے کوئی چکر نہیں چل رہا۔ وہ بس آرام کرسی پر نیم دراز لیٹا رہتا ہے۔ راؤ نے نعیم کے ہاں ہونے والی پارٹی میں شیلا گیرین کو مدعو کر رکھا ہے۔ شیلا وقت سے پہلے پہنچ جاتی ہے اور اسی طرح نعیم اور شیلا کو اکیلے میں کافی وقت گزارنے کا مواقع مل جاتا ہے۔ اور اس طرح سجاد ظہیر بھی رات کا کچھ حصہ ان کے نام کرتے ہیں مگر اسے ایک الگ کہانی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ یہ اپنے مقصد کی بات کے لیے ماحول بنانا تھا۔ نعیم کے ساتھ ساتھ قاری کا ذہن بھی اس طرف تیزی سے مائل ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ اب یہ ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے ہیں اور باہمی گفتگو سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ذہنی لحاظ سے شیلا اور نعیم ایک دوسرے کے باہم قریب آچکے ہیں۔

پارٹی شروع ہونے سے لے کر ختم ہونے تک اور نعیم اور شیلا کے اکیلے رہ جانے تک اور آخر میں کوٹ اٹھانے تک قاری یہی سمجھتا رہتا ہے کہ یہ باہم ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے ہیں۔ اب ایک نئی عشقیہ کہانی شروع ہوگی مگر ایسا نہیں ہوتا۔ مگر سجاد ظہیر کسی ذیلی قصہ کو مکمل نہیں ہونے دیتے اور بات کا رخ اپنے اصل مقصد (اشتراکیت کی تبلیغ یا نوآبادکار کے خلاف ردعمل) کی طرف موڑ لیتے ہیں۔

> یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نعیم اور شیلا کے درمیان عشق و عاشقی کا دور شروع ہو جائے۔ ہو سکتا ہے وہ ازدواجی بندھن میں بندھنے کا فیصلہ کر لیں مگر قاری کی تمام توقعات پر اوس پڑ جاتی ہے۔[۲]

شیلا گرین نعیم کو ہیرن پال کے ساتھ اپنے عشق کی داستان سناتی ہے۔ ہیرن پال ایک انقلابی ذہن رکھنے والا نوجوان ہے۔ جس کے سامنے منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ہیرن پال بھی شیلا سے بے انتہا محبت کرتا ہے مگر وہ اپنے مقصد اور منزل کے سامنے اس عشق کو رکاوٹ نہیں بننے دیتا اور بنگال واپس چلا جاتا ہے۔ دیگر کرداروں کے مقابلے میں یہ اس میں انفرادیت ہے۔

کچھ عرصہ تو بذریعہ خط و کتابت یہ دونوں باہم رابطے میں رہتے ہیں۔ مگر چھ ماہ سے ہیرن پال کا کوئی خط نہیں آتا شیلا سمجھتی ہے کہ انقلابی ذہن والے بنگال میں زیادہ عرصہ آزاد نہیں رہ سکتے اور یہی کچھ ہیرن کے

ساتھ بھی ہوا ہے کہ وہ قید میں ڈال دیا گیا ہو گا، اس لیے اس نے خط نہیں لکھا شیلا بھی اتنی امیر نہیں اور ہیرن پال بھی کسی نواب فیملی سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ کہانی شیلا نعیم کو سناتی ہے اور نعیم کو اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے اور نعیم اسے دل دے بیٹھتا ہے۔

"لندن کی ایک رات" میں جس طرح دیگر واقعات اور کہانیاں ادھوری ہیں اسی طرح نعیم اور شیلا گرین کی کہانی کا اختتام بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ "ہم پھر کب ملیں گے" کے سوال کا جواب شیلا "پتہ نہیں" دیتی ہے اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو جاتی ہے۔ نعیم کھڑا یہ سب دیکھتا رہ جاتا ہے اور تمام رات اس کے ہاتھ سے پھسل کر بکھر جاتی ہے۔

"لندن کی ایک رات" میں وقت کا ضیاع (سماجی) ایک اہم موضوع ہے کہ ہندوستان کے طالب علم گھر سے کیوں انگلستان آئے ہیں۔ ان کے والدین کے کیا خواب تھے وہ کیا سوچ کر ہر مہینے خرچہ ان کو بھیجتے ہیں۔ اگرچہ تمام طالب علموں کا تعلق کھاتے پیتے گھرانوں سے ہے مگر وہ اپنے سارے مقاصد بھول کر عیش و عشرت اور بے فکری میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ انہیں قطعاً اس بات کی فکر نہیں کہ انہیں امتحان پاس کر کے واپس جانا ہے۔

> لندن کی ایک رات کا ایک رخ بے فکری، سیر و تفریح اور لمبے وقفے تک والدین کے اخراجات پر طالب علموں کا لندن میں ٹکے رہنا ہے۸

ہندوستان کے کھاتے پیتے گھرانوں کو اگر دیکھا جائے تو ان کا ایک ہی خواب ہوتا ہے کہ اولاد کو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کروانا اور آفیسر کی پوسٹ پر دیکھنا ہے۔ اسی خواب کی تکمیل کے لیے وہ تمام تر اخراجات اٹھا کر ان کو لندن / انگلستان بھیجتے ہیں۔ اور ہر ماہ پڑھائی کا خرچہ اٹھاتے ہیں۔ مگر ان طالب علموں کا حال دیکھیں ان کو اس حوالے سے کوئی فکر ہی نہیں وقت گزاری ان کا مشغلہ ہے۔ کوئی طالب علم بھی اپنی ڈگری مقررہ مدت میں حاصل نہیں کر پایا۔ تمام طالب علم دو تین سال اضافی لگا کے بھی ڈگری کے انتظار میں رہتے ہیں۔

> (ہندوستانی طالب علم) کس طرح ایک دوسرے سے ملنے ملانے بحث مباحثہ کرنے سیر و تفریح اور وقتی طور پر چھوٹا موٹا عارضی عشق کرنے میں اپنا وقت گزار دیتے ہیں۔۔۔[۹]

نعیم کے ہاں ہونے والی پارٹی میں موجود تمام طالب علموں کا یہی حال ہے کہ پڑھائی سے ہٹ کر ان کے معاملات زیادہ ہیں۔ اور وہ انہی معاملات کو زیادہ وقت دے رہے ہیں۔ لا حاصل موضوعات پر گفتگو اور خاص کر عشق عاشقی کے حوالے سے طویل بحث مباحثہ کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ کسی گوری میم سے عشق کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ شراب کون سی بہتر ہے۔ ان سارے لا حاصل موضوعات کے پس پردہ اہم موضوع کار فرما ہے جسے آگے چل کر زیر بحث لایا جاتا ہے۔

نعیم اچھا خاصا لائق طالب علم رہا ہے مگر وہ مقالے کا پانچواں باب لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اس ماہ تو جمع کروادوں گا مگر نہیں لکھ پاتا۔ خود سجاد ظہیر آئی۔ سی۔ ایس کے لیے انگلستان گئے مگر بعد میں اپنا ارادہ تبدیل کر لیا اور زیادہ وقت لگا کر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ راؤ امتحان آسانی سے پاس کر لیتا ہے۔ مگر وہ کسی معاملات کو سنجیدگی سے نہیں لیتا اور عارضی عشق بازی میں زیادہ وقت ضائع کرتا ہے۔ کریمہ بیگم حصول تعلیم کے لیے انگلستان گئی پورا خاندان ان کے مخالف تھا مگر پڑھائی کے شوق میں وہ لندن سے ڈگری لینے آگئی ہے اور وہ بھی دیگر طالب علموں کے ساتھ ان کے مشاغل میں شامل ہو کر پڑھائی کی بجائے دیگر معاملات میں دوبارہ وقت صرف کر رہی ہیں۔

> اس ناول (لندن کی ایک رات) میں ہندوستانی طلباء کی عیش پسندانہ زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔[10]

"لندن کی ایک رات" میں عیاشی اور بے فکری کی دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں تمام طالب علم مختلف پس منظر اور خاندانی رسوم و رواج رکھتے ہیں۔ اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ان کا تعلق ہے مگر ان تمام کی پڑھائی سے ہٹ کر سرگرمیاں ایک جیسی ہی ہیں۔ شراب کا معاملہ ہو یا لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے کا فضول بحث و مباحثہ ہو یا کوئی پارٹی سب میں ایک چیز مشترک ہے کہ وہ ان چیزوں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

> نعیم اور ان طالب علموں کے زمرہ میں تھا جو ہندوستان سے دو یا تین برس کی تعلیم کے لیے انگلستان جاتے ہیں۔ اور وہاں جا کر پانچ چھ برس رہتے ہیں۔[11]

اگر نعیم کے تناظر میں خود سجاد ظہیر کو دیکھا جائے تو انہوں نے بھی دو چار سال میں حاصل کرنے والی ڈگری کے لیے تقریباً دس سال لگا دیئے ملک آنند راج کے حوالے سے قمر انیس لکھتے ہیں کہ سجاد ظہیر خود بھی

سست طبیعت کے مالک تھے اور پڑھائی پر بھی اتنی توجہ نہیں دیتے تھے۔ مگر بعد میں انہوں نے خود کو مکمل طور پر بدل لیا اور زندگی میں محنت سے کام لیتے ہوئے اہم مقام حاصل کیا۔

خان کو دیکھیں وہ بھی لڑکیوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیابی پر فخر کرتا ہے اور اپنے پچھلوں کے نواب ہونے پر فخر کرتا ہے۔ اسے بھی اپنے مقصد سے غرض نہیں ہندوستان سے آئے ہوئے طالب علموں کا گوریوں کی طرف راغب ہونا اور ان سے عشق میں دو چار سال لگا دینے میں ہندوستان کے ماحول کا بھی اہم کردار ہے۔ کیوں کہ انگلستان اور ہندوستان کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ہندوستانی طالب جب گھٹن والے ماحول سے نکل کر کھلے ماحول میں داخل ہوتے ہیں تو وہ الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہندوستان میں عورتوں کا کھلا گھومنا معیوب سمجھا جاتا ہے وہ تو گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں جب کہ انگلستان میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے اس لیے طالب علم اپنے وقت کا زیادہ حصہ عشق و عاشقی میں گزار دیتے ہیں اور گھر سے آنے والے ماہانہ خرچہ کا بڑا حصہ انہی گوریوں پر خرچ کر دیتے ہیں۔ چند طالب علم تو ڈگری کے ساتھ ایک ادھ گوری کو بھی ساتھ گھر لے آتے ہیں۔

''لندن کی ایک رات'' میں شعر و شاعری، آرٹ اور فلسفہ پر بھی بحث نظر آتی ہے۔ یہاں آرٹ اور فلسفہ کی بحث کو دو تناظر میں دیکھا جائے گا۔ ایک عمومی تناظر میں اور دوسرا آگے چل کر اشتراکی تناظر میں۔ اعظم اور شیلا گرین دو ایسے کردار ہیں جو مختلف اوقات میں وقفے وقفے سے اردو شاعری کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اعظم اگرچہ بے عزتی کا احساس ہونے کے باوجود کوئی عملی قدم اٹھانے کی جرات نہیں کر پاتا۔ جین کے نہ آنے پر وہ سوچ رہا ہے کہ اب وہ مزید اتنی بے عزتی نہیں کروائے گا۔ وہ کوئی اردو شعرا کی طرح تھوڑی ہے جو عشق کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں اور بے عزتی کو فخر سے برداشت کرتے ہیں۔ اعظم ذلت کو محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے۔

> میں (اعظم) نے اپنی خودداری کو اپنی نظروں میں قائم رکھنے کے لیے سوچنا شروع کیا۔ کہ عشق میں ذلت تھا دراصل ذلت نہیں اور ان کے نام تمام شاعروں کے شکوے اور گلے مجھے یاد آنے لگے جو کوچہ جاناں کے کتے بن کر اغیار کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ دربان کی گالیاں سنتے ہیں۔ اور معشوق کے ہرجائی پن اور ناز و نخرے کو لذت روح سمجھ کر نا صرف برداشت کرتے ہیں۔ بلکہ خود اس کی خواہش کرتے ہیں کہ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جائیں۔[۱۲]

مگر یہ معاملہ تو وہی ہوا ''دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے'' ہزاروں طرح کے منصوبے بنا کر اُسے یہ کہوں گا اسے وہ کہوں گا مگر کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ اب خود اعظم کا حال شاعروں سے بھی ابتر ہے۔ بنیادی طور پر اردو شاعری کو اس ناولٹ میں بے اثر دیکھایا گیا ہے اور یہ کہ معاشرہ کو بے حس کرنے میں شاعری کا بہت بڑا کردار ہے۔ شیلا اسی حوالہ سے نعیم سے سوال کرتی ہے۔

> کیا آپ کے ہاں (ہندوستان میں) ہر وقت لوگ شعر پڑھتے رہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خوفناک حرکت ہو سکتی ہے۔ اگر مجھے اس قسم کی سوسائٹی میں رہنا ہو تو پاگل ہو جاؤں ۔۔۔ (شاعری کا اثر) دھوئیں کا سا اور ایک نقاب ہمارے دل اور ہمارے ذہن دونوں پر چھا جاتا ہے۔[۱۳]

شیلا کی باتیں سن کر نعیم کے ذہن پر ہندوستان کا عکس نمودار ہوتا ہے۔ کہ اگر شاعری سست اور بے اثر کر دیتی ہے اور ہمارے اوپر سکون طاری کر دیتی ہے تو کہیں ہندوستان کی غلامی میں آنے کی وجہ یہی شاعری تو نہیں۔

> ممکن ہے ہم ہندوستانیوں کے سست ہونے کی یہی وجہ ہو کہ ہم ہر وقت شاعری میں ڈوبے رہتے ہیں۔۔۔[۱۴]

بنیادی بات جو اس شعر و شاعری کی بحث سے حاصل ہوتی ہے وہی ہے کہ اردو شاعری "ادب برائے ادب" ہے۔ محض خوش طبع اور حض اٹھانے کے لیے ہے اس میں کوئی پیغام نہیں یہ محض محبوب کے لب و رخسار کے قصوں تک محدود ہے۔ اشتراکیت اور ادب برائے زندگی کا نقطہ نظر رکھنے والوں کے نزدیک ایسی بے مقصد تحریروں کا کوئی فائدہ نہیں جو کسی مقصد کے تحت نہیں لکھی گئی یا اس میں کوئی عام سطح (مزدور یا کسان) کے کردار نہیں ہیں۔ محض محبوب کا راگ الاپا جاتا ہے۔'' لندن کی ایک رات'' میں آرٹ اور فلسفہ کی بحث کافی جگہوں پر ہوتی ہے لیکن یہ نقطہ دوسری نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

> آرٹ اور فلسفہ کی بحث محض وقت گزاری کے لیے ہے۔[۱۵]

"لندن کی ایک رات" میں اچھے آرٹسٹ کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ شیلا، نعیم اور عارف سے کرید کرید کر ہندوستان کی آرٹ کے بارے میں ہندوستان کی شاعری کے بارے میں پوچھتی ہے اور وہ تجسس رکھتی ہے کہ ہندوستان میں آرٹ اور شاعری کا معیار کیا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ اسے جس طرف سے روکا جائے

بے اختیار ادھر ذہن بار بار جاتا ہے۔ اسے بھی ہندوستانیوں سے دور رہنے کا کہا گیا والدین نے اسے بتایا کہ ان کے قریب نہیں جانا۔ راؤ مشرق اور مغرب کے تقابل کے بعد شیلا کے سامنے رومانیت کا یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

> ہم ہندوستانیوں میں تم مغرب کے وحشتوں کے مقابلے میں رومانیت زیادہ ہوتی ہے۔
> اس لیے ہم ہر چیز کی اصلیت کو تم سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور حقیقت کے راستے پر تم
> سے زیادہ آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں۔[۱۶]

شیلا آرٹ، فلسفہ ،روحانیت پر بات کر رہی ہے مگر وہاں پر ان مضامین کا کوئی طالب علم یا اس کے حوالے سے گفتگو کرنے والا نہیں عارف اور نعیم اپنی جگہ پریشان میں کہ شیلا تو آرٹ فلسفہ میں ماہر ہے لیکن جب وہ بتاتی ہے کہ شاعری سے تھک چکی ہے۔ اور ہفتہ وار کلاس لے رہی ہے تو پھر بھی اس کا رعب نعیم اور عارف پر کم نہیں ہوتا۔ راو بے تکلفانہ گفتگو میں بھی تقابل یا برتری ثابت کرنے کی بجائے الٹا ہندوستانی روحانیت کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے یہ موضوع بھی ایسا ہی ہے جس سے کچھ لینا دینا نہیں اور جتنا بحث مباحثہ ہوتا ہے اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا کیوں کہ تمام کردار روحانیت سے کوسوں دور ہیں اور محض زبانی کلامی گفتگو کرنے تک محدود ہیں۔ لیکن اس ساری بحث کو راؤ مزاحیہ انداز اور طریقے سے ختم کرتا ہے اور یہ کہتا ہے شیلا تم میرے پیار و محبت کا مثبت جواب دینے کی بجائے ٹال مٹول کے لیے ادھر ادھر کے فضول موضوعات پر گفتگو کرتی ہو جب کہ میرے عشق کا جواب نہیں رے رہی ہو۔

> ہر مرتبہ جب میں تم سے اظہار عشق کرتا ہوں تم کوئی نیا عذر کوئی نئی بات نکال کر مجھے
> ٹال دیتی ہو۔ مشرق کی رومانیت مغرب کی مادیت۔۔۔[۱۷]

رات کے چند لمحے آرٹ اور فلسفہ کی لاحاصل گفتگو کی نظر ۔ اہل مغرب کا روحانیت سے اتنا رشتہ ہے بھی نہیں جتنا مشرق کا ہے۔ اہل ہند کے پاس مدت سے ہندوازم میں ایک رسم چلی آرہی ہے جیسے ''نروان'' بھی کہتے ہیں کہ دنیا سے مکمل طور پر منہ موڑ کے الگ ہو جانا۔ غاروں میں چلے جاتے ہیں جہاں وہ کسی سے بھی رابطہ نہیں رکھتے۔

"لندن کی ایک رات" میں اردو شاعری اور شعر اپر جابجا تنقید ملتی ہے۔ اردو شاعری کے جادوئی اثر پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔ کہ شاعری کا دماغ پر اثر بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ شاعری کا اثر اور روحانیت کا اثر ایسا ہے کہ آپ دنیا کی حقیقت سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر آپ حقیقت کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں۔ روحانیت اور شاعری میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اور وہیں پڑے رہتے ہیں۔ آنکھیں

بند کیے جب کہ آنکھیں کھولنے پر حقیقت آپ کے سامنے ہوتی ہے اور آپ اس سے آنکھیں چار نہیں کر پاتے۔ مشرق اور مغرب کی باہمی کشمکش میں روحانیت ہار گئی اور مادیت جیت گئی اور رومانیت کی مزاحمت بالکل بے اثر اور نا ہونے کے برابر تھی۔

آرٹ اور فلسفہ کے تقابل کی طرح ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں مشرق اور مغرب کے رسم و رواج اور ان دونوں (ہندوستان۔لندن) کے موسم برسات اور عورتوں کی آزادی کا بھی تقابل کیا گیا ہے۔ سجاد ظہیر لندن میں تعلیم کے سلسلے میں جانے سے پہلے ہندوستان کے رسم و رواج اور یہاں کی عورت کی حالت زار کو بخوبی جانتے تھے۔ ہندوستان میں مرد، عورت کے تعلق کو شادی بیاہ کے طور طریقوں کا اکثر جگہوں پر موازنہ کرتے ہیں۔ نعیم ہندوستان اور انگلستان میں مرد اور عورت کے باہمی میل جول کا موازنہ اور تقابل کرتے ہوئے سوچتا ہے کہ:

> مجھے اس کا مواقع بہت کم ملتا ہے کہ یہاں (انگلستان) کی سمجھ دار عورتوں سے باتیں کروں! اور ہمارے ہاں ہندوستان میں تو آپ جانتی ہیں کہ مرد اور عورت خصوصاً نوجوان اس طرح سے بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتے۔۔۔[۱۸]

انگلستان میں یہ تبدیلی (عورت کا آزاد ہونا) کوئی دو چار دن میں نہیں آئی۔ بر صغیر میں آج جس مقام سے عورت گزر رہی ہے ایک وقت تھا کہ یورپ میں بھی عورت کی حالت گئی گزری تھی۔ لیکن آج مغرب میں عورت کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ لیکن مشرق (ہندوستان) میں یہ آج بھی عورت، مرد کا اکٹھا بیٹھنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مغرب میں عورت کی آزادی کس طرح اور کس مقصد کے تحت وجود میں آئی۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ سرمایہ داروں نے اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اس آزادی کے ثمرات کیسے سمیٹے اور کن مقاصد کے لیے عورت کو استعمال کیا۔

ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں عورتوں کی شادی کا ثقافتی موضوع بھی زیر بحث آیا ہے اور مغرب میں عورت کی آزادی خاص کر شادی کے معاملے میں مرضی اور بر صغیر میں عورت کی شادی کے معاملے میں آزادی کا تقابل کیا گیا ہے۔ کہ مشرق میں عورت شادی کرنے میں کتنی آزاد ہے اور کتنی پائیدار اور مغرب میں اُسے کتنا اختیار حاصل ہے کہ وہ جہاں چاہے شادی کرے۔

> ہم نے اپنے گھروں سے عشق و محبت کو کوڑے کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ جیسے کابک کے خانوں میں بند کر کے کبوتروں کے جوڑے نکالے جاتے ہیں اسی طرح ہمارے ہاں

نر اور مادہ انسان بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں بند کر دیے جاتے ہیں
اس رسم کو ہم "شادی" کہتے ہیں۔[۱۹]

راؤ کی اس بات کو آج مابعد تناظر میں بھی دیکھا جائے تو یہی حال ہے۔ آج بھی برصغیر میں لڑکی کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ اس معاملہ میں ہندوں، مسلمانوں میں فرق نہیں۔ یہ معاملہ دونوں قوموں میں یکساں موجود ہے لڑکی اپنی مرضی سے شادی کرے تو اس طرح کی شادی کو والدین اور خاندان کی ناک سے جوڑا جاتا ہے گاؤں کی سطح پر تو یہ عوامی موضوع بن جاتا ہے اور طرح طرح کے طعنے دے دے کر اس خاندان کا جینا مشکل کر دیا جاتا ہے۔

سجاد ظہیر مشرقی عورت کی حیثیت و مقام کو خوب جانتے تھے اور وہ جب انگلستان جاتے ہیں تو وہاں عورت کی آزادی دیکھتے ہیں۔ تو وہ راؤ اور شیلا گرین کے مکالمہ میں اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ کہاں ہندوستان جہاں عورت گھر سے باہر قدم تک نہیں رکھ سکتی۔ کسی سے بات تک نہیں کر سکتی۔ باقاعدہ پردہ کا انتظام ہوتا ہے اور گھر میں بھی اسے طرح طرح کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کہاں انگلستان جہاں عورت مردوں کے ساتھ ناچ سکتی ہے اور پارٹیوں میں جاسکتی ہے۔

بڑے تخلیق کار کی تخلیق میں اتنی جان ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے زمانے کی عکاس ہوتی ہے بلکہ آنے والے زمانے کا بھی عکس لیے ہوئے ہوتی ہے۔ مرد اور عورت کی شادی کا معاملہ مابعد نوآبادیاتی دور میں بھی ویسا ہے جیسا سجاد ظہیر کے دور میں تھا والدین یا خاندان جہاں چاہتے ہیں وہیں لڑکی کی شادی کر دیتے ہیں۔ اور اس میں بہت سے معاملات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح کا جوڑا شاہی جوڑا تصور ہوتا ہے اور اپنی مرضی سے شادی کرنے والی لڑکی کو اکثر اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ سجاد ظہیر اس بات کو روحانیت سے جوڑتے ہیں کہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ہم مشرق والے روحانیت کے معاملہ میں مغرب سے آگے ہیں۔ اور اس کی مثال راؤ، شیلا گرین کو کبوتروں کے جوڑے ملانے سے دیتے ہیں کہ ہم ایک لڑکی اور لڑکے کا جوڑا بھی ایسے ملاتے ہیں جیسا کبوتر باز نے چاہا ویسا کر دیا اسے مکمل اختیار حاصل ہے اور وہ کسی کے سامنے جواب دہ بھی نہیں ہے۔

انگلستان میں لڑکیاں اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہیں وہ مردوں کے ساتھ بیٹھ سکتی ہیں۔ سجاد ظہیر ہندوستان کے معاشرہ کو روحانیت کے اندھیرے راستوں پر دھکیلنے کا ذمہ دار مولویوں کو قرار دیتے ہیں۔ برصغیر میں یہ معاملہ شروع سے چلا آ رہا ہے کہ ہم دین کو اپنی مرضی سے موڑتے آئے ہیں۔ اور خاص کر جہاں اپنے مفاد کا

معاملہ آجائے وہاں مذہب کا سہارا ڈھونڈا جاتا ہے۔ آج بھی ملائیت کا حال ۱۹۳۰ء کی دہائی والا ہے۔ اور وہ لوگ مذہب کے نام پے لوگوں کو ہم خیال بنا کر اپنے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اگرچہ مرد اور عورت کو ساتھ مل کر ناچتے ہوئے ہمارے مولوی صاحبان ملاحظہ کریں تو ان کے تو دل کی حرکت رک جائے۔[۲۰]

سوچنے کی بات یہ ہے کہ معاشرہ کے دیگر افراد کے دل کی حرکت کیوں نہیں بند ہوتی۔ یہاں بنیادی طور پر جو بات کی گئی ہے کہ مولویوں نے خود کو دین کا ٹھیکیدار بنا لیا ہے اور عورت کی آزادی سے ان کی ٹھیکیداری خطرے سے دوچار ہو جاتی ہے۔ راؤ کی یہ بات مابعد بھی صادق آتی ہے اور ہم اپنے آس پاس معاشرہ میں آئے روز اس طرح کے ٹھیکیدار دیکھتے ہیں اور ان کے کارناموں کی خبریں میڈیا کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ عام عوام ویسے ہی دین کا ٹھیکہ مولوی کو دے کر بے فکر ہو چکے ہیں۔ کسی کو خود اسلامی تعلیمات جاننے کی ضرورت نہیں جہاں واضح لکھا ہے کہ اولاد سے سربراہ کو اسی کی مرضی معلوم کرنی چاہیے لیکن سب کچھ الٹ ہے والدین نے یا والد کے کسی دوست نے لڑکا پسند کر لیا اور لڑکی کو عین موقع پر بتایا گیا کہ آپ کی بارات یا نکاح ہے آپ کا فلاں کے ساتھ جوڑا بنا دیا گیا ہے۔

"لندن کی ایک رات" نے اپنے دور کے رجحانات و موضوعات کو اپنے اندر بخوبی سمیٹا ہے۔ اور اپنے دور کے رجحانات کا بہترین عکاس ہے۔ عورتوں سے متعلق رسم ورواج کا تقابل کرتے ہوئے ماضی سے حال تک کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اس ارتقائی سفر میں یہ مستقبل کا بھی آئینہ بن جاتا ہے۔ مغرب میں آج جو عورت کو آزادی حاصل ہے وہ کوئی دو چار دنوں یا دو چار سالوں کی محنت سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ کسی آئینی تبدیلی سے وہ آج آزادی میں سانس لے رہی ہے۔

پانچ سو برس پہلے یہاں (لندن) کی عورتوں کا قریب قریب وہی درجہ تھا۔ جو ہندوستان میں آج ہے[۲۱]

ایک وقت مغرب کی عورت پر بھی گزرا ہے کہ اسے بھی مردوں نے اور خاص کر مذہبی پیشواؤں نے خوب پامال کیا اور طرح طرح کے حربوں سے انہیں دبائے رکھنے کی کوشش کی مگر بعد میں حالات کی تبدیلی سے سب کچھ بدل گیا اور عورت بھی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

راؤ آج لندن میں بیٹھ کر جس رسم (شادی) کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس صورت حال کا سامنا پانچ سو برس پہلے مغرب کی عورت نے بھی کیا۔ اور آج انہی راستوں پر ہندوستان کی عورت پامال ہو رہی۔ ترقی یافتہ ممالک

میں آج جو آزادی عورت کو حاصل ہے۔ وہ طویل ارتقائی عمل کے بعد آئی ہے۔ مردانہ معاشرہ میں مرد کو یہ گوارہ نہیں کہ عورت کو بھی معاشرہ میں مرد کے برابر حقوق حاصل ہوں۔ اور اس مردانہ معاشرہ میں عورت کو وہ حیثیت حاصل ہو جائے کہ اس کی رائے کا احترام کیا جانے لگے۔ سماجی مثالیں جابجا نظر آتی ہیں کریما بیگم، نعیم کے پارٹی میں لڑکیوں کا ناچ دیکھ کر پریشان ہے اور وہ سوچ رہی ہے کہ یہ بے حیائی ہے اور احسان کی پیش کش کہ آؤ میرے ساتھ ناچو وہ مسترد کر دیتی ہے اور کہتی ہیں:

معلوم ہوتا ہے آپ بھول گئے کہ ہمارے ہاں (ہمارے ہاں کا مطلب ہندوستان ہے)
ناچنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔۔۔[۲۲]

بر صغیر کے پس منظر میں واقعی یہ بات معیوب اور ناممکن ہے۔ ہندوستان میں تو عورت اپنے حقوق کے حصول کا ارتقائی سفر میں آج بھی اس مقام تک نہیں پہنچی کہ اتنی بے باک ہو سکے اور ہندوستان (انڈیا، پاکستان) میں ہو سکتا ہے یورپی عورتوں کی آزادی کا نصف بھی بامشکل حاصل کر سکیں۔ کیوں کہ ہر معاشرہ کے اپنے مخصوص حالات اور تقاضے ہوتے ہیں۔ احسان، کریما بیگم سے گفتگو کے دوران اسے بر صغیر کی ایک رسم ''ستی'' کے بارے میں بتاتا ہے کہ کس طرح عورت صدیوں سے اس ظلم کی چکی میں پس رہی ہے۔

ہندوستان میں سیکڑوں برس تک زندہ عورتیں مردوں پر ستی ہو جائیں اس لیے کہ یہ
ان کا مذہبی فروں تھا۔[۲۳]

انگلستان میں بھی ایک وقت گزرا تھا جب پادری اور مذہب کے ٹھیکیدار، مذہب کے نام پر عورت کے حقوق پامال کرتے رہے اور طرح طرح کے ظلم و ستم کرتے رہے اور ہندوستان میں کئی برسوں سے ''ستی' کی رسم چل رہی ہے۔ اگر کسی عورت کا خاوند مر جاتا تو اس کی چتا کے ساتھ اس کی بیگم کو بھی زندہ جلا دیا جاتا اور عورت یہ سب کچھ برداشت کرتی اور چپ چاپ سہتی ہو جاتی کیوں کہ اسے بتایا گیا تھا کہ یہ مذہبی لحاظ سے اس کا فرض ہے۔ بحیثیت انسان اس کے لیے رحم کا کوئی وجود نہیں۔

پس منظری کہانی اور چند دوسرے موضوعات کے ساتھ ظاہری طور پر جو ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کی کہانی ہے وہ ہندوستانی طالب علموں کے حالات و واقعات کا بیان ہے۔ وہ طالب علم وقت کے لیے ضائع کرتے ہیں اور ان کے بحث و مباحثہ کے موضوعات کیا ہوتے ہیں۔ یہ پہلے زیر بحث لایا جا چکا ہے۔ اب یہاں ان طالب علموں کی زندگی اور ذہنیت کا مجموعی طور پر جائزہ کیا گیا ہے۔

> موضوعاتی اعتبار سے یہ صرف لندن میں زیر تعلیم ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا ایک رخ ہے یعنی یہ کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے دور اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے اس سے بھی بہت سسوں کی طرح اغماز برتتے ہیں۔[۲۴]

بہ ظاہر ''لندن کی ایک رات'' کی کہانی لندن میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کی کہانی ہے کہ وہ کیسے زندگی گزارتے ہیں؟ اُن کے مقاصد حیات کیا ہیں اور وہ وہاں آزاد فضا میں اپنی پڑھائی کی طرف کتنی توجہ دیتے ہیں۔

ہندوستان کا رہنے والا کوئی طالب علم انگلستان میں لڑکیوں کے پیچھے ایک دو سال ضائع کر دیتا ہے تو یہ ایک نفسیاتی پہلو ہے کہاں ہندوستان جیسا قدامت پرست معاشرہ اور کہاں انگلستان جہاں ہندوستان سے مکمل مختلف ماحول۔ یہی حال لڑکیوں کے معاملے میں بھی رہا کہ لندن میں گوریوں کے ساتھ عشق و عاشقی میں اکثر طالب علم وقت ضائع کرتے ہیں اور تعلیم کے نام پر دو چار سال اضافی لگاتے ہیں۔ اور ان طالب علموں میں سے دو چار طالب علم تو کسی نہ کسی گوری کو بیاہ کر ساتھ بے لے آتے ہیں۔ خود سجاد ظہیر اس حوالے سے ناولٹ کے شروع میں وضاحت کر دی ہے کہ اُس ناولٹ کا موضوع کیا ہے۔

> یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا ایک رخ اگر دیکھنا ہو تو اسے (لندن کی ایک رات) پڑھیے۔[۲۵]

ناولٹ کی کہانی کا خیر ایک رخ تو یہ ہوا کہ طالب علموں کی زندگی کا تجزیہ ان کی ذہنی افتاد کا بیان اس ناولٹ کو موضوع ہے مگر اصل کہانی یعنی دوسرا رخ بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور آگے الگ عنوان کے تحت زیر بحث لایا جائے گا۔ ہندوستان کے طالب علم ایک تنگ اور گھٹن والے معاشرہ سے نکل کر ایک کھولے معاشرہ میں جاتے ہیں تو پڑھائی ان کے لیے ترجیح نہیں رہتی اور ان کی اصل ترجیح گوری لڑکیاں بن جاتی ہیں۔ دو چار لڑکیوں سے عشق لڑانا ہی وہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔

> ہندوستان سے آنے والے طالب علموں کا یوروپی مقامات پر خوب صورت اور نسبتاً آزاد بے باک لڑکیوں سے Encounter جو نفسیاتی عوامل کے ساتھ ساتھ سیاسی عوامل بھی رکھتا ہے۔[۲۶]

یہ ایک فطری عمل بھی ہے کہ ایسا معاشرہ جس میں جنسی خواہشات کو دبا کے رکھا جاتا ہے اور کسی صورت بھی ممکن نہیں کہ کسی جنسی خواہش کو ظاہر کیا جائے۔ اور ایسے معاشرہ میں جس نے خود کو جتنا چھپا رکھا

ہے وہ اتنا ہی اچھا ہے ایسے معاشرہ کا بندہ اگر انگلستان جیسے معاشرہ میں جائے گا تو وہ لازماً اپنی دبی ہوئی خواہشات کو پورا کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ اور پڑھائی اس کے لیے دوسری ترجیح بن جائے گی۔ آج بھی برصغیر کے لوک جب یورپ جاتے ہیں تو وہ بھی کچھ۔ ان طالب علموں سے مختلف نہیں کرتے۔ اور وہاں کلبوں میں اور لڑکیوں کو راغب کرنا وہ لازمی یہی کام کرتے ہیں۔ اس کی مثال عارف ہے۔ اس کے لیے اپنی جنسی خواہش کو پورا کرنا لازمی ہے۔ خواہ وہ کسی بھی لڑکی ہو۔ اس نے لڑکی کے ساتھ رات بسر کرنی ہے خواہ بد شکل ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی اس طبقہ کے لیے محض اپنا لطف اہم ہے۔ یہ تو بس مشین ہیں جو سوچنے سے عاری ہے۔

ب) ''لندن کی ایک رات'' میں مارکسی موضوعات:

خود سجاد ظہیر اور دیگر ناقدین کے خیال میں ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں پیش کردہ تصویر کا ایک رخ تو لندن میں پڑھنے والے ہندوستانی طالب علموں کی عادات، روزمرہ کی مصروفیت ہیں۔ کہ وہ کیسے اپنا وقت فضول کاموں، بحث و مباحثہ میں ضائع کرتے ہیں۔ اور مخصوص مدت میں اپنی ڈگری نہیں لے پاتے۔ اور اضافی وقت لگا کر وہ بھی مشکل سے ڈگری حاصل کرتے ہیں۔

لیکن ''لندن کی ایک رات'' میں تصویر کا ایک رخ اصل اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ سجاد ظہیر کی اس تحریر کا مقصد صرف اور صرف لندن میں قیام پذیر ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا عکس پیش کرنا ہرگز نہیں تھا۔ ٹھیک ہے ایک سطح تک اس بات کو مان لیتے ہیں کہ ان ہندوستانی طالب علموں کی زندگی اور ان کے معاملات کو منظر عام پر لایا جائے یا ان کی تصویر کشی کی جائے لیکن ان طالب علموں کو ہم محض ڈراما کے ارکان (کردار) سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تمام کردار ایک کٹ پتلیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن کی ڈور سجاد ظہیر کے ہاتھ میں ہے اور وہ انہیں زیادہ دور یا اپنی مرضی نہیں کرنے دیتا۔ تمام کردار جلد یا بدیر اپنے مرکز پہ لوٹتے ہیں۔

> یہ اس نسل کی کہانی ہے جس نے بچپن میں پہلی جنگ عظیم دیکھی ہے۔ اور اب انہیں دوسری جنگ عظیم کا خطرہ درپیش ہے۔ کوئی بھی محفوظ نہیں، نچلے اور درمیانے طبقات کو بھوک اور بے روزگاری کا روگ ہے جب کہ اعلیٰ طبقات اشتمالی انقلاب کے اندیشے سے دبلے ہو رہے ہیں۔[۲۷]

نعیم کے ہاں ہونے والی پارٹی کے تمام کرداروں کو دیکھا جائے تو وہ سارے اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں کیوں کہ عام لوگوں کو تو اس دور میں دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا اور ان سب طالب علموں کو گھر سے معقول رقم بھی ہر ماہ مل رہی ہے اگرچہ وہ یہ رقم پڑھائی کی بجائے ادھر ادھر کے

مشاغل میں خرچ کر دیتے ہیں یہ اس طبقہ کے لوگ بھی معاشی لحاظ سے عدم تحفظ کا شکار نظر آتے ہیں اور انہیں اپنا مستقبل مقدوش نظر آرہاہے۔

ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' شروع کرنے سے پہلے ایک اہم بات جو خود سجاد ظہیر لکھتے ہیں اس کی طرف توجہ دیناانتہائی ضروری ہے کیوں یہ ناولٹ کی حیثیت کا سوال بھی بن گیاہے۔ خود ایک مصنف کی رائے کسی اپنے فن پارے کے بارے میں وہ خاص اہمیت رکھتی ہے اس سے صرف نظر کرکے کسی طرح بھی اس فن پارے کی درست جہات کا تعین ممکن نہیں ہوتا۔

سجاد ظہیر نے خود ایک نقطہ اٹھایا کہ میں اب اس طرح کی (لندن کی ایک رات) کوئی اور تخلیق نہیں پیش کر سکتا پہلے یہی معاملہ انہوں نے صنف کے تعین میں کیا کہ قاری خود فیصلہ کرے کہ وہ اس فن پارے کو طویل افسانہ کے طور پر لیتاہے یاناول کی حیثیت دیتاہے۔ نہ تو وہ بحثیت صنف اس کا تعین کرتے ہیں اور نہ اس طرح کا اور کچھ لکھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں تھیوری سے پر کٹیکل مختلف ہے۔

میں (سجاد ظہیر) اس قسم کی کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔[۲۸]

دوبارہ کیوں نہیں لکھ سکتے؟ یہ سوال اہم ہے۔ پہلے دور میں جب ''لندن کی ایک رات'' لکھا گیا اس وقت سجاد ظہیر محض خیالات کی حد تک مارکسی نظریہ کے قائل تھے اور عملی طور پر وہ میدان میں نہیں اترتے تھے۔ جب ایک انسان ایک بات سوچتاہے اور وہ سوچ کاغذ کی حد تک محدود ہوتی ہے۔ دوسری طرف جب وہ سوچ / نظریہ عملی طور پر نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ بالکل مختلف کام ہے اور یہ راستہ مشکلات سے بھرپور ہوتاہے۔

سجاد ظہیر کا بھی یہی معاملہ ہے وہ مارکسی نظریہ کے قائل ہوئے اور ذہنی طور پر اسے قبول کیا اور کاغذ قلم سے جدوجہد شروع کی۔ بعد میں جسے وہ عملی صورت میں ڈھالنے کے لیے میدان میں اترے سیاسی جماعت (کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا) میں شامل ہوئے لوگوں کو ہم خیال بنانے کے لیے پورے ملک کے دورے کیے۔ اس لیے وہ اہمیت ان کے خیال میں اس ناولٹ کو نہیں حاصل ہوتی جو عملی طور پر میدان میں آنے سے پہلے تھی۔ جب کہ مارکسی نظریہ کی تبلیغ کے حوالے سے یہ ناولٹ خاصہ اہمیت کا حامل ہے۔

سجاد ظہیر کو ''لندن کی ایک رات'' پس از وقت یانامناسب ہو جانا اس لیے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صرف خیالات اور تحریر کے ذریعے افکار کی اشاعت کی منزل سے گزر کر

> مداوائے درد دل کے لیے عملی طور پر مزدور اور مظلوم عوام کی حمایت میں ان کی صفوں میں شامل ہو چکے تھے۔[۲۹]

یہی حال ناولٹ کے کرداروں کا بھی ہے وہ بھی اکثر اوقات اشتراکیت کی تبلیغ کرتے اور ذہنی لحاظ سے اشتراکیت کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی صورت حال سجاد ظہیر کی زندگی کی عملی صورت بھی ہے۔

''انگارے ''اور ان افسانوں کی اشاعت کے وقت کے تناظر میں دیکھا جائے تو ممکن تھا کہ اگر یہ ناولٹ بطور اشتراکی نظریہ کے عوام کے سامنے آتا تو اس کا حال بھی ''انگارے'' جیسا ہوتا۔ اسی لیے بار بار تصویر کے دوسرے رخ کی بات کی جاتی ہے۔ یہ ناولٹ ظاہری صورت میں لندن میں موجود طالب علموں کی زندگی کا عکاس ہے جب کہ پس پردہ اشتراکی نظریہ کا پرچار کر رہا ہے اس لیے یہ ناولٹ پابندیوں سے بچ گیا اگر یہ بطور اشتراکی نمائندہ کے سامنے آتا ہے۔ تو اس پر پابندی لگ جاتی۔ اس پابندی کا اثر انگارے جیسا ہوتا کہ لوگوں میں تجسس پیدا ہوتا کہ اس میں کیا شامل ہے۔

> لندن کی ایک رات' کا ایک رخ جس میں ہندوستانی طالب علموں کا یہاں (لندن) آکر زندگی گزارنا ضمنی سا پہلو بن جاتا ہے۔ اصل میں یہ رخ مزدوروں کی بات چیت کے حوالے سے سوشلست مزاج کا پہلو پیش کرتا ہے۔[۳۰]

لندن میں مقیم طالب علموں کی زندگی کی ایک رات محض ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کا اگر موضوع ہو تو یہ ناولٹ کتنا غیر اہم ہو جائے۔ اور بے مزہ سا لگے سجاد ظہیر شائد اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ظاہر طور پر یہ بحیثیت اشتراکی نمائندہ کے یہ ناولٹ سامراج کو برداشت نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ ظاہری لحاظ سے یہاں عیاشی کا پہلو نمائیاں ہے۔ شراب نوشی ہو رہی ہے لڑکیوں کے ساتھ ڈانس ہو رہا ہے۔ تمام کردار بے فکری کے عالم میں ہیں مگر ان بے فکروں کی باتیں ظاہری بے فکری سے کئی گناہ گہری ہیں۔ کچھ کردار جن میں اعظم اور راؤ سر فہرست ہیں وہ اشتراکیت کے پکے سپاہی ہیں اور وقفے وقفے سے اشتراکی موضوع زیر بحث لاتے ہیں کبھی سنجیدگی سے اور کبھی طنزاً اور احسان میں تو خود سجاد ظہیر کا عکس نظر آتا ہے۔ لیکن اس ظاہری بے فکری کے پیچھے بہت سنجیدہ اور بڑا موضوع ہیں۔

> یہ اچھا ہوا کہ اس ناول (لندن کی ایک رات) کی پبلسٹی انگلستان میں زیر تعلیم ہندوستان کے بے فکرے طالب علموں کی کارکردگی کے طور پر ہوتی اور یوں اس کے اندر کا مواد قبل از وقت چوکنا کر دینے اور بعد کی تعزیروں اور کاروائیوں کا دعوت نامہ نہ بن سکا۔[۳۱]

''لندن کی ایک رات'' میں مزدورں کا درد محسوس کیا جاسکتا ہے پھٹے پرانے کپڑوں میں، سخت ہاتھ، بے حال مزدور سراپا احتجاج ہیں اگرچہ وہ آہستہ آہستہ اپنے مسائل سے آگاہ ہو رہے ہیں اور اپنے حقوق کے لیے دنیا بھر میں آواز بلند کر رہے ہیں۔ کیوں کہ یہ دور انقلاب روس کا ہے۔ اور دنیا میں مارکسی نظریات کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مزدوروں کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ سرمایہ دار ان کو کیسے مشین کے پرزے کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ جب کہ مزدور کی حالت بہت خراب ہے انہیں زندگی کی کوئی سہولت حاصل نہیں ہے۔ بس ان کی صرف یہی ایک ذمہ داری ہے کہ وہ وسائل اور منافع پیدا کر کے سرمایہ دار کی جیبیں بھریں۔ اور خود اس آمدن میں سے بہت قلیل حصہ جن پر بمشکل گزارہ ہوتا ہے وہ حاصل کریں۔ باقی ساری آمدن سرمایہ دار سمیت کر اپنے گھر لیے جاتا ہے۔

> یوں لگتا ہے کہ قوم و ملک سے بے نیاز دنیا بھر کے محنت کش حق و انصاف اور قومی آزادی کی راہ پر ایک ہو رہے ہیں۔ گویا آقاؤں کی قوم میں غلاموں کے حمایتی پیدا ہو گئے۔[۳۲]

یہ وہ دور ہے جس میں نو آبادیاتی جائزہ بھی اہم ہے۔ نو آبادیاتی دور میں مارکسی نظریہ دنیا بھر میں سر اٹھاتا ہے اور پرولتاری ادب دنیا میں اپنی جگہ اور مقام پیدا کرتا ہے کیوں کہ عام مزدوروں کو دونوں طرح سے دبایا جارہا ہے ایک تو سامراج اور دوسرا سرمایہ دار جن کو باقاعدہ سامراج کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے وہ مزدوروں کے حقوق سلب کرنے اور انہیں دبا کے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں دنیا بھر کے مزدوری کو مارکسی نظریہ کی صورت میں ایک مسیحا نظر آتا ہے اور ان کی سوچ ایک نئی طرز سے آشنا ہوتی ہے۔ وہی سوچ / نظریہ ان کو احساس دلاتا ہے کہ آپ مشین کے پرزوں کی طرح محض ایک پیداواری پرزا نہیں ہیں بلکہ ایک انسان ہیں اور آپ کے حقوق ہیں جو کہ سرمایہ دار اپنے مفادات کے لیے دینے کو تیار نہیں۔ کوئی بھی نظریہ دنیا کے انسانوں پر مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ زبردستی ان کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ آپ اس نظریہ کو اپنائیں۔ دنیا میں ایک خلا پیدا ہوتا ہے اور وہ خلا ایک سوچ / نظریہ پر کرتا ہے یہ عمل یک طرفہ نہیں دنیا بھر کے سرمایہ دار ایک مٹھی کی طرح اکھٹے ہیں کیوں

کہ ان کے مفادات ایک ہیں۔ لیکن مزدوروں کو اپنے حقوق و مفادات کا احساس مارکس کے اس نظریہ نے دلایا جس میں مزدوروں کو دنیا کے اپنے اپنے ملکوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کو بھی ایک پرزا کی بجائے ایک انسان کے طور پر لیا جائے۔ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا جائے ان کو مناسب آرام ملنا چاہیے۔ اور منافع سے مناسب حصہ ملنا چاہیے۔

جب بھی دنیا میں کہیں بھی مزدوروں کے حقوق اور مسائل کی بات ہوتی ہے تو اس کا تعلق پوری دنیا کے مزدوروں سے ہوتا ہے کیوں کہ تمام دنیا کے مزدوروں کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب برصغیر کے مزدوروں کے مسائل کی بات ہوتی ہے تو گورے مزدوروں کے مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی جب مزدور آواز بلند کرتے ہیں تو انہیں ماسکو یعنی روس (انقلاب روس ۱۹۱۷ء) سے ان کے تعلق کو جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

> جب کبھی ہم مزدور اسٹرائک کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو یہ اخبار ہمیشہ قصوروار ہمارا ہی بناتے ہیں۔ جیسے ہم کو فاقہ کرنے اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹنے میں مزہ آتا ہے کیا تم اس کو سچ کہو گے اور آج کل گورنمنٹ پر دباؤ ڈالیں اور سارے ملک کی توجہ اپنی ردی حالت کی طرف مبذول کرئیں تو یہ اخبار کہتے ہیں کہ وہ سب اٹھائی گیرے، نکمے، ماسکو کے زرخرید غلام ہیں۔[۳۳]

کارل مارکس کے نظریات کا عملی مظاہرہ چوں کہ روس میں ہوا اور مارکسزم کی عملی شکل و صورت ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کی صورت میں سامنے آیا اس انقلاب کو بطور ماڈل مزدوروں نے اپنے لیے مشعل راہ سمجھا۔ یہ انقلاب کامیاب ہوا تو دنیا بھر کے مزدوروں کے لیے ایک امید کی کرن پیدا ہوئی، مختلف ملکوں اور خطوں میں مزدوروں نے اپنے حقوق کا عالم بلند کیا۔ اخبارات یا سرمایہ دار حکومتوں میں اگر مزدوروں کی آواز کا تعلق ماسکو یعنی روس سے جوڑتے ہیں تو کسی حد تک وہ ہیں بھی ٹھیک کیوں کہ اس انقلاب کے اثرات پوری دنیا پر پڑھ رہے تھے مارکسزم کا کاغذی نظریہ عملی شکل و صورت میں سامنے آ چکا تھا۔ اور اس کی وسعت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

دنیا میں کہیں بھی جب مزدور اپنے حق کی بات کرتے تو ان کا تعلق روس سے جوڑ کر سرمایہ دار حکومتیں اسے بدنام کرنے کی کوشش کرتیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہی مزدور کے استحصال پر ہے اور سرمایہ دار مزدور کے خون پسینے سے پیدا کیے گئے مال کا بہت قلیل حصہ اس کو صلے / معاوضہ کی صورت میں دیتا

اور زیادہ حصہ سرمایہ دار کی جیب میں چلا جاتا۔ لیکن جب مارکسزم کی بات ہوتی تو یہ صورت سرمایہ دار کے خلاف جاتی ہے۔ اس دور میں برطانیہ اور امریکہ سمیت مختلف ممالک سرمایہ دارانہ طرز حکومت اختیار کیے ہوئے تھے تو یہ مزدور کے حقوق کی بات کرنا ان سے ہضم نہیں ہوتا تھا کہ مزدور کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔ زندگی کی سہولتوں پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا دوسرے سرمایہ داروں کا ہے اور اصل نقطہ مارکسزم کا یہی ہے کہ منافع برابر تقسیم ہو اور نجی ملکیت کو ختم کیا جائے تو یہ باتیں سرمایادارانہ نظام حکومت والے ملکوں سے کیسے ہضم ہو سکتی تھیں جو اس نظام کے حامی تھے اور مارکسزم کو اپنے لیے دنیا بھر میں خطرہ سمجھتے تھے۔ احسان جو خود سجاد ظہیر کا عکس ہے اس کی رائے ذرا سنیے۔

انقلاب کے پہلے آپ کی طرح (خان جو کہ خود کو نواب سمجھتا ہے) کے جانور روس میں پائے جاتے تھے۔ بالشکوئیوں نے ان کو اپنے کھیتوں کی کھاد بنا ڈالا۔ ۳۴

۲۰ ویں صدی میں ابلاغ کی صورت حال بہت بدل گئی تھی پچھلی صدی کے مقابلہ میں اس میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی واقع ہوتا تو اس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دیتی۔ ایک طرف ایک آواز ابھر رہی ہے۔ اور دنیا بھر کے مزدوروں کو اپیل کر رہی ہے اور مزدوروں کو اپنے جسم میں اس آواز سے نئی طاقت مل رہی ہے تو دوسری طرف سرمایہ دارانہ حکومتیں اسے مسلسل دبانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ برطانیہ بھی ایک سرمایہ دار ریاست ہے۔ اور نہیں چاہتا کہ ان کے ملک میں اور ان کی نو آبادیوں (بشمول ہندوستان) میں مزدوروں کو اپنے حقوق کی خبر ہو۔

۔۔۔کیمونسٹ اور سوشلسٹ لٹریچر کی درآمد ہندوستان میں ممنوع تھی۔ بس یورپ سے کبھی کبھار کوئی شخص چوری چھپے مارکس اینگلز اور لنین وغیرہ کی کتابیں لے آتا تو اسے سائیکلو اسٹائل کرکے چپکے چپکے تقسیم کر دیا جاتا۔[۳۵]

برطانیہ نے بھی یہی کچھ کیا اور پوری کوشش کی کہ اس کی نو آبادی (ہندوستان) بھی مارکسزم کی ہوا سے دور رہے اور یہاں کے مزدور بھی اس نظریہ سے لاعلم رہیں۔ اور وہ محض سرمایا دار کے لیے ایک پیداواری پرزہ بنے رہیں مگر ۲۰ ویں صدی میں کسی بھی گروہ کو زیادہ دیر اندھیرے میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ یہاں بھی مزدوروں نے اپنے حق کے لیے آواز بلند کی مگر نو آبادکار نے اپنی چال بازیوں سے اور حکمت عملی سے مارکسزم کے اس نظریہ کو کسی حد تک کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اور اسے دبائے رکھنے میں کامیاب رہے۔

''لندن کی ایک رات'' میں پریشان اور دنیا بھر کے مزدوروں کی حالت کا نقشہ عجیب انداز میں کھینچا گیا ہے اور اس سے ایک چیز سامنے آتی ہے کہ دنیا بھر کے مزدوروں کی حالت ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ اسی لیے مارکسزم نے دنیا بھر کے مزدروں کے دل میں جگہ بنائی اور انہیں اس میں اپنے لیے عافیت نظر آنے لگی۔

برصغیر میں تو بہت حد تک مارکسزم کی تبلیغ کا کام خود سجاد ظہیر نے کیا کسی نہ کسی طرح چوری مارکسی مصنفین کی کتب برصغیر میں پہنچائیں۔ اس کے لیے خواہ انہیں تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اور ان کی قائم کردہ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا پر بھی پابندی لگادی گئی اور کئی دفعہ انہیں پابند سلاسل کیا گیا۔ مگر وہ مزدور کا حال بیان کرنے اور ان کے حقوق کی بات کرنے سے بعض نہیں آتے۔ اور مزدوروں کی ظاہری حالت زار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> جن (مزدوروں) کے چہروں پر دھوپ اور ہوا اور بھوک کے اثرات سے جھریاں ار گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ جن کے ہاتھ مزدوری کرنے سے سخت اور مضبوط معلوم ہوتے تھے جن کی آنکھوں میں محنت کی روشنی تھی۔ جن کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ جن کی ٹانگیں ان کی میلی دھوتیوں سے لکڑی کی طرح نکلی ہوتی تھیں۔۔۔[۳۶]

جس ملک میں مزدوروں کی یہ حالت ہو اور پھر ایک ایسے نظریہ کی جھلک انہیں نظر آئے جس میں ان کے برابر کے حصہ دار بننے کی بات کی گئی ہو تو مزدوروں کے لیے یہ کسی نعمت سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مارکسزم کی سوچ اور نظریہ نے دنیا بھر کے ہر خطے میں جہاں بھی مزدور بستے تھے۔ ان کو اس سوچ نے بے حد متاثر کیا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے سرمایہ دارنہ نظام میں پوری کوشش کی کہ انہیں دبایا جائے مگر وہ ایسا نہیں کر پاتے۔

جہاں تک درج بالا اقتباس میں مزدوروں کے ہاتھوں کی مضبوطی کی بات کی گئی ہے۔ سجاد ظہیر اس میں آنے والے دور کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس میں مزدوروں کا معیار زندگی بہتر ہو گا اور معاشرہ میں ان کے ہاتھ / پہنچ معاشرہ کے سرمایہ دار کے برابر ہو۔ مزدور بھی معاشرہ کے بالا طبقہ کی طرح انسان ہیں ان کو بھی زندگی کی سہولتوں کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہے۔ اور یہی بات درست ثابت ہوئی کہ مزدوروں کی حکومت آتی ہے اور سوسائٹی میں ان کی حیثیت کو تسلیم کیا گیا۔

دنیا بھر کے اور برصغیر کے ادب کو یہ نظریہ (مارکسزم) متاثر کرتا ہے۔اس سے '' ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کا فرق شروع ہوتا ہے۔مارکسی نظریہ کے عروج کے زمانے کا ادب مزدور کی زندگی (پرولتاری) کے گرد گھومتا ہے ادب میں عام لوگوں کی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے اور انہی عام لوگوں کے مسائل ادب میں جگہ پاتے ہیں۔''لندن کی ایک رات'' میں اکثر صفحات پر دیکھیں تو روحانیت اور شعر و شاعری جس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس کی مخالفت ملتی ہے اور معاشرہ اور ملک کی ترقی میں اسے رکاوٹ ظاہر کیا گیا ہے شیلا گرین اور خاص کر جبین کے مکالمے شدت سے شاعری اور خاص کر بے مقصد شاعری کی مخلفت میں ہیں کہ شاعری سے خمار کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور انسان معاشرہ میں بے عمل ہو جاتا ہے بالفاظ دیگر بے مقصد شاعری معاشرہ منفی اثر ڈالتی ہے نعیم کے بقول کہ ہر شخص جو کچھ پڑھا لکھا ہے وہ اپنے مضامین میں اپنی تخلیق میں شعروں کے حوالے دیتا ہے اور یہ اس کے صاحب علم ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔

''ادب برائے ادب'' کا نعرہ ایک مدت تک گونجتا رہا اور کہا جاتا رہا کہ اچھا ادب وہ ہے جس سے خوشی حاصل ہو اور اس سے روح کو تسکین پہنچے اور وہ کامیاب ادب ہے بس یعنی معاشرہ کی اصلاح میں ادب کا کوئی کردار نہیں وہ محض خوشی کا ساماں کرتا ہے اور پڑھے لکھے لوگ اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔اور اپنی تقریروں، تحریروں میں اس کا حوالہ دیتے ہیں اور اس ادب کا عام لوگوں کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ وہ ان کا نمائندہ ہوتا ہے۔

ترقی پسندوں نے اسے ادب کو اور طرح سے دیکھا اہمیت کہ ادب محض حض حاصل کرنے والی شے سے بالاتر ہے۔افسانہ کو خاص اہمیت حاصل ہوئی اس لیے کہ وہ مختصر وقت میں پڑھا جا سکتا ہے اور بہتر انداز میں عام لوگوں اور معاشرہ کے پسے ہوئے لوگوں کی نمائندگی کر سکتا ہے۔

> کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے بس اسی دن تم سب (نوابوں، راجوں) کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔[۳۷]

جس طرح پہلے باب میں یہ بات وضاحت سے پیش کی جاچکی ہے کہ کسی بھی دور کے ادب کو اس کے تخلیقی عہد اور اس عہد کے تناظرات میں دیکھنا اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور عہد کے تناظر میں ہی آپ اس ادب پارے کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔یہی صورت حال ''لندن کی ایک رات'' کی ہے یہ اس دور کی تخلیق ہے جس میں مارکسزم مزدوروں کے لیے مشعل راہ بنا بلکہ ان کا رہبر بنا۔

مارکسی نظریہ کی بدولت ہی مزدوروں کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا اور انہیں یہ نظریہ ایک نجات دہندہ کی صورت میں نظر آنے لگا۔ احسان ایسا کردار ہے اور سجاد ظہیر کی زبان اور ان کے دل کی بات کہہ رہا ہے۔ احسان، خان کے خود کو نواب، جاگیر دار کہنے پر غصہ ہوتا ہے اور وہ خان کو کھری کھری سنا دیتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مقامی جاگیر داروں نے نوآبادکار کے ساتھ مل کر مقامی لوگوں کا خوب استحصال کیا ہے۔

احسان کو انقلاب روس کی صورت میں مارکسزم کی کامیابی نظر آرہی ہے اور پوری دنیا میں عام مزدور طبقہ بھرپور طریقے سے اس میں شامل ہو رہا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام حکومت خلاف ہوتے جارہے ہیں۔ اور مزدوروں کے سرمایہ دارانہ حکومت کے خلاف جذبات بھڑک رہے ہیں۔ اور یہ چنگاری ایک دن بہت بڑے لاوا کی شکل اختیار کرے گی اور جاگیرداروں اور اس نظام کے مددگاروں کو جلا کر خاک کر دیگی۔ ''لندن کی ایک رات'' میں اشتراکیت کا پوری طرح پرچار نظر آتا ہے۔ برصغیر میں سجاد ظہیر کو ہم بہت بڑے مبلغ کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ یہاں (برصغیر) کے کونے کونے تک اس نظریہ کی تبلیغ کا سہرا انہی کے سر بندھا جاتا ہے اور دن رات ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کیا اور مختلف لوگوں کو ہم خیال بنانے کی پوری کوشش کی۔ لندن، پیرس سے ایک شمع روشن کی اور اس کی روشنی پورے برصغیر میں پہنچائی اور پھیلائی۔ کوئی بھی نظریہ کسی خطہ میں عوام پر مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے حالات موافق ہوں تبھی یہ پھیلتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھ جاتی ہے اور پھر اس خلا کو کسی اور سمت سے آنے والی ہوا پر کرتی ہے۔

> جب تک ہندوستان کے محنت مزدوری کرنے والوں کو جوتا کھانے میں مزا آتا ہے اس وقت تک ان بھیڑ کے گلوں کے لیے سر کھپانہ اور ان کی بھلائی کی کوشش کرنا محض ضیاع اوقات ہے۔[۳۸]

راؤ بھی احسان اور دیگر مارکسی خیالات رکھنے والے کرداروں کا ہم خیال ہے لیکن وہ سخت مایوس ہے۔ برصغیر میں مزدوروں کی حالت بھی گئی گزری تھی مگر نوآبادکار نے یونین اور ان کے اتحاد کو باقاعدہ منصوبہ بندی سے الگ الگ کر رکھا تھا اس لیے وہ مسلسل معاشرہ میں نچلی سطح پر پڑے تھے اور انہیں اپنے حقوق کا کچھ احساس نہیں تھا کہ ہمارے لیے بھی زندگی میں فرصت اور خوشی کا حق اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ سرمایہ دار کا ہے۔ سجاد ظہیر نے ادب میں ترقی پسندی کے رجحانات کو فروغ دیا تو دوسری طرف اس میں عملی طور پر فروغ دینے

کے لیے دن رات محنت کی یعنی ایک طرف ادب میں تبلیغ اور دوسری طرف عملی زندگی میں لوگوں کو ہم خیال بنانا۔ سجاد ظہیر نے تخلیق کی حد سے بڑھ کر عملی صورت حال کو بدلنے میں اہم کردار ادا کرنے کو اہمیت دی۔ یہ بنیادی طور پر ادب سے اگلا مرحلہ اور مشکل مرحلہ بھی تھا۔ اسی اگلے مرحلہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ان کی بہت کم تخلیقات سامنے آئی ہیں۔ کیوں کہ انہیں اتنی فرصت میسر نہیں آتی۔ باقی ساری زندگی عملی جدوجہد میں صرف کر دی۔ سجاد ظہیر کے لیے قلمی کوشش عملی کوشش سے مختلف اور کم درجہ کی تھی۔

۔۔۔ وہ لوگ جو اپنی دماغی یا جسمانی قوتوں کو کام میں لا کر سوسائٹی کو فائدہ نہیں پہنچاتے وہ قوم کے جسم پر بد نما اور زہریلے آبلوں کی طرح ہیں جن کو کاٹ کر پھینک دینا چاہیے۔۔[۳۹]

یہ بات بنیادی طور پر سرمایہ داروں کے خلاف کہی گئی ہے کیوں کہ انہوں نے بغیر محنت کے محض انگریزوں کی خوشامد کر کے زمینیں اکٹھی کی ہے اور خوشامد سے ہی معاشرہ میں وہ دیگر افراد کا حق کھا کے بلند رتبہ حاصل کیے بیٹھے ہیں۔ اس میں ان کی اپنی محنت شامل نہیں ہے۔ ایک طرف اگر ''ادب برائے زندگی'' کا نعرہ تھا تو دوسری طرف ''زندگی برائے معاشرہ'' کا نعرہ درج بالا اقتباس میں نظر آتا ہے کہ ایسے افراد جو معاشرہ کی ترقی میں کردار ادا نہیں کرتے وہ ایک بے کار پرزہ ہیں وہ نہ بھی ہوں تو معاشرہ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور اگر وہ معاشرہ میں موجود ہیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

برصغیر کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے ایسے بے فاعدہ لوگوں کی کثیر تعداد نظر آتی ہے۔ جن کی زندگی معاشرہ کے لیے بے سود ہے۔ سجاد ظہیر نے بھی ادب کے ذریعے اشتراکیت کی تبلیغ کی بجائے عملی کام کو ترجیح دی اور ان کے خیال میں ایسا ادب بھی بے کار ہے جس میں معاشرہ کے عام مزدور کی زندگی کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ اور اس میں محض طبقہ بالا کی زندگی کا عکس پیش کیا جاتا ہے وہ بے کار ادب ہے اشتراکیت میں پرولتاری ادب کی اہمیت ہے۔ جس ادب کا ہیرو ایک مزدور ہے۔

''لندن کی ایک رات'' میں سجاد ظہیر پرامن و پرسکون تبدیلی نہیں دیکھ رہے۔ اس کا پس منظر شائد اس وقت تک دنیا کے لیے مثال انقلاب روس ہے جن میں ''زار'' خاندان کو ختم کر دیا گیا۔ سجاد ظہیر اسی طرح کا انقلاب برصغیر میں چاہتے ہیں۔ نعیم کی بات کو ہم اسی تناظر میں سمجھ سکتے ہیں۔ ''اس دنیا میں آج تک کوئی چیز مفت ملی ہے؟

مفت تو کچھ بھی نہیں ملتا۔ ہاں اگر مزدور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کریں عملی طور پر روس انقلاب کی طرح باہر نکلیں تو بات ہے۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کے حصے کا کام کرے گا اور ان کے بیٹھے رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو یہ غلط بات ہے انہیں تو عملی طور پر اپنے سخت ہاتھوں سے یہ تبدیلی لانا ہوگی اور تبھی وہ اپنی حیثیت دنیا میں منوا سکتے ہیں اور اپنی پہچان حاصل کر سکتے ہیں۔

سرمایہ دار تو ان کے جسموں سے کام لیتا رہے گا اُسے ان کے حقوق، زندگی اور سہولتوں سے کیا لینا دینا۔ اگر مزدور باہر نکل کر انقلاب کی راہ ہموار نہیں کرتے تو صنعتوں کے بے جان پرزوں کی طرح وہ بھی بے جان پرزوں کی طرح استعمال ہوتے رہیں گے اور سرمایہ داروں کو بھی اس بات کا پتہ ہے کہ اگر مزدوروں نے کام سے انکار کیا تو ذرائع پیداوار ان کے کسی کام کے نہیں ہیں۔

> صنعتی انقلاب نے سرمایہ دارانہ نظام کو پیدا کیا جس کے نتیجے میں مزدوروں کے طبقے کی تشکیل ہوتی۔ جنہوں نے مختلف اور مشقت سے دن رات کی سختیاں جھیل کر سرمایہ دارانہ نظام کو پھیلایا۔۔[۴۰]

مزدور جن کو زندگی کی کوئی سہولت حاصل نہیں وہ چوبیس گھنٹے کام کر کے سرمایہ دار کی جیب بھرتے ہیں۔ اتنا کچھ پیدا کرنے کے باوجود ان کی حالت جوں کی توں ہے۔ وہ صرف اس لیے کہ بحیثیت انسان نہیں بحیثیت ایک پرزہ کام کرتے ہیں ان کو اگر اپنے آپ کو دنیا کے سامنے منوانا ہے تو اس کے لیے خونی انقلاب سے گزرنا ہوگا۔ دنیا میں روس کی مثال بہترین ہے۔ اس لیے دنیا میں جب بھی مزدور اپنے حقوق کی بات کرتے تو انہیں الشویک، مارکسی کہا جاتا ہے، ان کا تعلق ماسکو سے جوڑ دیا جاتا۔

> ۔۔۔ میں تو چاہتا ہوں کہ طوفانی ہواؤں کے تھپڑے کھاؤں اور پہاڑوں کی وادیوں میں دوڑتی ہوئی ہواؤں کی چیخ سنوں۔[۴۱]

یہ مکالمہ سجاد ظہیر کی انقلابی سوچ کا مظہر ہے۔ ہیرن پال کہتا ہے کہ میں بیٹھنے والا نہیں اور نہ بیٹھنے والا کام کروں گا میں مزدور مجاہد ہوں اور میں میدان میں آؤں گا اور مخالف طاقتوں سے ٹکراؤں گا۔ ہار یا جیت بعد کا معاملہ ہے یہی وجہ ہے کہ شیلا گرین کو فکر ہے کہ خط نہ آنے کی وجہ شائد یہ ہے کہ ہیرن پال مارا گیا ہو۔ کیوں کہ وہ مخالف طاقتیں اس کو زیادہ دیر برداشت نہیں کریں گی۔ مار دیں گی یا جیل میں ڈال دیں گی۔

صنعتی انقلاب کے بعد معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا ایک طرف سرمایہ دار تھے جن کا صنعتوں پر کنٹرول اور اجارہ داری تھی اور سارا منافع وہی سمیٹ لیتے تھے۔ دوسرا طبقہ مزدور طبقہ تھا جنہوں نے سرمایہ

دارانہ نظام کو مضبوط کرنے میں اور اس کے استحکام کی بھاری قیمت چکائی، اٹھارہ، بیس گھنٹے کام کرنے کے باوجود ایک وقت کا کھانا بھی مزدور طبقہ کو بمشکل دستیاب ہوتا تھا۔ ہیرن پال کی سوچ دیکھیں۔

۔۔۔ ابھی تک تو انسان خود اپنے روز مرہ کے کاروبار میں اندھی طاقتوں کا شتکار بنا ہوا ہے۔ ابھی تو ہمیں ان انسانی طاقتوں سے لڑائی لڑنا ہے۔ اس کے جیتنے کے بعد پھر ہمیں پوری فرصت ملے گی کہ ہمیں پوری فرصت ملے گی کہ ہم قدرت کی اندھی طاقتوں سے اپنی اپنی صلاحیت اوور پسند کے مطابق دست و گریباں ہوں۔ [۴۲]

انسان ابتدائے آفرینش سے قدرتی آفات پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اور سائنسی ترقی سے وہ کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا ہے۔ مثلاً سوئٹزرلینڈ میں بزرگ کا ہیرن پال اور شیلا کو قبل از وقت طوفان سے آگاہ کرنا ایک اہمیت کے حامل نقطہ کی طرف اشارہ ہے مگر یہاں دوسری طرح کی مصیبت کا سامنا خاصا مشکل رہا ہے۔ جس میں مزدوروں کا سامنا سرمایہ دارانہ طبقہ سے ہوا ہے۔ اور طاقت ور طبقہ نے ہمیشہ مزدوروں کا استحصال کیا ہے۔

ہیرن پال انقلابی سوچ رکھنے والا نوجوان ہے۔ اور وہ عملی طور پر کام کو ترجیح دیتا ہے کہ مزدورں کو حقوق چاہیے تو وہ میدان میں آئیں۔ یہاں یہ بحث جنم لیتی ہے کہ اشتراکیت کا مقابلہ سرمایہ دارانہ طرز حکومت سے ہمیشہ رہا ہے۔ اور سرد جنگ سمیت مختلف موقعوں پر ان دونوں نظاموں کا ہمیشہ ٹکراؤ ہوتا آیا ہے۔ اسی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام حکومت رکھنے والے ملک کے مزدور بھی اپنے حقوق سے آگاہ رہے ہیں۔ شیلا گرین اکثر اوقات ہیرن پال کو سمجھاتی ہے کہ وہ یہ کام چھوڑ دے مگر وہ بعض نہیں آتا اور وہ پختہ ارادہ کر چکا ہے کہ کسی مکان میں بیٹھ کر کام کرنے کی بجائے میدان میں اترے گا۔ شیلا گرین سے ہندوستان کے حالات و واقعات پر بات کرتا ہے۔ وہ چوں کہ ایک پکا اشتراکی ہے اس لیے وہ سیاسی حالات پر زیادہ بحث و مباحثہ کرتا ہے۔ شیلا گرین اسے تمام مصائب کو حل کرنے کا ٹھیکیدار کہتی ہے تو وہ جواب دیتا ہے۔

میرے کندھے پر ان مصائب کا ایک حصہ تو ہے ضرور میں تو صرف اسی کو ہلکا کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں اور اگر ہم سب کو اس کا احساس ہو جائے تو آدھی سے زیادہ لڑائی یوں ہی فتح ہو جائے۔۔۔ [۴۳]

خود سجاد ظہیر نے جب ترقی پسند تحریک یا اشتراکیت کے حوالے سے کام شروع کیا تو وہ میدان میں اکیلے تھے۔ چلتے چلتے ان کے ساتھ کارواں شامل ہوتا گیا اور پھر ایک وقت آیا کہ ایک کثیر تعداد میں لوگ ان کے ہم خیال ہوگئے۔ ترقی پسند تحریک پھیلتی گئی۔

ہیرن پال ایسا کردار ہے جو اپنے حصے کا کام کرنا چاہتا ہے۔ عام عوام کو خاص کر مزدور طبقہ کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنا چاہتا ہے تاکہ ان میں احساس پیدا ہو کہ ایک طرف وہ غلام (نو آبادی) میں تو دوسری طرف بحیثیت محنت کش ان کو ان کے جائز حقوق بھی حاصل نہیں ہیں اور سارا دن کام کرنے کے باوجود خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں اور منافع سرمایہ دار کی تجوریوں میں چلا جاتا ہے۔ ان کے بچے بھوک سے مرتے ہیں۔ اور سرمایہ دار کے بچے بھی ان کے حاکم ہیں۔ کم سے کم اگر اور کچھ نہیں تو انہیں احساس غلامی تو ہو ہماری حیثیت کیا ہے محض مشین کا ایک پرزہ محض ایک بے جان شے جو چلتی پھرتی ہے۔

برصغیر میں بھی اشتراکیت اس لیے مقبول ہوئی کہ یہاں بھی مزدوروں کا حال ابتر تھا۔ اس لیے وہ اس تحریک کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہیرن پال رومانیت کا رشتہ بھی مادیت سے جوڑتا ہے کہ ہمارے ہاں (ہندوستان) میں روحانیت بھی وہ نہیں جس طرح کی ہونی چاہیے۔

> جو قوم غلام ہو جس میں اسی فیصدی انسانوں کو پیٹ بھر کر کھانا نہ ملتا ہو۔ جس میں مرض، وبا، بیماری اس قدر پھیلی ہو کہ سارے ملک میں مشکل سے تندرست انسان نظر آتے ہوں۔ جہاں علم گنتی کے لوگوں تک محدود ہو۔ جہاں بچے تک کملائے ہوئے پھولوں کی طرح ہوں۔ اکثر لوگوں کے چہروں پر بھوک، ناقہ، غربت، مصیبت لکھی ہوتی ہو۔ اور باقیوں کے چہرہ سے سستی، حماقت، جہالت اور ایک مکردہ قسم کی خوشحالی نظر آتی ہو۔ وہاں زندگی کے ان رنگین تحفوں کو تلاش کرنا سراسر حماقت ہے۔ [۴۴]

برصغیر میں نو آبادکار (خاص کر انگریزوں کی آمد) آمد سے پہلے کیا صورت حال تھی۔ اور خاص کر معاشی لحاظ سے برصغیر کس مقام پر کھڑا تھا۔ یہ بات آگے چل کر زیر بحث آئے گا۔ برصغیر میں لوگوں کی اکثریت کی بہت خوب صورت اور حقیقی منظر کشی پیش کی گئی ہے۔ کہ ایسی قوم جس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں پہننے کے لیے کپڑے نہیں۔ وہ روحانیت میں ڈوبی ہے۔ جب پیٹ خالی ہوتا ہے تو وہ روحانیت سے نہیں بھرتا اس کے لیے روٹی چاہیے ہوتی ہے۔

غربت کی اس صورت حال میں برصغیر اور دنیا بھر کے مزدوروں کے لیے اشتراکیت ایک روشن صبح کی نوید تھی اور دنیامیں مزدوراس نعرہ اور اس تحریک کے جھنڈا کے سائے تلے جمع ہونے لگے کیوں کہ ان کے مسائل ایک ہی طرح کے تھے خواہ وہ لندن میں بسنے والے مزدور ہوں یا کلکتہ میں وہ سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ دنیامیں عملی انقلاب کی مثال صرف روس سے ملتی ہے مگر آگاہی کے حوالے سے اشتراکی نظریہ نے خوب کام کیا۔

بنیادی طور پر ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ کوئی تخلیق کار خود کو جتنے مرضی پردوں میں چھپالے مگر اس کی زندگی کی سوچ ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کی تخلیق میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو ہی جاتی ہیں۔ اور ناولٹ میں تو یہ صورتحال اور بھی واضح ہوتی ہے۔ سجاد ظہیر نے ظاہری طور پر لندن میں پڑھنے کی غرض سے گئے ہندوستانی طالب علموں کی زندگی اور روز مرہ کے کاموں میں چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں صاف بات برطانوی حکومت کو ہضم کرنے میں کافی مشکل ہوتی اور اس کا حال بھی ''انگارے'' جیسا ہوتا۔ انقلاب روس نے دنیابھر کے مزدوروں کی آنکھیں کھول دیں اور انہیں اپنے حقوق کے لیے اٹھنے اور راہ ہموار کرنے میں اٹھ کھڑے ہونے کا درس دیا۔

> انقلاب روس کا تمام اقوام مشرق پر گہرا اثر پڑا۔ دنیا کی پہلی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کا قیام سرمایہ داری اور جاگیری نظام کے خاتمے اور روسی سلطنت میں محکوم اشیا اقوام کی آزادی کی تحریکوں میں نیاجوش پیدا کر دیا۔[۴۵]

دنیاکے مزدور تو آرام سے سورہے تھے اور بس صبح سے شام کام کام اور حقوق سے ناواقف مگر انقلاب روس نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اور سب سے بڑھ کر خود مزدوروں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا اور وہ اس بات کو منوانے کے لیے آواز بلند کرتے ہیں۔

ج) ''لندن کی ایک رات'' میں نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی موضوعات:

نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی موضوعات ایسے ہیں جو دیگر موضوعات پر اثر انداز نسبتنا ذیادہ ہوتے ہیں۔ یہ موضوع دیگر موضوعات کی نوعیت متعین کرنے میں بھی مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک وقت ایسا تھا کہ برطانوی نو آبادیات کا پھیلاؤ اتناوسیع تھا کہ اس پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ مابعد نو آبادیاتی اثرات کی ذیل میں دیکھا جائے تو ابھی بھی پاکستان کی حد تک سورج کی وہی چمک دمک ہے۔ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جابجا برطانوی کالونیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اتنے وسیع خطے پر تسلط قائم رکھنے کے لیے برطانیہ

کو کوئی غیر معمولی فوج نہیں بھرتی کرنا پڑی یا کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھانا پڑا۔ کروڑوں انسانوں پر حکومت کے لیے چند ہزار انگریز کافی رہے۔ غیر معمولی فوج کی نسبت ان کی پالیسیاں غیر معمولی تھیں جو ان کی کامیابی کی ذامن تھیں اور اپنی پالیسیوں کی بدولت وہ اپنی منزل یا مقصد حاصل کرتے رہے۔

ایسی کیوں کر صورت حال پیدا ہوئی کہ برطانیہ کو ہزاروں کلو میٹر دور اپنی کالونیاں قائم کرنی پڑیں اور مختصر مدت کے لیے نہیں بلکہ طویل مدت تک ان پر تسلط قائم کیے رکھا۔ ایک سوال بار بار ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ ساری صورت حال کیوں کر پیدا ہوئی۔ اپنے عروج کے وقت ایسا بھی نہیں کہ برصغیر اور دیگر برطانوی کالونیاں کوئی غریب خطے تھے۔ اگر یہ تسلط قائم نہ ہوتا تو آج برصغیر کی صورت حال کیا ہوتی۔ اس عہد میں برطانیہ کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور دنیا بھر کی پالیسیاں اور دنیا بھر کی دولت کا مرکز لندن ہے اور دنیا میں تمام ممالک کا صرف ایک دارالحکومت ہے۔ وہ ''لندن'' ہے۔ دنیا کی تمام دولت اسی ایک شہر کی طرف کھینچی چلی آرہی ہے اور یہی خون نکالنے والی بوتل نو آبادی کو لگی ہوئی ہے اور سارا خون آہستہ آہستہ نکل کر برطانیہ کے جسم میں منتقل ہو رہا ہے۔ برطانیہ موٹا ہوتا جارہا ہے اور اس کی کالونیاں صرف ہڈیوں کا ڈھنچا رہ گئی ہیں۔ ان کی چمڑی تک خشک ہو چکی ہے۔ قدرتی وسائل سے بھرپور خطہ (برصغیر) کے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ زرعی لحاظ سے اعلیٰ قسم کی زمین ہونے اور اعلیٰ قسم کی فصل کے باوجود لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا میسر نہیں۔ ملک میں ہر طرف ہو کا عالم ہے اور لوگوں کا معیار زندگی مسلسل نیچے کی طرف جارہا ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' بھی اسی دور کے رجحانات و موضوعات کا ایک اہم نمائندہ ہے۔

''لندن کی ایک رات'' ناولٹ میں لندن کی ہی رات کیوں؟ کسی دوسرے شہر مثلاً، ممبئی، کلکتہ کی رات کیوں نہیں۔ اس ناولٹ کی کہانی کا دائرہ کار خاصا مختصر (بہ لحاظ وقت) ہے۔ اور اس وجہ سے اپنی سرزمین سے کسی شہر کا انتخاب مناسب رہتا مگر نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ وہ وقت ہے جس میں برٹش امپائر کو دنیا میں مرکزیت حاصل ہے۔ اور لندن پوری دنیا اور خاص کر اپنی نو آبادیوں کا مرکز ہے۔ پوری دنیا کی دولت کا رخ لندن کی طرف ہے۔ نو آبادیاں تنزلی میں ڈوبتی جارہی ہیں۔ لندن ترقی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

> میاں تم ہمارے یہاں رہنے لندن ضرور آؤ۔ کیا بانکا شہر ہے۔ تھیٹر، فلمیں، نادر کتب خانے، پکچر گیلریاں ایسی جن کا جواب نہیں۔۔۔[۴۶]

خود سجاد ظہیر بھی اپنی تعلیم کے لیے لندن کا ہی انتخاب کرتے ہیں۔ بر صغیر کے اور دیگر خطوں میں جہاں برطانیہ کا تسلط تھا۔ وہاں کے لوگوں کا لندن میں تعلیم حاصل کرنا اور وہاں جانا بھی ایک خواب ہوتا تھا۔ اور لندن دیکھنا بالا طبقہ کے لیے بھی ایک سعادت کی بات ہوتی تھی۔ کیوں کہ کہاں نو آبادیوں کی پستی اور کہاں لندن کا عروج۔

> لندن کی ایک رات کے تمام واقعات کا تعلق لندن شہر سے ہے۔ کچھ نوجوان ایک رات کی پارٹی میں شامل ہیں۔ اور موسم خراب ہونے کے باوجود اس ناولٹ کی کہانی کامیابی سے آگے بڑھتی ہیاس کیفیت (دھند، کہر، اندھیرے) کے باوجود لندن کی چہل پہل میں کوئی کمی نہیں آئی۔۔۔[47]

نو آباد کار (برطانیہ) کی پوری کوشش رہی، اور وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوا کہ دنیا بھر کے موسم خاص کر خراب موسم کا اثر لندن پر نہ پڑے یعنی دنیا کے برے اثرات سے برطانیہ کو دور رکھا جائے کیوں کہ ایک طرف لندن کی آمدن متاثر ہو گی تو دوسری طرف نو آبادیاں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ ''لندن کی ایک رات'' ناولٹ کے پہلے صفحے سے ہی ایک کشمکش کی کیفیت یا صورت حال پیدا ہو جاتی ہے روشنی اور اندھیرے کے درمیان۔ لندن کے موسمی تناظر میں ناولٹ کا ایک جملہ دیکھیں۔

> اندھیرے اور روشنی میں معلوم ہوتا ہے لڑائی ہو رہی ہے۔[48]

کبھی سورج کی کرنیں نکل آتی ہیں اور کبھی بادل ان کو دبا لیتے ہی۔ رات میں چاند، بادل، کہر، دھند، کی پوری کوشش کے باوجود کبھی کبھی کرنیں دیکھا رہا ہے۔ لندن کی اس موسمی کیفیت کو اس درد کے تناظر میں دیکھیں تو نو آبادیوں میں شعور ایک روپ پیدا ہو چکی ہے اور انہیں غلامی کا احساس ہو چکا ہے اور وہ کوشش بھی کر رہے ہیں کہ اس غلامی کے طوق سے نجات حاصل کی جائے۔ نو آباد کار پوری حکمت عملی اس کوشش کو دبانے کی سوچ رہا ہے مگر جنگ عظیم دوم کے پیدا کردہ حالات و واقعات اور دنیا کی بدلتی صورت حال میں وہ اب گرفت کی پوزیشن پہلے والی نہیں رہی۔ حالات اب بدل چکے ہیں۔ نو آبادی (بر صغیر) میں بھی احساس غلامی جاگ اٹھا ہے۔ اور وہ اب مزید غلامی کی زندگی نہیں بسر کرنا چاہتے۔

> کہرا چند منٹ کے لیے کم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے بجلی کی روشنیاں چمک اٹھی تھیں۔۔۔[49]

۲۰ صدی کی ابتدا سے ہی دنیا کی صورت حال تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھی اور پہلے جو ایک لاعلمی کا اندھیرا تھا اب ختم ہونا شروع ہو گیا تھا اور روشنی (امید) کی کرنیں نظر آنا شروع ہو گئیں تھیں۔ لیکن اس ابتدائی دور میں اندھیرا اکثر اوقات غالب آ جاتا ہے اور روشنی کی کمزور کرنوں کو دبانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر ناکامی کے باوجود کرنیں دب نہیں جاتیں بلکہ وہ مسلسل کوشش کر رہی ہیں اگر چہ ناکام ہی ہو رہی ہیں۔ آگے چل کر وہ کامیاب بھی ہوتی ہیں۔ یہ ایسا دور ہے جس میں دنیا بھر میں پھیلی نو آبادیوں کے فیصلے لندن میں ہوتے ہیں۔ باالفاظ دیگر ان کی تقدیر کے فیصلے یہاں (لندن) سے صادر ہوتے ہیں۔

لندن گویا شطرنج کی بساط ہے۔ جس پر دیسی میرے اپنی اپنی چال چل رہے ہیں۔[۵۰]

میرے خیال میں شطرنج کی بازی یا بساط کی حد تک تو بات ٹھیک ہے مگر دیسی مہرے چال چل نہیں رہے بلکہ وہ محض کٹھ پتلی کے طور پر سامنے ہیں۔ اور ان مہروں سے نو آباد کار نے ایسی حکمت عملی تیار کی ہے کہ ان چند مہروں سے کروڑوں لوگوں کو یرغمال بنایا جا سکے۔ اور یہ مہرے، راجے، نواب، جاگیر دار، گھوڑی پال اور دیگر عہدے دار ہیں۔ ان کے ذریعے نو آباد کار کو آسانی ہو گئی ہے کہ وہ نو آبادی کا اچھی طرح سے خون نچوڑ سکے اور یہ مہرے انہی کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور کام کرتے ہیں مگر روشنی کی مدھم، کمزور کرنیں ہی سہی وہ پھر بھی تاریکی کو چیلنج کر رہی ہیں اور بار بار سر اٹھانے کی کوشش میں ہیں۔ اور جلد یہ پو پھوٹنے کی کفیت مکمل روشنی میں بدل جائے گی۔

شیلا گرین اور عارف کے درمیان ہونے والی بات چیت میں بھی شیلا گرین کنائے میں بہت اہم بات کر جاتی ہے۔ ظاہری طور پر وہ موسم سے مخاطب ہے اور خاص کر انگریزی موسم سے۔ مگر درپردہ ایک اور کہانی ہے۔ جو اصل اہمیت کی حامل ہے۔

لیکن آپ لوگ (برصغیر کے) جو مشرقی دھوپ کے عادی ہیں۔ ضرور ہمارے تاریک انگریزی موسم کو گالیاں دیتے ہوں گے۔[۵۱]

واقعی یہ بات شیلا گرین کی درست ہے کہ آزاد مشرقی اقوام کے لیے تو انگریز قوم ایک تاریک موسم بن کر نازل ہوئی ہے۔ روشن اور اچھے خاصے ترقی کرتے معاشرہ اور اقوام کو تاریکی کی دلدل میں دھکیل دیا اور جس میں آج تک الجھے ہوئے ہیں۔ نو آباد کار روشنی کی منزلیں طے کر رہا ہے اور روشنی کے ماخذ چاند تک جا پہنچے مگر یہ (نو آبادی، برصغیر) آج بھی انہی تاریک راہوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں اور کوئی واضح راستہ انہیں دیکھائی نہیں دے رہا جس کو منتخب کر کے اپنی مرضی کے مطابق اس پر سفر کرتے ہوئے ترقی کی منزلیں کا راستہ دیکھ

پائیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ روشنی کی چمک بڑھ رہی ہے اور اب اندھیرے کو دھکیل کر زیادہ وقت کے لیے جگہ بنا رہی ہے۔ یہ غلامی اور آزادی کی کشمکش جاری ہے۔

یہ وہ عہد ہے جس میں غلام اقوام میں احساس غلامی پیدا ہوا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ غلام ہیں۔ قدرت کے عطا کردہ وسائل ان سے کوئی اور چھین کر استفادہ کر رہا ہے۔ مگر ابھی نو آبادی اس پوزیشن پر نہیں آتی کہ وہ مکمل طور پر روشنی پھیلا سکے بس کبھی ناکامی اور کبھی کامیابی کی صورت حال پیدا ہوئی ہے اور ابھی پلڑا ناکامی کی طرف زیادہ جھکا ہوا ہے، لیکن یہ کیفیت یا ڈراما زیادہ دیر نہیں چلنے والا۔ اور جلد یا بادیر سورج کے سامنے موجود ٹکڑا ختم ہو جائے گا۔

لیکن یہ بادل کا ٹکڑا سورج کی کرنوں اور روشنی کو کتنی دیر روک کے رکھ سکتا ہے سب جانتے ہیں کہ بادل اور سورج کا یہ کھیل عارضی ہوتا ہے اور کچھ ہی وقت میں یہ ختم ہو جانے والا ہے۔ مگر بادل یا اندھیرا اپنی پوری کوشش اور طاقت لگائے ہوئے ہے کہ جتنے وقت کے لیے ہی ممکن ہو، بلکہ زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے روشنی اور کرنوں کو روکے رکھے۔ مگر آگے چل کر ایک وقت بادل، اندھیرے کی شکست کا آنے والا ہے جب روشنی کا مکمل غالبا ہو جائے گا۔

ایک طرف چاند، سورج اور بجلی کی روشنی ہے جو بار بار چمکنے (جگہ بنانے) کی کوشش کر رہی ہے اور دنیا کو اپنی روشنی سے منور کرنا چاہتی ہے مگر دوسری طرف اسے روکنے والی چیزیں، دھند، کہرا، بادل ہیں مگر یہ کوئی مستقل چیزیں نہیں جو روشنی کو زیادہ وقت کے لیے روک سکیں۔ اسی روشنی کو اخبارات بھی اپنے طور طریقوں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

> اخبارات زمین سے پھوٹنے والی روشنی کی کرنوں کو دبانے کی پوری پوری کوشش کرتے رہے ہیں۔ اور اگر کوئی نکلنے لگتی ہے تو اسے مضر صحت قرار دیا جاتا ہے اور اسے غلط رنگ دے کر دفنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ یہ انگریز مزدور غالباً اتنے احمق نہیں جتنا انگلستان کے اخبار۔ ڈیلی میل وغیرہ۔۔۔[۵۲]

دنیا بھر کے مزدوروں کے مسائل ایک جیسے ہیں اور یہ نہیں کہ برطانیہ میں مزدوروں کا حال بہتر تھا وہاں بھی مزدوروں کا حال ابتر رہا ہے۔ جب کہ ان کے حقوق کی آواز کو اخبارات غلط رنگ دیتے رہے ہیں، کہ یہ ماسکو کا کیا دھرا ہے۔ یہ اشتراکیوں کے ایمان پر ایسا کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ مگر اخبارات نے کبھی مزدوروں کی آواز

کو احباب اقتدار تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ ٹام اور جم کی بحث بھی اپنی اخبارات کے پیش کردہ ایجنڈے پر ہے جس میں ٹام کہتا ہے۔

> تم (جم) کہتے ہو کہ تم نے یہ سب باتیں اخبارات میں پڑھی ہیں اس وجہ سے تم میری بات کا یقین کرنے سے انکار کرتے ہو۔ اچھا تم مجھے یہ بتاؤ کہ اخبار ہمارے اپنے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ سچ ہوتا ہے جب کبھی ہم مزدور اسٹرائک کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو یہ اخبار ہمیشہ قصور ہمارا ہی بتاتے ہیں۔۔[۵۳]

برصغیر میں بھی یہی صورت حال رہی ہے اخبارات نے ہمیشہ نو آبادکار کا موقف بیان کیا ہے اور عوام کے اور مزدوروں کے احتجاج کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ عام عوام کو ہمیشہ گناہ گار ٹھہراتے ہوئے ان کی مذمت کی ہے۔ پرنٹ میڈیا کے دور سے پراپیگنڈا نے جنم لیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے رنگ بدلتے گئے اخبارات نے ہمیشہ سے نو آباد کار کا اور ان کے اہم مہرے جاگیرداروں، وڈیروں کا ساتھ دیا ہے اور وڈیروں، جاگیرداروں کے خلاف اٹھنے والی عام عوام اور غریب عوام کو ہی ہمیشہ مورد الزام ٹھہرایا جاتا رہا ہے اخبارات غریب مزدوروں اور نو آبادی کا ساتھ کیوں دیں۔ ان بھوکے غریب، ایک وقت کے کھانے کو ترسے لوگوں سے ان کو کیا ملے گا کچھ بھی نہیں جب کہ اوپر والے طبقہ کی خوشامد کرنے اور ان کے من پسند بیانیے کا ورد کر کے تو انہیں اچھا خاصا مال مل جاتا ہے۔

> ٹائمز اخبار کے خیالات اس کے (عارف) کے دماغ میں اچھی طرح سے جم جائیں گے۔۔۔ اس اخبار (ٹائمز) کا نقطہ نظر انگلستان کے بڑے صاحبوں کا نقطہ نظر ہوتا ہے۔۔[۵۴]

عارف نے کیوں کہ نو آباد کار کا دست راست بننا ہے۔ اس لیے اُس کے لیے حکومت کے خیالات سے واقف رہنا انتہائی ضروری ہے۔ اس طرح وہ حکومتی اعتماد حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے گا اور ٹائمز اخبار جو کہ برطانیہ کا ایک اہم اخبار ہے۔ اور ہمیشہ حکومت کا ہی ترجمان رہا ہے۔ اس کے ذریعے سے عارف کو نو آباد کار کے ذہن تک رسائی آسانی سے ہو سکتی ہے۔

> عارف جو انگریز سامراج کا معاون بن کر ہندوستانیوں کا استحصال کرنا چاہتا ہے۔۔۔ اشتراکیت سے اسے نفرت ہے اور سیاسیات سے بھی کوئی دل چسپی نہیں ہے کیوں کہ عارف سول سروس کا مجنوں ہے۔۔۔[۵۵]

ظاہر ہے کہ امام کے پیچھے عارف وہی نماز پڑھے کا جو امام پڑھا رہا ہو گا۔ یہی معاملہ ہے عارف امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی ذہنی طور پر نو آباد کار کا غلام بن چکا ہے۔ عموماً تسلط کی صورت میں مقامی آبادی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک گروہ وہ ہوتا ہے جو نو آباد کار کی تقلید کرتا ہے اور دوسرا جو ان سے نجات کا راہ اختیار کرتا ہے۔ یہ دونوں گروہ آپس میں بھی ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔ برصغیر کی صورت حال کے تناظر میں ایک سوال سر اٹھاتا ہے کہ چند ہزار انگریز نے (نو آباد کار) کے لیے کروڑوں مقامی آبادی (نو آباد) کو کیسے حکمت عملی طریقہ سے زیر کیے رکھا۔ وہ کون سا طریقہ تھا جس کے اپنانے سے برصغیر کی نو آبادی ایک طویل عرصہ کے لیے سر نہیں اٹھا سکی۔ میرے خیال میں وہ طریقہ صرف اور صرف خوف، دہشت اور منافرت کا تھا۔ یہی وہ طریقہ تھا جس سے نو آبادی کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اٹھنے کی ہمت کر سکیں۔ انگریزوں نے کبھی بھی نرم دلی کا مظاہرہ نہیں کیا انہوں نے ہمیشہ گولی چلانے سے اجتناب نہیں کیا۔

''لندن کی کی ایک رات'' میں مختلف ایسے واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جن سے یہی بات واضح ہو جاتی ہے کہ خوف اور دہشت تسلط قائم رکھنے کے لیے بے حد ضروری تھا۔ اور اس منصوبہ بندی میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔ یہی راز تھا ان کے طویل کامیاب تسلط کا۔ نو آباد کار کے مخصوص طریقوں میں سے یہ الگ اور اہم طریقہ رہا۔ مختلف مواقعوں پر لوگوں کی بڑی تعداد جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

> دس انگریز سپاہیوں نے دس ہزار ہندوستانی نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا، ایک گورا زخمی ہوا۔ اور ۱۵، نیٹوز کی جان گئی۔۔۔[۵۶]

انگریز (نو آباکار) اگر مقامی (نو آبادی) لوگوں کے پندرہ بیش بندے نہ مارتا تو وہ کیسے کنٹرول کرتا۔ اگر وہ آج یہ اقدام نہ اٹھاتا تو کل دوبارہ احتجاج ہوتا اور پہلے سے بڑا ہوتا۔ مگر نو آبادی اور نو آبادی کے طرف دار لوگوں کے لیے یہ ظلم ہی سہی لیکن انگریز کے لیے تو یہ معمولی واقع تھا۔ اور اب دوبارہ اگر کوئی ایسا کرنے کا ارادہ کرے گا تو دس بار سوچے گا۔ اور اپنے سے پہلوؤں کا انجام اس کے سامنے ہو گا۔ کہ ان کے ساتھ کیا کیا گیا اور وہی عمل میرے ساتھ دوہرایا جائے گا۔

دوسری طرف اشتراکیت کی وجہ سے بھی انگریز کو خطرہ تھا اور اس وجہ سے وہ مزدوروں کے حقوق حاصل کرنے کے احتجاج کو بھی سختی سے کچل دیتے تھے۔ کیوں کہ یہ ایسا عہد ہے جس میں اشتراکیت کا ستارہ

عروج کی طرف جارہاہے۔ دوسری طرف نو آباد کار سے دنیا کے مختلف خطوں میں بننے والی نو آبادیاں چھٹکارا چاہتیں ہیں۔

> یہ وہ درد ہے جس میں اقتصادی بحران کا بھوت سروں پر منڈلانے لگا، اس بحران کی ابتداء امریکہ میں ہوئی تھی مگر دیکھتے ہی دیکھتے ہر ملک اس آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ نیویارک جیسے شہر میں لوگ فاقے سے مرنے لگے۔ روٹی روزگار مانگنے والوں کے نہتے جلوس پر گولیاں چلنے لگیں۔[۵۷]

برصغیر میں بھی ظاہر ہے ۱۹۳۰ء کے اس اقتصادی بحران کے اثرات نمایاں تھے بلکہ یہاں تو ساری نو آبادی کا حال مزدوروں سے بھی ابتر تھا۔ اشتراکیت کبھی اتنی مقبول نہ ہوتی اگر سرمایہ دارانہ نظام مزدوروں کے حال پر رحم کرتا اور ان کے حقوق اور ضرورتوں کا خیال رکھتا۔ مگر اس نظام نے صرف اپنے منافع کو بڑھانے پر توجہ دی اور مزدوروں کو صرف بطور پرزہ استعمال کیا۔

دنیا بھر میں نو آباد کاروں کے جتنے گروہ رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے مفاد (جو کہ صرف اقتصادی تھا) کو عزیز رکھا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی صورت حال بھی ویسی ہی ہے آج بھی وسائل کی لوٹ مار جاری ہے۔ برصغیر میں بھی انگریزوں نے صرف دولت سمیٹی اور برطانیہ منتقل کی ہر سال کئی لاکھ کروڑ پونڈ برطانیہ منتقل کیے گئے اور مقامی آبادی کا اقتصادی گراف کا رخ نو آباد کار (انگریز) کے ہوتے ہوئے ہمیشہ نیچے کی سمت رہا۔ مابعد بھی ہم نے اپنے خام مال کے استعمال کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے۔

> تم نے (اعظم) آج شام کا اخبار دیکھا ہے۔ ہندوستان میں پھر کہیں گولی چلی۔ اعظم نے کہا۔ نہیں میں نے اخبار تو نہیں دیکھا مگر اشتہار دیکھے ہیں۔ اب تو یہ روز کا دستور ہوتا جاتا ہے ہم کالے آدمیوں (مقامی نو آبادی) کی جان کیڑوں مکوڑوں کے برابر ہے۔۔۔[۵۸]

اعظم کو بخوبی احساس ہے کہ ہماری (نو آبادی) انگریز کے سامنے کیا قدر و قیمت ہے۔ انگریزوں کا صرف اور صرف ایک ہی منشاء اور مقصد رہا کہ وہ زیادہ زیادہ برصغیر کے جسم سے خون نکلیں اور اس خون کو بخوظت برطانیہ منتقل کریں۔ برصغیر کی آبادی سے ''چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے'' والے معاملے سے الٹ معاملا تھا، انگریز گولی چلانے سے بھی نہیں ڈرتے تھے اور دولت تو کسی صورت وہ نہیں چھوڑتے تھے یہ آگے چل کر وضاحت ہوگی کہ کس کس طریقہ سے نو آباد کار (انگریز) نے لوٹا۔

درست اور پورا نام سے مخاطب کرنا ہمیشہ عزت دینے کے لیے اہم ہوتا ہے۔ اور اس طرح مخاطب خوش ہو جاتا ہے کہ اسے پورے نام سے بلایا گیا ہے۔ جب کہ الٹا نام یا انتہائی مختصر نام بے تعلقی یا بے عزتی کے مترادف گردانا جاتا ہے، عموماً نفرت میں نام کو بگاڑ کر بولا جاتا ہے اور بگڑے ہوئے نام سے مخاطب کرنے کا مقصد صرف ایک ہی ہوتا ہے کہ مخاطب کرنے والے کی نظر میں آپ کی کوئی توقیر نہیں آپ اس کی نظر میں کم حیثیت ہیں خواہ آپ اپنے کو جو بھی سمجھتے رہیں۔

برصغیر کی نو آبادکاری کا بھی یہی معاملہ رہا ہے اور بحیثیت انسان بھی خود کو ثابت کرنا پڑا ہے کہ وہ انسان ہیں۔ اکثر بیشتر نو آبادی سے نو آبادکار کا برتاو انتہائی نفرت انگریز رہا ہے۔ برصغیر کی مقامی آباد کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ اور یہ نام کیوں استعمال کیے گئے کہ ان کو اپنی حیثیت کا اندازہ رہے کہ ان کی قدر و قیمت کیا ہے۔

> یہ کم بخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں ''نیٹوز'' ہم ''نیٹوز'' ہیں۔ اور یہ لال جیسے بندر۔۔۔[۵۹]

اخبارات رائے عامہ کو ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور جن اخبارات کا راؤ اور اعظم ذکر کر رہے ہیں۔ اور وہ خود بھی یہ بات تسلیم کر رہے ہیں کہ یہ برطانوی حکومت کے نمائندہ اخبار ہیں ان اخبارات کے موقف کو حکومتی موقف سمجھنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ نو آبادکار بھی انہیں یعنی مقامی آبادی کو انہی نفرت انگیز ناموں سے مخاطب اور یاد کرتے ہیں اور مقامی لوگوں کی جان کی کوئی قیمت نہیں۔ بے شک ایک مرے یا سو کسی انگریز کو اس بات کا کوئی اثر نہیں اور نہ ان کو اس سے کوئی فرق پڑنے والا ہے۔ گولی چلانے کے مواقع پر انگریز ذرا بھی دریغ نہیں کرتے کہ یہ انسان ہیں ان کی جان بچائی جائے۔ انگریز نو آبادکار کے غلبہ کی بنیادی اینٹ بھی خوف ہے۔ اسی طرح شیلا گرین کو یاد کروایا جانے والا سبق سنیں۔

> جب میں کالج میں داخل ہوئی تو میں نے ہندوستانی طالب علموں سے ملنے کی خاص طور پر کوشش کی گو کہ میرے والدین ہمیشہ نے مجھے تاکید کیا کرتے تھے کہ ''کالے لوگوں'' سے بچتی رہوں[۶۰]

یہ معاملہ صرف شیلا گرین کے ساتھ نہیں ہے بلکہ تمام گوروں کے ساتھ یہی معاملہ ہے کہ انہیں بتایا جاتا ہے، خاص طور پر بچپن سے ہی ان کے دماغ میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مقامی آبادی (نو آبادی) سے مناسب فیصلہ رکھیں مابعد نو آبادیاتی دور میں پاکستانی بیوروکریسی کو ان کا دیا ہوا سبق آج بھی یاد

ہے۔ انگریزوں کو اس بات کا بخوبی ادراق ہے کہ نو آبادی کو کتنے فیصلے پر رکھنا مناسب رہے گا اور ایک خاص حد سے آگے ان کے زیادہ قریب نہیں ہونا۔ یہ صورت حال صرف بر صغیر میں آنے والے گوروں کے لیے ہی نہیں بلکہ انگلستان میں بھی ایک بیانیہ منوانا ہوتا ہے حکومت نے تا کہ وہ اپنے لوگوں کو اس طرف قائل کر سکیں کہ آپ کی حکومت جو کچھ کر رہی ہے سمندر پار وہ بلکل ٹھیک اور درست اقدام ہے اور وہ لوگ (نو آبادی) اس قابل تھے کہ ان پر قبضہ کر لیا جائے۔ چور بھی پکارے چور چور" برطانوی حکومت بھی ہی کہتی ہے کہ اگر ہم نہ جاتے تو نو آبادی ختم ہو جاتی ہمارا وہاں ہونا ضروری ہے۔

> میں (ٹام) ہندوستانیوں کو "کالا لوگ"، ڈانگر"، نیٹو" کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ میں ہندوستانیوں کو جانوروں سے برتر سمجھتا تھا ہم لوگوں کو فوج میں سکھایا یہی جاتا تھا۔ میں نے خود کو دیکھا ہے کہ ہم ہندوستانیوں میں کس طرح صلح قائم رکھتے ہیں۔[۶۱]

جم کے دماغ میں ایک بات اپنے نو آباد کار کی طرف سے ٹھونس دی گئی ہے کہ مقامی لوگ رحم کے قابل ہی نہیں اور یہ کالے لوگ ہیں۔ اس بات کو نکالنے کے لیے ٹام کو اچھی خاصی تقریر کرنا پڑی تب جا کے اس کی سمجھ میں آیا کہ ہاں جو تصویر ہماری حکومت ہمیں دیکھاتی ہے وہ غلط رخ ہے اصل رخ سے ہمیں دور رکھا جاتا ہے اور اصل رخ سے نفرت سیکھائی جاتی ہے کہ یہ ہیں ہی غلط اور یہ غلط رویہ کے حقدار ہیں۔

> جب وہ (ٹام) ہندوستان میں تھا۔ تب 'برٹش امپائر' کا خیال کر کے اس کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا تھا۔۔ (ٹام) سمجھتا کہ آدمی صرف گورے ہیں جن کی اقدار علیٰ ہیں۔ باقی سارے کالے گو ان حقیر جانوروں سے مماثل ہیں۔ جن میں زہر بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح دیسی باشندے ان کے نزیک بے وقعت ہیں۔[۶۲]

نو آبادیوں میں اور خاص کر بر صغیر میں برطانیہ نے ایک خاص حکمت عملی سے حکومت کی ہے۔ اگرچہ کافی مدد اپنی فوج اور گوروں سے بھی لی ہے مگر زیادہ تر مقامی نو آبادی سے خاص مہروں سے فائدہ اٹھایا۔ اورانہی مہروں کو زیادہ تر استعمال کر کے اپنی راہ ہموار کی ہے۔ وہ مہرے مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی آبادی کی اکثریت پر مسلط ہیں۔ برطانیہ نے اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے فوج کو الگ طریقے سے ٹرینگ دی اور نو آبادیوں کو کنٹرول کرنے کے لیے فوج کو خاص قسم کی الگ طرح کی ٹرینگ دی، جس طرح ٹام نے ذکر کیا ہے کہ انہیں یہی بتایا جاتا کہ یہ لوگ اسی رویہ کے حقدار ہے جن طرح کا ہم (نو آباد کار) ان سے

رکھتے ہیں اور پیار محبت کی زبان یہ لوگ نہیں سمجھتے۔ ان کے ساتھ حشرات الارض اور جانوروں جیسا سلوک کرنا چاہیے۔

یہ سوال اہم ہے کہ یہ نو آبادی (برصغیر) نفرت اور حقارت کے سلوک کی کیوں حق دار ہے۔ ان کا حق یہ نہیں کہ انہیں زندگی کی سہولتیں حاصل ہوں۔ یہ بھی برابر ہوں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا جائے نو آباد کار (انگریز) کیوں یہ سمجھتا ہے کہ یہ اسی طرح کے رویہ کے حقدار ہیں۔ جس طرح کا میں ان سے رکھے ہوئے ہوں۔ اعظم اس بات کا جواب دیتا ہے۔ اصل میں تو نو آبادی کو کچھ حقوق تو حاصل ہوں کیوں نو آباد کار کھا بھی اسی کا رہا ہے اور مار بھی اسی کو رہا ہے۔

> اور یہ قصور ضرور ہمارا ہی ہو گا۔ ہم ہندوستانی اسی لائق ہیں۔ کمینے، ذیل بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔۔۔ گولی نہیں میرا بس چلے تو ساری قوم کو توپ کے منہ پر رکھ کر اڑادوں۔[۱۳]

اعظم اور احسان جس طبقہ کی مخالفت میں آگ بگولہ ہو رہے ہیں۔ یہ پہلا طبقہ ہے جو سمجھتا ہے کہ خوشامد سے ہم انگریزوں کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں اور ہم اس طرح بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔ بحیثیت قوم سارے ایک ہی قوم کی نمائندگی اور کام کر رہے ہیں۔ وہ ہے خوشامد۔ کسی کو آزادی یا نجات کا تصور بھی نہیں ہے اور اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد تو دور کی بات ہے۔ اس ایک طبقہ / قوم کو صرف ایک راستہ نظر آتا ہے وہ خوشامد کا ہے اور یہ طریقہ بھی کار آمد ثابت نہیں ہو رہا پھر بھی یہ طبقہ ذلیل ہے۔

ہاں ایک طبقہ خوشامد کر کے کسی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ وہ طبقہ جو شطرنج کی بساط پر محض نو آباد کار کا مہرا بن گیا ہے اور جسم اور خون کی بوتل کے درمیان پائپ کا کام کر رہا ہے۔ وہ پائپ نو آبادی کا خون نو آباد کار کے جسم میں منتقل کر رہا ہے۔ نو آبادی حالت نزع میں جا رہی ہے پائپ کا کردار صرف مسلمان مہراجے، راجے اور جاگیر دار، وڈیرے ہی نہیں بلکہ بہت حد تک ہندوؤں کے سردار بھی ادا کر رہے ہیں۔

"تقسیم کرو اور حکومت کرو" کا اصول جہاں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر لاگو کیا گیا وہیں ان دونوں کے اندر بھی کسی کو اکٹھا نہیں ہونے دیا یہ نہیں کہ مسلمان اکٹھے ہو جائیں۔ ان کو بھی تقسیم در تقسیم کیے رکھا۔ نواب ہے کوئی تو اس کے وزیروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ کوئی فوج کا سالار ہے تو اس کے سپاہیوں کو ساتھ ملا لیا۔ غرض نو آباد کار نے کسی گروپ یا قوم میں اتحاد قائم نہیں ہونے دیا۔ وہ خوشامدی ٹولا بھی ایسا نہیں کہ انگریز کے برابر بیٹھتا ہے نہیں بالکل نہیں وہ بھی ان کے جوتے سیدھے کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ اور جب

ان کے سامنے آتے ہیں تو انہیں ''سرکار سلام''، ''خداوند'' اور باپ کہتے پھرتے ہیں۔ میر صادق اور میر جعفر اسی خوشامدی ٹولا کے نمائندہ ہیں مگر جب ہم ان کی بعد کی زندگی دیکھتے ہیں تو وہ بھی ساری زندگی استعمال ہی ہوتے رہے ہیں اور وہی منتقلی خون کے اس پائپ والا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ موجودہ عہد میں وہی خوشامدی ٹولہ عام مزدوروں اور کسانوں سے جڑا ہوا ہے۔

> لندن کی ایک رات کوئی قصہ رنگین نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے نوجوانوں کی نشت کا ہمہ گیر تذکرہ ہے۔ یہ خواتین و حضرات رنگ، نسل، زبان، مذہب، مسلک، اور خطہ زمین کے اعتبار سے مختلف کردار ہیں۔ ان کا تعلق ایک ہی طبقہ سے نہیں۔۔۔''[۱۴]

نعیم کے ہاں ہونے والی پارٹی میں بھی ایک طبقہ انگریز کی خوشامد پر یقین رکھتا ہے جب کہ راؤ، اعظم اور احسان سمیت مختلف کرداران کی مخالفت اور اپنے حقوق بشمول آزادی کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور انہیں نو آباد کار کی خوشامد یا ان کے کام کرنے یا ان کے کام سے قطعاً کوئی دل چسپی نہیں بلکہ وہ اشتراکیت کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ اور انہیں انگریزوں کا تسلط کسی صورت قابل قبول نہیں۔

اگرچہ برصغیر میں مسلمان بھی بحیثیت نو آباد کار وارد ہوئے تھے خواہ طریقہ کار، نوعیت اور مقاصد مختلف ہی تھے مگر مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات خاصے بہتر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تعلق نو آباد کار اور نو آبادی کا نہیں تھا لیکن پھر بھی ان دونوں قوموں میں بہت حد تک اتفاق قائم تھا۔ لیکن ۷اویں صدی میں آنے والے والے آباد کار انگریز نے ان میں نفرت کا ایسا بیج بویا کہ بعد میں یہ کبھی اکٹھے نہیں ہو سکے، دیگر اقلیتوں کا حال بھی ان سے زیادہ مختلف نہیں رہا۔ غرض سکھوں۔ ہندوؤں، مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر برصغیر کا سارا مال برطانیہ منتقل کر دیا۔

برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ریل کی پٹریاں بچھائیں کیا یہ سارا کام گوروں نے اپنے مخصوص مقصد کے تحت نہیں کیا سفر کے لیے کیا کسی حد تک ریل بطور سواری استعمال ہوتی رہی ہے مگر زیادہ تر خام مال برصغیر سے برطانیہ منتقل کرنے کے لیے ریل کے ذریعے ہی اکٹھا کیا جاتا رہا اور فصلیں اچھی ہونے کے باوجود یہاں کی مقامی آبادی بھوک سے مرتی رہی۔ انگریز نے برصغیر کو خام مال پیدا کرنے والے ملک بنائے رکھا۔ جب کہ فیکٹریاں اور ملز برطانیہ میں قائم کیں۔ مقامی انڈسٹری کو آہستہ آہستہ مکمل طور پر تباہ کر دیا اور اپنے ملک کے لیے ایک منڈی کی صورت میں رہنے دیا۔ مابعد نو آبادیات میں ہم آج بھی خام مال باہر بھیج کر ان کے تیار مال کی مارکیٹ کا درجہ ہمارے خطہ کو حاصل ہے۔

برطانوی نوآبادکار دوہری چال چل رہا ہے۔ ایک طرف اسے نوآبادیوں پر تسلط بھی قائم رکھنا تھا۔ دوسری طرف اپنی عوام کو بھی قائل کرنا ہے کہ آپ کی حکومت جو باہر کے خطوں پر قبضہ کیے ہوئے ہے یہ درست اقدام ہے کیوں کے ہر پانچ سال بعد انہیں اپنی عوام سے ووٹ لینے جانا ہوتا ہے۔ اپنی عوام میں رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کے لیے وہ اخبارات کا سہارا لیتے ہیں اور مختلف پروپیگنڈے تراشتے رہے کہ اس وجہ سے ہم نے قبضہ کیا ہے ورنہ صورت حال کی مناسبت سے اگر ہم یہ نہ قدم اٹھاتے تو خانہ جنگی ہو جاتی۔ یہ ظاہری منطق گھڑ کے اپنی عوام کے سامنے رکھی جاتی ہے۔

> میں (جم) یہ کہتا ہوں کہ اب اس بات کا وقت آ گیا کہ ہم ہندوستان سے اپنا بوریا بستر سنبھال کر گھر واپس آئیں اور ہندوستانیوں کو ان کا ملک حوالے کر دیں۔ وہ جو چاہیں اپنے ملک کو لے کر کریں۔ اور بہر صورت میں تو یہ کبھی موازنہ نہیں کر سکتا کہ ہمارے انگلستان پر جرمنی یا فرانسیسی یا کوئی قوم آکر حکومت کرے تو پھر ہندوستان میں رہنے کا ہم کو کیا حق ہے۔[۶۵]

کوئی ملک بھی کسی دوسرے ملک کا قبضہ قبول نہیں کرتا، خواہ وہ دنیا میں ترقی کے لحاظ سے کتنا پیچھے کیوں نہ ہوں۔ آزادی ہر قوم، ملک کا حق ہے۔ اس حق کو صلب نہیں کیا جا سکتا۔ مگر دنیا میں اکثر جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس میں اکثر و بیشتر طاقت ور ملک نے غریب اور پسماندہ اقوام اور ملکوں پر تسلط قائم کیا ہے اور نہ صرف تسلط قائم کیا ہے بلکہ انہیں اچھی طرح سے لوٹا ہے اور انہیں صرف خام مال کی منڈی بنائے رکھا ہے۔ انہی منڈیوں کے لیے آج بھی مختلف ملک باہم دست و گریبان ہیں۔

طاقت ور ملکوں کو بھی پسماندہ ملکوں پر قبضہ کرنے کے لیے راہ ہموار کرنا پڑتی ہے اور دنیا کو اس بات کا قائل کرنا پڑتا ہے کہ جو میں (نوآبادکار) کر رہا ہوں وہ بالکل درست اور جائز ہے، میں (نوآبادکار) خود کو اس بات کا حق دار اور ذمہ دار سمجھتا ہوں کہ میں ان خطوں (نوآبادیوں) پر قبضہ کر لوں اور اگر ہم ان پر قبضہ نہ کر لیں تو حالات بگڑ جائیں۔ اس ساری صورت حال کو اپنے حق میں قائل اور ہمدردی کے لیے نوآبادکار (انگریز) نے ایک مخصوص بیانیہ جاری کیا اور اس بیانیہ پر دنیا کو قائل کیا کہ ہم جو کچھ کرنے جا رہے ہیں وہ مکمل طور پر درست اقدام ہے۔ اور دوسری طرف نوآبادی اس بات کی حقدار ہے کہ ان پر قبضہ کر لیا جائے اور اس طرح ان کی ترقی اور حالات اچھے ہو جائیں گے۔ آج دنیا بھر میں اور برصغیر کے لوگوں پر بھی اُسی تصویر کا دوسرا رخ عیاں ہو چکا ہے کہ برطانیہ نے برصغیر کو نوآبادی کیوں بنایا اور امن و امان کتنا قائم کیا اور ترقی کتنی ہوتی اس دور

میں محض لوٹ کھسوٹ اور نفرت کے بیج بونے کے اور کوئی کام نو آبادی کے لیے انگریز نے نہیں کیا۔ برصغیر جیسے امیر خطے کو تنزلی کی پستیوں میں دھکیل کر مال جمع کیا اور برطانیہ منتقل کیا انگریز کا یہ مشن انتہائی کامیاب رہا۔ اور نو آبادی میں نفرت پہلے سے بھی بڑھی۔

> یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں مگر سویز کے اس پار تو ہم سب 'کالا لوگ'، 'نیٹوز' غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔[66]

انگلستان میں بھی حکومت نے لوگوں کو اس بات کی طرف قائل کر لیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ہدایت کریں کہ وہ ان "کالے لوگوں" سے دور رہیں اور یہ بات ان کے کانوں میں بچپن سے ڈالیں۔ اس بات کا ثبوت جین کی بات دے رہی ہے کہ مجھے بچپن سے والدین نے یہ نصیحت ہی ہے کہ یہ "کالے لوگ" ٹھیک نہیں ہوتے بلکہ انسان بھی نہیں ہوتے۔ ہمارے معیار اور ان "کالوں" کے معیار میں بہت فرق ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا کیا تعلق، یہ تعلق تو برابری کی سطح پر ہوتا ہے۔

> جب میں کالج میں داخل ہوئی تو میں نے ہندوستانی طالب علموں سے ملنے کی خاص طور پر کوشش کی۔ گو کہ میرے والدین ہمیشہ مجھ سے تاکید کیا کرتے تھے کہ 'کالے لوگوں' سے بچتی رہو۔[67]

یہ تو ممکن نہیں کہ جن لوگوں کو روکا گیا ہے وہ سب اس بات کو یا نصیحت کے خلاف رائے قائم کریں اور جین کی طرح اس کا الٹ اثر لیں۔ اکثریت جن کو یہ نصیحت کی جاتی ہو گی وہ اس پر مکمل طور پر عمل کرتے ہوں گے کہ والدین درست بات کہہ رہے ہیں اور واقعی "یہ کالے لوگ" بُرے لوگ ہوتے ہیں اصل انسان اور شریف تو گورے ہوتے ہیں۔ دنیا میں باقی تو ذلیل مخلوق ہیں۔ اور نفرت ان کا مقدر ہے۔

اس پوری کوشش کے باوجود انگلستان میں ایک طبقہ ہے جو اپنے ملک کی استعمارانہ حکمت عملی سے آگاہ ہے۔

> بیشتر انگریز مزدور انگلستان کی استعمار پسندانہ حکمت عملی سے باخبر ہیں کہ کس طرح ایک طاقت ہندوستانیوں پر جور و استبداد سے کام لے رہی ہے اور کس طرح اہل انگلستان کو برباد کرایا جاتا ہے کہ ان کا یہ عمل امن پسندوں کے حق میں کیوں کرنا گزیز ہے۔[68]

ٹھیک ہے اشتراکیت کے حوالے سے دنیا بھر کے مزدوروں کا دکھ، درد، غمی، خوشی ایک ہے اور یہ طبقہ بھی دنیا بھر کے مزدوروں کا ایک حصہ ہے اور دنیا میں کہیں بھی مزدور کی آواز سنائی دیتی ہے تو انگلستان کا مزدور بھی اس میں شامل لیے ہوتا ہے اور انگلستان کا مزدور طبقہ دنیا کے دیگر خطوں کے مزدوروں کے حالات سے باخبر ہے اور زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اور ان کے ساتھ حقوق کی جنگ میں برابر کا شامل ہوتا ہے۔

یہ طبقہ مختصر ہے برطانوی حکومت نے اخبارات کا سہارا لے کر اور دنیا میں کانفرنس کر کے ایک بڑے طبقہ کو ہم خیال بنا لیا ہے کہ حکومت کا کالونیاں بنانے کا عمل درست ہے اور اس بیانیہ کو دنیا میں برطانوی حکومت مقبول کرانے میں کامیاب رہی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی عہد میں کسی ملک کے خلاف جنگ کے راستہ کو ہموار کرنے کے لیا بھی اسی طرح کے ڈراما ہوتے رہتے ہیں۔

برصغیر میں وزیر، مشیر، سیکرٹری، مسلم لیگ اور کانگریس کے دیگر نمائندے بھی یہی راگ آلاپتے رہے ہیں کہ ہم تو اپنی عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔ سجاد ظہیر خود تخلیق کی بجائے میدان میں اتر کر عملی طور پر اشتراکیت کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں اور نو آبادی میں آزادی کا شعور جگاتے ہیں اور مزدوروں کو اپنے حقوق کا درس دیتے ہیں۔ وہ انہیں عملی جدوجہد کا درس دیتے ہیں۔ جیسا کہ عملی طور پر انقلاب روس کی مثال دی جا چکی ہے اور یہی مثال وہ غریب عوام اور مزدوروں کے سامنے رکھتے ہیں۔ کہ دیکھو عملی جدوجہد کا نتیجہ کہ پامال ہوتا ہوا طبقہ بادشاہ بن گیا ہے اور آج برابر کا حصہ دار ہے۔ ایک چیز جو اس دور میں شروع ہوئی آج بھی وہی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ پرنٹ میڈیا کا جو کردار پراپیگنڈا کے حوالے سے انگریزوں کے دور میں تھا یا جو کردار انہیں سونپا گیا تھا۔ اس کو آج بھی اخبارات نبھا رہے ہیں۔

اگر ہم مابعد نو آبادیاتی تناظر میں کہیں کہ آج ہم آزاد ہو گئے ہیں تو یہ بات مکمل سچ نہیں لگتی کیوں آج بھی ہم اسی مابعد نو آبادیاتی ذہنیت میں الجھے ہوئے ہیں اور نہ ہماری کوشش ہے کہ ہم اس سوچ یا رستے سے الگ ایک اپنا راستہ بنائیں۔ آج بھی اخبارات پیسے والے کا ساتھ دیتے ہیں۔ حکومتی اشتہارات کے لیے ہمیشہ حکومت کو سچا کہتے ہیں، عوام جو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرے تو ان پر غداری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ آج بھی بڑے بڑے اخبارات کا موقف حکومتی موقف ہی سمجھا جاتا ہے۔ عارف ''ٹائمز'' کی پیروری کر کے نو آباد کار کی سوچ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور آج بھی مختلف اخبارات جو وسیع سطح پر شائع ہونے والوں میں شامل ہیں۔ وہ حکومتی ترجمان ہی نظر آتے ہیں آج بھی بین الاقوامی سطح پر کسی مسئلے پر رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے

بڑے بڑے اخبارات کو ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور وہ اخبارات یہ ڈراما بخوبی ادا کرتے ہیں اور حکومت کو ہمیشہ درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی دنیا میں جنگوں اور فسادات کے حوالے سے دیکھا جائے تو اکثر جگہوں پر مسلمان یا کوئی عام اقوام جنگ کا ایندھن بنتی نظر آتی ہیں۔ گوری چمڑی والے آپ کو محفوظ ہی نظر آئیں گے۔ دنیا میں کہیں ایک گورا قتل ہو جائے تو ساری دنیا کے مسلمانوں کی جان پھر بھی گورے کی جان سے سستی ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں بھی سجاد ظہیر "لندن کی ایک رات" میں اس بات کی وضاحت پیش کرتے ہیں کہ گوروں اور کالوں کی جان کی نسبت کیا ہے۔ آج پاکستان میں برطانوی، امریکی گوروں کے ساتھ کوئی مسئلہ بن جائے تو ہماری حکومت بے بس ہو جاتی ہے اور خواہ گورا غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن ہماری حکومت اپنوں کو ہی غلط کہے گی اور کسی گورے کے لیے کوئی سزا نہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا اکٹھ برصغیر میں کئی سو سال پہلے ہوا تھا، اگرچہ مسلمانوں کی حیثیت بھی نو آبادکار کی تھی اور رہی ہے مگر مسلمان نو آبادکاروں نے اپنی حکومت یا تسلط کی بنیاد نو آبادی میں تفریق اور ایک دوسرے سے نفرت پر نہیں رکھی تھی۔

مسلمانوں کی بادشاہت میں کافی تعداد میں ہندوں اور سکھوں کو سرکاری عہدے دیے گئے تھے۔ نفرت کسی مذہب کے ماننے والے کو دوسرے سے نہیں تھی۔ اگرچہ ایک عرصہ تک ان کا آپس میں جھگڑا رہا اور عہدوں کے حصول کے لیے جنگیں بھی ہوتی رہیں مگر طریقہ کار مسلمانوں کا حکومت کرنے کا بالکل مختلف تھا۔ انگریز نو آبادکار (برطانیہ) نے پراپیگنڈا کا خوب سہارا لیا۔ مابعد نو آبادیات میں حالات اسی طرح کے ہی نظر آتے ہیں۔ میڈیا کے زور پر کسی بھی ملک پر الزام دھر دیا جاتا ہے اور وہاں انتشار کو ہوا دے کر اپنے مقاصد کے لیے ماحول سازگار بنایا جاتا ہے۔

> اخباروں میں ہمیشہ لکھا رہتا ہے کہ ہماری حکومت ہندوستان میں نہ رہے تو اس ملک میں بدامنی اور فساد پھیل جائے گا۔[۷۹]

ٹھیک ہے برطانوی موقف کو ایک حد تک درست مان لیتے ہیں کہ انہوں نے یہاں امن قائم کیا لیکن ان کے تسلط سے پہلے بھی تو مسلمان اور ہندو اکھٹے رہ رہے تھے۔ جب کمپنی کی حکومت میں فسادات کے چند واقعات ہوئے ان میں بھی گوروں کا کردار پس پردہ اچھا خاصا تھا کیوں کہ یہ وہ دور ہے جس میں گورے برصغیر پر تو قبضہ کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ اور ساتھ انگلستان میں اپنی عوام کو بھی قائل کر رہے تھے کہ برصغیر

میں امن کے لیے ہماری حکومت یعنی تسلط ضروری ہے۔ خود لڑانے، فیصلہ کرنے اور سزا جزا دینے والے۔ طریقہ یہ رہا کہ جھوٹ کو اتنی بار بولو اور اس شد ومد سے بولو کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگے یہی طریقہ برطانوی حکومت نے اپنایا۔ برصغیر (نو آبادی) میں مذہبی منافرت پھیلانے میں برطانیہ نے اہم کردار ادا کیا اور اس منافرت کے اثرات آج تک چلے آرہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے اندر مسلکی منافرت کو بھی نو آباد کار نے خوب ہوا دی تا کہ کوئی گروہ اکٹھا نہ ہوا یہ حکمت عملی نو آباد کار کی بہت کامیاب رہی اور یہ بیج پہلے تو ننا پودا تھا مگر بعد میں بڑا درخت بن گیا اور اس کے بیج اور پتے پوری نو آبادی میں دنیا میں پھیل گئے جن کو آج بھی ختم کرنا بہت مشکل ہے۔ یہی مناظر مابعد ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مذہب کے نام پے ہم منتشر ہیں۔

مذہبی نفرت کے بیانیہ سے نو آباد کار کو دو فائدے حاصل ہوئے ایک تو اپنے ملک (انگلستان) کی عوام کو ہم خیال بنایا کہ ہمارا اقدام تسلط درست ہے۔ اور نو آبادی پر یہ احسان ہے اور اخبارات میں اس بیانیے کی تشہیر کی اس طرح وہ اپنی عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ دوسری طرف برصغیر میں شعیہ، سنی، مسلمان، ہندو، سکھ کوئی بھی کسی کا ہمدرد نہ رہا بلکہ سب ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے اور یہی صورت حال آج مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کیوں کہ آج تک برصغیر اپنی نو آبادیاتی اثرات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پایا۔ ہم آج بھی انہی معاملات میں الجھے ہوئے ہیں جو نو آبادیاتی عہد میں درپیش تھے۔ پاکستان خاص کر ذہنی لحاظ سے بالکل آزاد نہیں ہوا۔ آج بھی پاکستان میں ہر کام کے لیے آپ کو برطانیہ کی مثال دی جاتی ہے۔ تعلیمی پالیسی سمیت تمام پالیسیاں انہی کی تقلید میں بنائی جاتی ہیں اور وہی ہمارے لیے ماڈل ہیں اور ہمارے حکمران ان کی مثالیں دیتے بھولے نہیں سمائے۔

تم (جم) کہتے ہو کہ ہندوستان میں ہماری وجہ سے اس ٹائم ہے۔۔۔ "

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی اور اب واضح ہو چکی ہے کہ برطانیہ کا برصغیر کو نو آبادی بنانے کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ معاشی تھا آج برطانیہ مہذب دنیا کا سردار ہے۔ برصغیر سمیت تمام نو آبادیوں کو خوب لوٹا اور نو آبادیوں میں بھوک، ننگ، نفرت، دشمنی کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا۔ برطانیہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا چاند تک پہنچ گیا اور نو آبادی (برصغیر) پستی کی آخری حد تک پہنچ گئی عوام کی اکثریت غریب سے غریب تر ہوتی گئی۔

مابعد نو آبادیاتی تناظر میں جب ہم دیکھتے ہیں تو نو آباد کاروں کا طریقہ واردات بدلہ ہوا نظر آتا ہے مگر ان نئے طریقوں سے وہ معاشی مقصد بخوبی حاصل کر رہے ہیں۔ برطانوی گورے پاکستان کے مختلف اداروں

اور شعبوں میں اہم عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ تعلیم پالیسیاں وہی ترتیب دے رہے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں یہاں صرف کلرک پیدا ہو رہے ہیں۔ ہمارے حکمران ملک کے بڑے جاگیر دار ہیں (وہی نو آبادیاتی عہد کے مہرے) جن کو انگریزوں نے زمینیں عطا کی تھیں۔ آج بھی ان کا مائی باپ برطانیہ ہی ہے۔ اور برطانوی آشیر باد کے بغیر وہ چل نہیں سکتے عام عوام، مزدور اور ملک کی صنعتوں اور زرعی شعبوں کی حالت پہلے سے خراب ہے۔ اور پاکستان آج بھی کپاس سمیت تمام خام مال برطانیہ کو سستے داموں فروخت کرتا ہے اور استعمال کرنے کے حوالے سے آج بھی انہی کی منڈی ہے اور جیسا کہ ہر دور میں ہم نے طاقت ور کو آقا رکھا ہے آج امریکہ کو ہم نے خدا تسلیم کر لیا ہے۔ اگرچہ برطانیہ اور امریکہ کے مفادات ایک ہی ہیں۔

''لندن کی ایک رات'' میں چند اہم تاریخی واقعات کا احوال قدرے مختصر اور دبے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ سجاد ظہیر نے ان واقعات کا منظر ایسے کھنچا ہے کہ پوری تصویر ابھر کر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور قاری ان واقعات کا چشم دید بن جاتا ہے اور وہ ظلم و تشدد کو دیکھ سکتا ہے محسوس کر سکتا ہے۔

> تکلیف جن سے کوئی گزند پہنچے، تکلیف جو آرام کی ہراول ہو۔۔۔ وہ اکیلا میدان میں کھڑا ہوا ہے سارا مجمع غائب ہو گیا۔ سامنے گورے کھڑے ہیں اور چاروں طرف ادھر ادھر خون کے دھبے گرم تازہ خون اور زخمی انسان اور مردے۔ کوئی منہ کے بل گرا پڑا ہے اور اس کے ہاتھ پیٹ کے نیچے دبے ہوتے ہیں کوئی مت پڑا ہے۔۔۔[1]

ایک ہی واقع لکھتے ہوئے اسی کے ساتھ شراب کا ذکر کچھ عجیب لگتا ہے کہ جو منظر بیان ہوا ہے اور شراب کا ساتھ ذکر مگر یہ ایک ارادی کوشش لگتی ہے ۔ سجاد ظہیر جانتے تھے کہ نو آباد کار بڑا چالاک ہے وہ یہ واقع پڑھ کر لازمی چپ نہیں بیٹھے گا۔ بس شراب کے نشہ میں ایک بندے نے چند فضول باتیں کر دیں۔ اس کا کیا وہ تو شراب کے نشہ میں مدہوش ہے۔ اس بات کے پس منظر میں انگارے کا حشر تھا کہ اسی ذیل میں یہ ناولٹ بھی نہ آ جائے۔

درج بالا پیرا گراف میں جلیانوالہ باغ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو نو آباد کار نے اپنا خوف اور دہشت برقرار رکھنے کے لیے پرامن احتجاجی مظاہرہ کرنے والوں اور اکثریت بیساکھی کا میلا دیکھنے کے لیے امرتسر میں آنے والے لوگوں پر جنرل ڈائر نے گولی چلوا دی، جس میں ۳۸۰ کے لگ بھگ بے گناہ لوگ مارے گئے۔ اس واقع سے کچھ دن پہلے امرتسر میں ایک ہنگامے کے دوران چند گورے مارے گئے تھے۔ اور ایک عورت پر بھی حملہ ہوا تھا پانچ کی نسبت سے ۱۵،۲۰ ''کالے لوگ'' قتل ہوئے تو یہ تناسب ٹھیک

ہے۔ کیوں کہ نو آباد کار اور گوری چمڑی اس کے مقابلے میں کالے لوگ تو کیڑے مکوڑے ہوئے۔ برطانیہ میں جہاں جنرل ڈائر کے حکم کی مذمت ہوئی اور انہیں معزدل کر دیا گیا وہاں ان کی حمایت کرنے والے بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نو آباد کار کے مقامی مہروں کے لیے یہ اچھی خبر تھی۔

برطانیہ نے کبھی نو آبادی (برصغیر کی آبادی) سے نرم رویہ روا نہیں رکھا وہ جانتے تھے کہ اگر ان کو منہ لگایا تو قابو کرنا ناممکن ہو جائے گا اور خاص کر جہاں گوروں کو ۱۸۵۷ء میں پناہ دینے والوں اور ان کی مدد کرنے والوں کو انعام و کرام سے نوازا گیا وہیں گوروں کو قتل کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دی گئیں۔ تا کہ آئندہ کوئی ایسا قدم اٹھانے سے پہلے دس بار اپنے انجام کو سوچے گا اور اپنے سے پہلے لوگوں کا انجام اس کے لیے ایک سبق ہو۔ اکثر احتجاج کرنے والے کون لوگ ہوتے تھے۔

> احتجاجی ناانصافیوں کے خلاف لڑائی لڑنے کے لیے اور ہندوستان کو برطانوی سامراج سے آزاد کرانا ہی نہیں بلکہ ایک منصفانہ سماج قائم کرنے کے لیے انقلاب ہی کو واحد راستہ سمجھتے تھے۔۔۔[۲۷]

نو آبادی میں نو آباد کار کے خلاف عملی جدوجہد کرنے والوں کا شائد یہ ایک رخ ہے کہ وہ ایک مساوی اصولوں پر قائم سماج دوسرے الفاظ میں اشتراکی آزادی چاہتے تھے۔ سجاد ظہیر نے اس طرح کے ہنگامہ خیز واقعات کو اپنی تحریر ''یادیں'' میں بھی قلمبند کیا ہے اور وہ اس طرح کے واقعات سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اور خاص کر جہاں مزدوروں اور کمیونسٹوں کو شکست ہوئی ہے۔ جرمنی، فرانس، روس کے مختلف واقعات کا تذکرہ (یادیں) میں ملتا ہے۔ ''لندن کی ایک رات' میں جلیانوانہ باغ کا جہاں ذکر ہوا ہے۔ اور وہیں ایک اور واقع بھی سرسری طور پر منظر عام پر آتا ہے۔ نو آباد کار کے چھوٹے پر اپیگنڈا کا ایک واقع اور سینے۔ فرضی ڈراما بنا کر لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کی جاتی ہے۔ طاقت کے زور پر تاریخ کی حقیقت کو چھپا کر فرضی اور جھوٹے قصے گھڑے جاتے ہیں۔

> سراج الدولہ اور بلیک ہول کے ہول ناک قصے پڑھ پڑھ کر اور ہندوستانیوں اور کالے آدمیوں کی برائیاں سن سن کر میرے (شیلا گرین) دل میں ہر سیاہ فام انسان کی طرف سے کچھ خوف سا بیٹھ گیا۔۔۔[۲۸]

برطانوی حکومت ایک وقت میں اپنے ملک میں دو ڈرامے کر رہی تھی اور وہ دونوں ڈرامے انتہائی کامیاب رہے کیوں کہ انہیں اپنے وقت کے بڑے اخبارات '' ڈیلی ٹائمز'' کی پوری مدد حاصل تھی اور برطانوی

عوام تو مختلف حوالوں سے خبریں سن کر کالے لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرتے تھے، خود آکر جم کے علاوہ کسی نے نہیں دیکھا اور ٹام بھی احساس رکھتا ہے کہ جو تصویر کا رخ ہمیں دیکھایا جاتا ہے وہ اصل نہیں ہوتا۔

ایک طرف برطانوی حکومت پانچ سال بعد الیکشن سے منتخب ہوتی تھی اور دوسرا انہوں نے لازمی ووٹ لینے کے لیے عوام کے پاس جاتا ہوتا ہے اور اس لیے اپنی عوام کو مطمئن رکھنا بھی بہت ضروری تھا۔ ایک طرف حکومت وقت اپنی عوام کو یہ احساس دلاتی رہی کہ امن و امان کے لیے برصغیر پر ہمارا قبضہ بہت ضروری ہے۔ یہ تسلط کے حق دار ہیں کہ ان کی آزادی سلب کرلی جائے اور انہیں محکوم بنا کر رکھا جائے اگر ہم (برطانیہ) وہاں سے واپس آجاتے ہیں تو وہاں ہندو اور مسلمان آپس میں لڑ لڑ کر مر جائیں گے۔ یہ ہم (برطانیہ) ہی میں جن کی وجہ سے وہ نہیں لڑتے اور ہم نے وہاں بھائی چارے کا ماحول پیدا کیا ہوا ہے۔

دوسری طرف برطانوی حکومت بڑے دہشت ناک قسم کے واقعات اپنی عوام کو سناتی رہتی ہے کہ یہ نو آبادی (برصغیر) کے لوگ بڑے خطرناک ہیں وہ ہمیں زندہ نہیں رہنے دیتے مثلاً سراج الدولہ کا واقع کہ انہوں نے ایک بھٹی میں عیسائیوں کو جلا دیا تھا۔ صرف زبانی حد تک نہیں بلکہ شیلا کا بیان آپ سن چکے ہیں۔ اس طرح کے واقعات پر کتابیں لکھ کر ان کی خوب تشہیر کی جاتی ہے۔ لازمی کوئی واقعہ سجاد ظہیر کی نظر سے گزرا ہو گا اور اس طرح کے واقعات کو خوب ہوا دی جاتی ہے۔ برطانوی پارٹیاں ان باتوں پر عوام سے ووٹ لیتی ہیں اور مختلف بہانوں اور قصے کہانیوں سے عوام میں مقبول ہوتی ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے اصل مقصد میں کامیاب رہتی ہے۔ جب کہ اصل میں وہ ہندوں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر ان کو آپس میں الجھا کر کامیاب طریقے سے برصغیر کو لوٹ رہی ہے۔ گڑبڑ کو ہوا دینا کبھی زبان کے نام پر کبھی مذہب کے نام پر یہ اپنے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے راہ ہموار کرنا ہے دوسرا یہ لوگ ہمیں تو کچھ نہیں نہ کہتے۔ ہندوستان میں جاسوسی، دوغلا پن، منافقت، نسلی فسادات کی روایت میں برطانیہ کا بہت بڑا کردار ہے۔ مابعد یہ چیزیں اب پہلے سے بھی زیادہ شدت سے موجود ہیں۔

> ہندوستان میں گڑبڑ اور اس پر گفتگو۔۔۔ اپنے زمانے کے حالات اور واقعات پر تبصرہ کو سجاد ظہیر نے یہاں اس انداز سے لکھا ہے کہ وہ ہمیں آج بھی اپنی اور اپنے دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔۔۔[۴]

برصغیر کے انگریزی نو آبادیاتی دور کا جائزہ لیتے ہوئے جو تصویر سامنے آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ کے ماتحت ہونے تک اور تاج برطانیہ سے ۱۹۴۷ تک ہمیشہ گڑبڑ کسی نہ کسی صورت میں چلتی رہی ہے اور یہ گڑبڑ پیدا کرنے میں نو آبادکار پوری طرح شامل رہا ہے بلکہ اصل آگ لگانے والا بھی نو آبادکار ہی تھا۔ کیوں کہ فائدہ اس سے صرف نو آبادکار کا تھا برصغیر کے دو بڑے گروپ یا قومیں آپس میں الجھی رہیں اور وہ مال متاع اکٹھا کرتا رہے۔ ہندوؤں، مسلمانوں کو اپنے معاملات سے فرصت نہیں تھی وہ کہاں آواز بلند کرتے۔ آواز اٹھانے والے تو خود انہی کے مہرے بنے ہوئے تھے۔ اقتدار کے تھوڑے سے حصہ پر بھی جو خوش رہتے ہیں۔

اگر اسی گڑبڑ کا مابعد نو آبادیاتی اثرات کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ ساری صورت حال آج بھی ویسی ہی ہے۔ اب ہندوں کا ہندوستان اور مسلمانوں کا پاکستان بن گیا ہے۔ پہلے وہ عام دیسی ہتھیاروں سے لڑتے تھے اور ذرائع ابلاغ کم ہونے کی وجہ سے یہ لڑائی محدود سطح پر ہوتی تھی اتنی طویل مدت ہندو مسلمان اکٹھے رہے مگر نو آبادکار یہاں نو آبادکار سے مراد انگریز نو آبادکار ہے مسلمان حملہ آور بھی نو آبادکار ہی تھے اگرچہ طریقہ واردات میں فرق تھا ان کے درد میں ایسا کچھ نہیں تھا مگر انگریز نے ایسی چالاکی سے ان میں نفرت کا بیج بویا کہ آج بھی ہم اس کو تن آور درخت کی شکل میں پاتے ہیں۔ اور ثمرات سمیٹ رہے ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی ہندوستان میں مسلمانوں کا جینا محال ہے کبھی گائے کے نام پر تو کبھی آذان کی آواز پر اس سے اوپر کی سطح پر گجرات اور کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی دیکھ لیں۔ آج بھی کوئی تیسرا ہاتھ پاکستان اور ہندوستان کو باہم ایک میز پر نہیں بیٹھنے دیتا۔ کیوں کہ یہ دونوں ملک ان سے اسلحہ خریدتے ہیں اور ان کی آمدن کا ایک ذریعہ ہیں اگر یہ گڑبڑ ختم ہو جائے تو ان سے کون اسلحہ خریدے گا۔ برطانوی دور میں گڑبڑ کی پالیسی کا عمل شروع ہوا آج بھی اسی طرح سے ہماری آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہو رہا ہے اور ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی بے بس ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی حوالے سے درج ذیل پیراگراف دیکھیں۔

> جو پارٹی تقسیم نے شروع کی تھی۔ وہ اب بھی چل رہی ہے۔ پرانے لوگ اٹھ جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے لوگ آ جاتے ہیں۔ سجاد ظہیر کے دور میں اس کے شرکا ایک مراعات یافتہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر آج پاکستان اور ہندوستان میں سے ان جیسے کردار درمیانے طبقے سے بھی آنے لگتے ہیں۔۔[۷۵]

مڈل کلاس طبقہ سے تو آج بھی کم لوگ ہی شامل ہوتے ہیں وہی مراعات یافتہ جاگیر دار اور وڈیرے ہی پارٹیوں کا حصہ بنتے ہیں اور وہاں نعیم کے ہاں موجود تمام کرداروں کی طرح آج بھی یہ کردار محض باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں اور بے عمل لوگ ہیں۔ عملی جدوجہد کا ان سے کوئی تعلق نہیں ان کرداروں کی طرح آج کے کردار بھی محض باتوں سے حالات بدلنا چاہتے ہیں۔

نو آباد کار اور نو آبادی میں تعلق کی ایک صورت یہاں برصغیر میں تھی کہ وہ مقامی نو آبادی سے شدید نفرت کرتے تھے اور چند مہرے جو نو آباد کار کا دست راست تھے ان کو بھی وہ براہ راست نہیں ملتے تھے۔ ان مہروں کے پاس بھی جو کچھ تھا انہی کا عطا کردہ تھا جب جس کو چاہا مال، اور جاگیر دے دی جہاں تک گھوڑی دوڑالے وہ سب جاگیر اسی کی۔ جب وہ جاگیر دار کسی کام کا نہ رہا تو اسے نکال باہر کیا اور اس سے سب کچھ چھین لیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان لوگوں نے نو آباد کار سے بڑھ کر مقامی آبادی پر ظلم و تشدد کیا۔ انگریزوں نے جس عورت کو چاہا اٹھالیا جس مرد کو چاہا قتل کر دیا۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ نو آباد کار کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی گورا کسی کالے کے ساتھ بیٹھے یا بات کرے۔

> ہمارے میز سے تھوڑے فاصلے پر ایک انگریز بیٹھا ہوا تھا۔ لال منہ، چھوٹی چھوٹی باریک مونچھیں۔ اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے ایک ہندوستانی لڑکے کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھ کر جامہ سے باہر ہوا جا رہا ہے۔[۴۶]

نو آبادی سے نو آباد کار کے ملک جانے والوں کی تعداد انتہائی قلیل ہوتی ہے اور جیسا کہ پہلے اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ نو آباد کار۔ نو آبادی کو ایک حد سے زیادہ قریب نہیں آنے دیتا۔ ''لندن کی ایک رات'' کے تمام کردار اور خاص کر نعیم کے پارٹی میں شامل تمام لوگوں پر نو آباد کار کا خاص کرم ہے۔ اور وہ نو آباد کار کے خاص مہرے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ نو آباد کار کے حکم پر لبیک کہا ہے۔ ''جی حضور'' مائی باپ، ''سرکار'' کے علاوہ کوئی لفظ ان کے منہ سے نہیں نکلتا۔ نواب شمس الدین خان کی طرح کے کئی کردار برصغیر میں اور بھی تھے کہ پہلے خاص بندوں میں شامل رہے اور نو آباد کار نے انہیں جاگیریں عطا کیں اور جب انہوں نے سر اٹھایا تو اس نے اس اٹھے ہوئے سر کو سر عام بازار میں لٹکا دیا گیا۔ اور سر عام پھانسی بھی ایک دہشت اور خوف کی فضا قائم کرنے کا ایک اچھا طریقہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان، ہندوستان آزاد ہو گیا آج بھی پاکستان میں مابعد اثرات کا جائزہ لیں تو دیسی لوگوں کی جان کی گوروں کی جان کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں۔ آر۔ ڈیوس اور کرنل جوزف کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

نو آبادی کی ایک مخصوص طریقے سے Brain Washing کی گئی اور انہیں یہ بات ازبر کروادی گئی کہ آپ واقعی کیڑے مکوڑے ہیں اور اشرف المخلوقات تو وہی گورے ہیں۔ آج بھی برصغیر سمیت ترقی پذیر ممالک میں یہی حال ہے کہ جب کوئی گورا قتل ہوتا ہے تو طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے جب کہ کالے لوگوں کی جان بے حد سستی ہے۔ آج بھی ہم گوروں کو حسرت بھری نظر سے دیکھتے ہیں اور ان سے ہاتھ ملانے کو سعادت سمجھتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک اس مخصوص ذہنیت سے نکل نہیں پارہے۔

نو آبادیاتی عہد کے مسائل استحصالی رویے اور مخصوص سوچ مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی ختم نہیں ہوئی اور نہ اتنی آسانی سے وہ ختم ہو سکتی ہے بلکہ ان مسائل نے ایک نیارخ اختیار کیا ہے اور ساری صورت حال بدلنے کے باوجود وہ مسائل جوں کے توں کھڑے ہیں اور مخصوص حالات پیدا کر کے بڑی طاقتیں یہ کوشش کرتی ہیں کہ یہ ممالک پسماندہ ہی رہیں۔

مثلاً اگر پاکستان کے حالات اچھے ہو جاتے ہیں، بھارت میں غربت ختم ہو جاتی ہے۔ تولائق ترین لوگ جو ہمیشہ مغرب کی طرف دیکھتے ہیں اور مواقع ملتے ہی وہ ہجرت کر جاتے ہیں وہ لوگ یہاں رہتے ہیں اور ساری سہولیتں ان کو یہاں ملیں تو مغربی ممالک میں وہ کیوں جائیں۔ ترقی پزیر ملکوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس طرح مختلف ملکوں کو سستی مزدوری پر لوگ مل رہے ہیں ان ممالک کے لوگ غربت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں نہ انہیں سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور نہ حقوق کیوں کہ نو آبادی کا یہ حق بھی نہیں بنتا کہ وہ زندگی کو اچھی طرح سے گزاریں۔ برصغیر میں نو آبادکار نے مقامی آبادی کی ایک خاص اور مخصوص پیمانے پر تربیت کی اور اس تربیت کی عمارت کی بنیادیں اس قدر مضبوطی سے کھڑی کی گئیں کہ آج بھی وہ وہیں قائم و دائم کھڑی ہے۔ نو آبادی ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتیں کو اہم سمجھتی ہے اور اجتماعی مفادات کی بجائے ذاتی مفادات اس کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نو آبادی میں سے جو مراعات یافتہ طبقہ ہوتا ہے جو اشرافیہ کہلاتا ہے ان کے لیے زندگی کا معیار ایک گورے کی زندگی ہوتی ہے۔ یہ اسی تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہے۔

برصغیر کے لیے بھی ایک مخصوص سیٹ اپ ترتیب دیا گیا جس مخصوص پیمانہ پر یہاں کی نو آبادی کی تعلیم وتربیت کی گئی وہ سلسلہ آج بھی انہیں طریقوں پر چل رہا ہے آج بھی مابعد کے اثرات جو تعلیم کے حوالے سے نو آبادکار کے تسلط کے بعد پیدا ہوئے ان کو دیکھنا ہو تو دور کی بات پنجاب میں آج بھی تعلیمی نصاب اور پالیسی بنانے والے برطانوی ماہرین ہیں۔ جو پنجاب میں سلیبس کی تشکیل اور کیا پڑھانا ہے اور کیا نہیں؟ وہی فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ سلیبس ہمارے لیے مثالی قرار دیا جاتا ہے۔

برصغیر میں اگرچہ مسلمان حکمران بھی مقامی نہیں تھے اکثریت بحیثیت نوآبادکار کے آئی تھی مگر ان میں اور برطانوی نوآبادکار میں ایک واضح فرق یہ تھا کہ مسلمان نوآبادکاروں نے یہاں کی دولت کو کہیں اور منتقل نہیں کیا بلکہ یہاں سے حاصل ہونے والی دولت کو مقامی آبادی کی فلاح بہبود کے لیے خرچ کیا اور اکثر نوآبادکار واپس بھی نہیں گئے چند ایک کے سوا مگر وہ بھی بہت تھوڑی مدت یہاں رہے۔

برطانیہ باقاعدہ ایک منصوبہ بندی سے یہاں آیا اور اس کے اپنے مخصوص مقاصد تھے جن کے حصول کے لیے جو حکمت عملیاں ترتیب دی گئیں ان میں ایک اہم تعلیم کا سلیبس یا طریقہ کار تھا۔ Knowledge is Power کے تحت انہوں نے پہلے سے رائج مدارس اور سکول کے نظام کو جو بہت اچھے انداز میں چل رہا تھا آہستہ آہستہ نئے "غیر پیداواری نظام تعلیم" سے بدل دیا۔

> برطانوی حکومت نے جان بوجھ کر ہندوستانیوں جاہل اور سائنس میں پسماندہ رکھنے کے لیے ایک ایسے نظام تعلیم کو نافذ کر دیا جو کسی طرح بھی ہندوستانیوں کے حق میں نہیں تھا۔۔۔"

انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیے جانے سے پہلے ہندوستان میں بہت سے لوگ پڑھے لکھے تھے مگر اس ایک حکم سے اکثریت ان پڑھ ہو گئی کیوں کہ سرمایہ کاری زبان انگریزی تھی، وہ فارسی عربی جانتے تھے۔ ان دیسی زبانوں کی اس نوآبادکار کی پالیسی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ ظاہر ہے پھر نوکریاں بھی پڑھے لکھے لوگوں کو ملتی تھیں جو انگریزی جاننا ہوتا اور ایسے لوگ برصغیر کی مقامی آبادی میں بہت قلیل مقدار میں رہ گئے بلکہ نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔

برطانیہ کا طویل عرصہ کے لیے برصغیر کو نوآبادی بنانے رکھنے کا خواب اسی وقت ہی شرمندہ تعبیر ہو سکتا تھا۔ جب برصغیر کے لوگوں کو ذہنی لحاظ سے قابو کیا جائے اور آنے والی نسل کی پرورش اُن زاویوں پر ہو جو نوآبادکار کے لیے سودمند ثابت ہو سکیں۔ "لندن کی ایک رات" کے کردار اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جو وہ ذہن پیدا کرنا چاہتے تھے۔

مشرقی علوم اور زبانوں سے انگریز سرکار کو کیا حاصل ہوتا کچھ بھی نہیں اور ان زبانوں پر خرچ سے الٹا ان کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ قائم رہتا۔ مابعد تناظر میں اس تعلیمی پالیسی کے اثرات سب سے زیادہ مرتب ہوئے اور آج تک اس غیر پیداواری نظام تعلیم میں ہم الجھے ہوئے ہیں۔ اور مستقبل قریب میں بھی اس سے نکلتے نظر نہیں آتے۔

مشرقی علوم پر مزید خرچ کرنا کارلا حاصل ہے۔ اور اسے بر صغیر کی عوام میں انگریز کے خلاف مزاحمت پیدا کرنے کا عنصر قرار دیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ جب تک بر صغیر کے عوام اپنے ماضی اور مذہب سے وابستہ رہیں گے انگریز اقتدار خطرے میں رہے گا۔[۴۸]

یہ پالیسی برطانوی اقتدار کو طول دینے میں بڑی حد تک کار آمد ثابت ہوئی اور برطانوی حکمرانی کی طوالت میں اس پالیسی کے کردار کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ آئی۔ سی۔ ایس ایک اہم امتحان رہا ہے عارف یہی آفیسر بنانا چاہتا ہے مگر عارف کے ذہن کے کسی کونے میں یہ بات بھی موجود ہے کہ مجھے ہندو ممتحن پاس نہیں کر رہے۔ نفرت پر مبنی پالیسی سے وہ بھی جان نہیں چھڑا سکا۔ ''لندن کی ایک رات'' میں ''چند بے عمل'' کردار بر صغیر کی کثیر تعداد کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

''لندن کی ایک رات'' میں جہاں انگلستان میں موجود ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا عکس پیش کیا گیا ہے وہیں بر صغیر میں تعلیمی صورتحال کا نقشہ بھی ہمارے سامنے لایا جاتا ہے۔ مراعات یافتہ طبقہ یہاں کی تعلیم سے مطمئن نہیں ہے اور وہ اپنے بچوں کو لندن میں اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ ہر طالب علم مواقع کی تلاش میں ہے کہ وہ لندن سے تعلیم حاصل کرے۔

اسی تعلیم پالیسی کے مابعد نو آبادیاتی اثرات ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں اگرچہ بھارت بہت حد تک بڑی یونیورسٹیاں بنانے میں کامیاب ہوا ہے اور تعلیمی حالت بہتر ہو گئی ہے مگر پاکستان میں ابھی بھی ۱۹ویں صدی ہی چل رہی ہے اور ملکی پالیسی میں تعلیم کے لیے بہت کم بجٹ رکھا جاتا ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اور آج اگر کوئی انگلستان سے ڈگری لے کر آتا ہے تو اسے مقامی تعلیم یافتہ طالب علم پر ترجیح دی جاتی ہے کمپنی کے دور سے لے کر تاج برطانیہ کے زیر آنے تک اور پھر نام نہاد آزادی حاصل کرنے تک قابل لوگوں کی اس خطہ میں کوئی جگہ نہیں رہی اور آگے بڑھنے والوں کو ہمیشہ راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

> ہمیں اپنی بھرپور کوششیں اور صلاحیتیں اس بات کے لیے صرف کرنی چاہیں کہ ہم ہندوستان میں ایک ایسی کلاس کو پیدا کریں جو ہمارے اور ہمارے زیر نگیں کروڑوں ہندوستانیوں کے درمیان مترجم کی ذمہ داریاں نباہ سکے یہ کلاس ایسے افراد پر مشتمل ہو گی جو کہ رنگ اور جسمانی خدوخال ہندوستانی ہوں لیکن مزاج پسند ناپسند، نظریات، اخلاقیات اور عقل و دانش کے استعمال میں برطانوی باشندوں سے جیسے ہوں۔۔۔[۴۹]

نو آبادی اور نو آبادکار کے درمیان ایک اہم خلیج زبان کا مختلف ہونا تھا اور جیسا کہ پہلے اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ برصغیر کی مقامی زبان فارسی، عربی، اردو اور دیگر مقامی بولیوں کا انگریزی سے دور پار کا بھی تعلق نہیں تھا اور نو آبادکار کو اپنے تسلط کی طوالت کے لیے زبان جاننا بے حد ضروری تھا۔ اگرچہ انگریز اپنی حکمت عملی کے تحت مقامی لوگوں سے بہت کم براہ راست ملتے تھے مگر پھر بھی ان کے مہرے بھی انگریزی میں کم ہی مہارت رکھتے تھے انگریز قطعاً یہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسی تعلیم پالیسی اور نظام تعلیم یہاں (برصغیر) میں نافذ کیا جائے جن سے لوگوں کی زندگی بہتر ہو اور معاشرہ ترقی کرے اور نہ وہ زبان کے ذریعے دنیا کی سوچ کا دروازہ اپنی نو آبادی پر کھولنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کے ایک خاص پالیسی بنائی جو وہی مترجم ہی رہیں۔

> وہ (عارف) ان لوگوں کا جانشین ہونے والا تھا جن کو اس بات پر فخر تھا کہ انہیں اپنی مادری زبان اچھی طرح بولنی نہیں آتی اور جو اپنے کو انگریزوں سے بھی بڑھ کر "پکا صاحب" سمجھتے تھے۔ انہیں "پکے صاحب لوگوں" میں ایک مسلمان کلکٹر صاحب تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ انہوں نے بقرعید کے دن اپنے مسلمان منشی سے پوچھا "ول منشی" کیا آج ٹم (تم) لوگوں کا بڑا دن ہے۔[۸۰]

یہی اس تعلیمی نظام کی پیداوار ہیں جو انگریز نے ایک خاص مقصد کے لیے نافذ کیا اور اس نظام تعلیم سے "دیسی لوگ" نہ دیسی رہے اور نہ ولائتی۔ ان کے ذہن کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ وہ ہمیشہ نو آبادی کے مقابلے میں نو آبادکار کے طرف دار رہیں۔

دنیا بھر کی اقوام اپنے خطہ زمین اور مخصوص پس منظر کی وجہ سے ایک خاص اور الگ ذہن رکھتی ہیں۔ ایک ملک اگر ایک طریقہ کار سے درست سمت چل رہا ہے تو لازمی نہیں کہ دوسرا ملک بھی وہ طریقہ کار استعمال کر کے کامیاب ہی ہو۔ آج بھی دنیا میں کئی اقوام میں جن کا نظام تعلیم کامیاب ہے اور وہ اپنی قومی زبان میں ہے۔ مگر ہم خاص کر موجودہ پاکستان میں انگریزی ایک زبان کی سطح تک محدود نہیں رہی بلکہ اسے اپنے اوپر سوار کر لیا گیا ہے۔ مزہ تو تب تھا کہ ہمیں اپنی مادری یا قومی زبان میں گفتگو کرنے پر فخر ہوتا مگر ایسا نہیں ہے زبان کے حوالے سے میرے خیال میں ہم آزاد ہوئے ہی نہیں۔ مثلاً ہاتھی کا ایک بچہ پکڑ کر ہم اسے زنجیر سے باندھ دیتے ہیں وہ زور لگاتا رہتا ہے مگر اس وقت یا اس عمر میں وہ اس مقام پر نہیں کہ زنجیر توڑ سکے۔ مگر ایک وقت آتا ہے کہ وہ ایک بھرپور طاقت والا جوان ہاتھی بن گیا ہے مگر اب وہ زور نہیں لگا رہا اور ذہنی طور پر

غلامی کو قبول کر چکا ہے۔ اسے کچھ وقت کے لیے زنجیر سے آزادی بھی دلا دی جائے تو وہ کہیں نہیں جائے گا۔ ''لندن کی ایک رات'' میں اس طبقہ کی بھرپور نمائندگی موجود ہے۔

مابعد نوآبادیات کے تناظر میں اگر تعلیمی نظام کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیں تو آج بھی وہی طبقہ ہم پر مسلط ہے اور وہی ہماری ملکی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ملک میں اصلاحات لائی جائیں اور ملک کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے۔ یہ کلرک اور بیوروکریٹ ہیں جو ہمیں اسی پرانی ڈگر پر چلانا چاہتے ہیں اور آج بھی اردو اور دیگر مقامی بولیاں بولنے والوں کو یہ لوگ عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں اور خود سے کم تر سمجھتے ہیں اور آگے بڑھنے والے کا راستہ روکتے ہیں اور آج بھی انگریزی بولنے لکھنے والا ہی اور وہی نوآبادی ذہنیت رکھنے والا ہی آگے ترقی کر سکتا ہے اور ہمارے رول ماڈل بھی سارے لندن سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی بھی مثال دینی ہو سیاسی یا غیر سیاسی ہم انگلستان کی ہی دیتے ہیں۔

ایک اہم سوال جو بار بار سامنے آتا ہے کہ آخر کیوں ایک بڑا طبقہ جو معاشرہ اور معاشرہ کی سوچ کو بدل سکتا ہے اس پر اثر انداز ہو سکتا ہے وہ کیوں نوآبادکار پیروی میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر محض نوآبادکار کی پیروی میں لگ جاتا ہے برصغیر میں ایسے لوگوں کا نمائندہ ''لندن کی ایک رات'' کا کردار عارف اور مسلمان کلکٹر ہے۔ جن کا اپنا کچھ بھی نہیں وہ بس نوآبادکار کا دست راست بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اور اپنی اقدار و روایات ان کی نظر میں ہیچ ہو جاتی ہے۔

سرسید تحریک کے تناظر میں دیکھا جائے تو تقلید پسند گروہ مقامی نوآبادی کو جدید بنانے اور ترقی دلانے کے لیے اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہوتا ہے اور یہ بھی ویسا ہی چاہتے ہیں جیسا انگریز چاہتے تھے کہ زبان کی رکاوٹ کو ختم کیا جائے۔ اگرچہ سرسید احمد خان بہت حد تک درست بھی تھے مگر یہاں نوآبادکار کے مقاصد کی بات آجاتی ہے کہ وہ معاشرہ میں انگریزی زبان سیکھا کر کوئی ترقی کی طرف نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ انگریز نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت برصغیر میں پہلے سے نافذ نظام تعلیم کو تباہ کیا تو دوسری طرف ایک ایسا نظام تعلیم لایا جو نوآبادی کو ذہنی طور پر مفلوج کر رہا ہے۔

یہی وہ ایک راستہ تھا جس کی وجہ سے تقلید کرنے والے ناپسندیدہ ٹھہرے اگر وہ بھی مخالفت کرتے رہتے اور انگریزی سے دور بھاگتے رہتے تو برصغیر پر بیرونی دروازے ہمیشہ بند ہی رہتے۔ مثلاً اشتراکیت کا نظریہ اور اس حوالے سے خاص سوچ، حقوق سے آگاہی، اپنے مفادات کا تحفظ اور سب سے بڑھ کر آزادی کا خیال اور احساس غلامی۔ اس غلامی سے نجات کے راستوں کا چناؤ زبان سے واقفیت کے بغیر ناممکن نظر آتا

ہے۔ سجاد ظہیر خود انگریزی ادب کے ذریعے سے انقلابی خیالات سے واقف ہوئے اور اس کے بعد اپنی عوام کو ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ ''لندن کی ایک رات'' میں مسلمان کلکرؔ کا کردار اسی حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم ہے یا نہیں یہ پاکستان میں آج تک بحث چل رہی ہے اور ہم اس فیصلہ سمیت کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں اپنی دیسی زبانوں کے حوالے سے ہمیں احساس کمتری کا شروع دن سے احساس دلا دیا گیا ہے کہ مقامی دیسی بولیاں اور باتیں تو جاہل گنوار بولتے ہیں سلجھے ہوئے لوگ تو صرف انگریزی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔

ابھی تک ہم نو آباد کار کے ہتھکنڈوں، طور طریقوں اور ان کے مخصوص بیانیہ (پراپیگنڈا)، طریقہ واردات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اور اب یہاں نو آبادی کی مخصوص سوچ احساس کمتری اور خاص کر اپنی سوچ پر غیر کی سوچ کو ترجیحی کے فیصلے پر غور کیا جائے گا۔

برصغیر میں برطانوی مقاصد تو روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ محض تجارت کا ڈراما اور مقصد صرف اور صرف یہاں لوٹ کھسوٹ سے مال جمع کر کے برطانیہ کی آمدنی میں اضافہ کرنا مقصود تھا۔ برصغیر پر ایک نہیں بہت سے گروہوں نے حملے کیے تسلط قائم کیا قبضہ کیا اور خوب مال متاع جمع کیا اور چلتے بنے ان سب حملہ آوروں بشمول برطانیہ نے یہاں سے مال چورانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی صرف طریقوں کا فرق رہا۔ برصغیر پر آخر اتنے حملے کیوں؟ برصغیر دنیا کے بہت سے خطوں کی زرخیزی اور مال و دولت کے لحاظ سے بہت آگے رہا ہے۔ جب دنیا کی آمدن ایک روپے تھی تو یہاں کے لوگوں کی دو روپے تھی اور مقامی دیسی لوگ اچھی خاصی آسودہ حال زندگی بسر کر رہے تھے دنیا کے بہت سے ممالک جب خط غربت کی سطح کے نیچے تھے اور عوام بھوکے سوتے تھے تو یہاں (برصغیر) عوام اچھی خاصی خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ یہ خطہ خداداد نعمتوں سے مالا مال خطہ رہا ہے اور اب بھی ہے اور قدرتی چراگاہوں کے وسیع میدان اس کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی لیے باہر کے لوگ اس پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ دنیا کے اس خطہ کو لوٹا ہے اور آج بھی لوٹ رہے ہیں مگر یہ قائم و دائم ہے۔ کوئی چیز خواہ ہئیت کے لحاظ سے کیسی ہی ہو وہ ابتداء میں بنانی خاصی مشکل ہوتی ہے۔ ابتدائی درجہ میں اس پر بہت محنت، توجہ اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں جب اس کا ڈھانچا تشکیل پا جاتا ہے تو اس میں دو طرح کا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک تو بعد میں کثیر تعداد میں بنائی جا سکتی ہے۔ دوسرا اس پر وقت اور لاگت کم آتی ہے۔

برصغیر کی آبادی کی مثال بھی اسی چیز کی سی ہے ابتدائی دور میں نو آباد کار کو خاصی محنت کرنا پڑی اور زیادہ وقت لگانا پڑا۔ اس لیے کہ ان کی مخصوص ذہنیت کے تناظر میں ذہن سازی کی جا سکے اور پھر اس ذہن سازی کا سلسلہ چل نکلا جو مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی اس طرح کا کام کر رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہی ذہنیت اب بھی ہماری ہے جو نو آبادیاتی عہد میں تھی۔

> لال ٹماٹر کا سا چہرہ بنچ پر بیٹھا ہوا بد مستی کی ہنسی ہنس رہا تھا۔ راؤ اور اعظم جن پر خود شراب کا اثر ہو رہا تھا غصہ سے کانپ گئے۔ ذلت، رسوائی، بے آبروتی ہندوستانیوں کی قسمت میں لکھی ہے۔ دنیا کے جس حصہ میں بھی وہ جائیں غلامی کا ٹیکہ ان کے ماتھے سے نہیں چھوٹ سکتا۔[۸۱]

نو آباد کار کو صرف مخصوص ذہنیت کے پیدا کرنے والے سانچہ پر محنت کرنا پڑی اور اس کے بعد تو آج تک اسی ذہنیت کے لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ ۳۵۰سالہ انگریز نو آباد کار کا قبضہ ایک واقع یا دوسرے الفاظ میں ایک حادثہ تھا جو ختم ہو چکا۔ مگر وہ ذہنیت وہ سوچ آج بھی پوری طرح سے پیدا وار دے رہی ہے۔

درج بالا اقتباس سے ایک طرف نو آبادیاتی عہد کا منظر اور نو آبادی کی سوچ سامنے آتی ہے۔ وہیں مابعد نو آبادیاتی عہد کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ نو آبادی کو ایک سطح پر احساس غلامی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ہم آزاد نہیں ہیں۔ اور غلامی کا یہ داغ ہماری پیشانی پر چمک رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس دور میں ممکن ہے اسے چھپایا جاتا ہو کہ ہم برطانیہ کے غلام ہیں اور ہمیں آزادی نصیب نہیں۔ اور اس نعمت خداوندی سے ہم محرومی کی زندگی گزار رہے ہیں جب کہ دنیا میں اقوام آزادی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ یہ شاید ۱۹۴۷ء سے پہلے کی بات ہے مگر مابعد نو آبادیاتی تناظر میں آج کیوں یہ سوال خاصہ اہمیت کا حامل ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہم آزاد ہو گئے تھے یا نو آباد کار نے ایک طریقہ بدلا تھا اور ابھی تک وہی نو آبادیاتی عہد چل رہا ہے۔ بس پہلے سربراہ گورے یعنی سفید چمڑی والے ہوتے تھے مگر آج یہی مقامی لوگ جو کہ اصل میں ان کے آلہ کار ہیں۔ وہ حکمران بن گئے ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی تناظر میں یہ بات خاصی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارا لندن ہی دارالحکومت ہے ہمارے حکمران اور ہم خود برطانیہ کی شہریت لینا اور رکھنا ایک قابل فخر عمل سمجھتے ہیں۔ ہمارا سارا روپیہ پیسہ پہلے گورے (نو آباد کار) خود لے جاتے تھے اور مابعد آج یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد ہم خود ان کو پہنچاتے ہیں۔

> مابعد نو آبادیات کیوں؟ اس سوال کا دوسرا رخ یہ ہے کہ بعض کے نزدیک ابھی نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ نہیں ہوا۔ اس نے اپنا چولا بدلا ہے۔۔۔[۸۲]

آج بھی برصغیر کے حکمرانوں کی ساری دولت برطانوی بینکوں میں پڑی ہے اور وہ صرف یہاں حکمرانی کرنے کے لیے ہیں اور جب وہ حکمرانی سے ہٹتے ہیں تو اگلی فلائٹ سے سیدھے لندن چلے جاتے ہیں۔ ایون فیلڈ سمیت مختلف واقعات دیکھ لیں اکثریت نمائندوں کے پاس برطانوی شہریت ہے اور وہ اسے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے قابل فخر سمجھتے ہیں۔

میرے خیال میں مابعد تناظر میں ناصر عباس نیر کا یہ حوالہ ہمارے موجودہ عہد کا بہترین عکاس ہے۔ اگرچہ یہ رائے اور بھی لوگ رکھتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ۴۰۰ سال گزر گئے ہیں مگر اب بھی ہمارے نمائندوں (نو آبادکار کے مہروں) کا قبلہ و کعبہ لندن ہی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی عہد میں ایک اور طرح کے مہرے تیار ہو رہے ہیں کہ ہمارے جاگیر دار وڈیرے جو نام نہاد ہمارے خدمت گار ہیں اور حکمران (بزنس مین) اپنے بچوں کو برطانیہ کے سکول اور یونیورسٹیوں میں پڑھا رہے ہیں۔ اور وہ واپس آکر یہاں حکومت کرتے ہیں۔ یہ سارا نظام اسی طرح ایک تسلسل میں چل رہا ہے، ظاہری طور پر اس کے بدلنے کے اثار نہیں۔

> یہ تصور بھی عام ہے کہ مقامی حکمران مقامی آبادی کے نمائندہ ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اصل میں وہ نئے استعمار کے نمائندہ ہیں۔ ان کے ڈھونگ رچانے کی غیر معمولی صلاحیت مقامی آبادی میں انہیں قابل قبول بناتی ہے اور نئے استعمار آشیر باد سے سرفراز کرتی ہے۔۔۔[۸۳]

اکثر اوقات ڈراما کرتے ہوئے اداکار اس حد تک اپنے آپ کو اس کردار میں شامل کر لیتا ہے کہ دیکھنے والوں کے جذبات اس اداکار کے جذبات بن جاتے ہیں۔ اور ناظر اداکار کے غم پر دکھی اور خوش پر خوش ہو جاتا ہے۔ یہی حال ہمارے حکمرانوں کا ہے، وہ مقامی لوگوں کا نمائندہ ہونے کا ڈراما کرتا ہے اور ہم مان لیتے ہیں کہ یہ بات ٹھیک کر رہا ہے اور یہی ہمارا بہترین نمائندہ ہے ہم آج بھی اچھے کی امید پے ادھر ہی چکر میں پھنسے ہیں۔

راؤ اور اعظم کو غلامی کا احساس ہے اور وہ چھٹکارا چاہتے ہیں۔ اور وہ دونوں یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم لندن میں رہتے ہیں تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ ہماری پیشانی صاف ہو گئی ہے نہیں ایسا بلکل نہیں ہے بلکہ یہ داغ ہم دنیا کے کسی بھی خطہ زمین پر چلیں جائیں۔ یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور نہ صرف

ہمارے سامنے یہ داغ کھڑا ہوتا ہے اور ہمیں نظر آرہا ہوتا ہے بلکہ دنیا بھی اس کو دیکھتی ہے اور یہ ٹیکہ ہمیں مسلسل احساس کمتری میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ غلامی سے نکلنے کی سوچ محدود لوگوں میں ہے۔

دنیا بھر میں نو آباد کار اور نو آبادی کے تعلق کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں نو آباد کار کی مزاحمت کرنے والا ایک آدھ بندہ ہوتا ہے اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے جب کہ وہ اکیلا ہوتا ہے اور اس کی پشت پر کوئی دوسرا آدمی بھی نہیں کھڑا ہوتا پھر کچھ عرصہ بعد لوگوں کو احساس ہونا شروع ہوتا ہے کہ ہاں یہ اکیلے راستے پر جانے والا اکیلا مسافر درست ہے پھر وہ بھی کچھ وقت ذہنی کشمکش میں رہتے ہیں اور آخر پے وہ اس شخص کے ساتھ شامل ہو جاتے ہے اور اسی طرح ایک کارواں شروع ہوتا ہے اور پھر کثیر تعداد میں لوگ اس کے ساتھ آکر شامل ہو جاتے ہیں۔

> "قومی تشخص اور ثقافتی وجود کو جو کاری زخم نو آبادیات نے لگائے تھے۔ ان سے اب تک خون رس رہا ہے۔ کہیں تو یہ زخم ناسوبن گئے ہیں طرفہ تماشا یہ کہ زخموں کو مندیل کرنے کا چارہ نہیں کیا جاتا۔ اگر کیا جاتا ہے تو بزدلی کے ساتھ جس سے زخموں پر نمک پاشی ہوتی ہے۔ اور وہ بھی نہایت بھونڈے انداز میں پاکستان کا نظام تعلیم اس کی روشن مثال ہے۔"[۸۴]

جیسا کہ پہلے اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ ہم اپنی تعلیمی پالیسی بنانے سے قاصر ہیں اور ہم مکمل طور پر اس میں ناکام ہیں اور آج بھی ۲۱ویں صدی میں اس معاملے میں ہم براہ راست برطانیہ کے محتاج ہیں۔ باالفاظ دیگر ہم مابعد بھی انہی کے ذہنی غلام ہیں۔

کیا یہ زخم ۳۵۰ سال کے ہیں یا کہ پہلے بھی کچھ ایسا ہے۔ اگر برصغیر کو بحیثیت نو آبادی دیکھا جائے تو تعلق، لودھی، مغل سمیت کوئی بھی مقامی حکمران نہیں تھا اسی طرح کے چند اور لوگ بھی تھے۔ ہم ایک عرصہ سے غلام رہنے کی وجہ سے ذہنی طور پر غلامی کو قبول کر چکے ہیں۔ اور ہمیں اب غلامی میں سکون ملنے لگا ہے۔ اور ہم اس غلامی میں خود کو بڑا پر سکون محسوس کرتے ہیں۔ اور جب "میاں مٹھو" کی طرح پنجرے سے ہمیں نکال کر اڑنے کی ترغیب دی جاتی ہے تو ہم نہیں اڑ سکتے بلکہ ہم ذہنی طور پر اس نئی آزاد دنیا کو قبول ہی نہیں کرتے۔

ہمارے حکمرانوں کا اس غلامی کو برقرار رکھنے میں بہت بڑا کردار ہے راؤ اور اعظم تو ہیں مگر نمائندہ ان کی طرح کی سوچ رکھنے والا کوئی نہیں ہم نے قومی زبان کو کبھی ترجیح نہیں دی ہمارے حکمرانوں نے ایک وقت میں فارسی کی غلامی کی وہاں سے نکلے تو انگریزی کے غلام اب پنجاب کا وزیر اعلیٰ کہہ رہا ہے کہ طالب علموں جو جیسی زبان سیکھنی چاہیے اور پاکستان میں وہ لازمی مضمون کا درج حاصل کرنے جارہی ہے۔ زبان سیکھنا، زبان پر مہارت حاص لکرنا بہت اچھی بات ہے۔ اس مین کوئی برائی نہیں برائی اس زبان کی بلکہ زبان کے راستے سے اس قوم کی غلامی کرنے سے ہے۔ ہم چاہتے ہوئے بھی قومی زبان اپنانے سے قاصر ہیں اور ہمارے حکمران وہی یکسر سیٹ رہے ہیں۔ نو آبادی میں تقلید پسند طبقہ تقلید مین اس حد تک آگے گیا ہے کہ جہاں ان کا مذہب مسلک دین دھرم سب کچھ چھوٹ گیا ہے۔ یہ طبقہ غالب کی طرح کعبہ اور کلیسا کے درمیان میں نہیں رہا بلکہ یہ واضح طور پر کلیسا کی طرف جھکا ہوا نظر آرہا ہے۔

"ول منشی" اور ٹم جیسے الفاظ پر غور کریں کہ ایک مسلمان کلکٹر ایک طرف لہجہ پر کس قدر توجہ دے رہا ہے تو دوسری طرف مذہبی حوالہ سے کہاں پہنچا ہوا ہے۔ منشی جی یا منشی صاحب بولنا نہیں گوارا "تم" لفظ مناسب نہیں "ٹم" ٹھیک ہے غلط اور درست کا معیار انگریز کے منہ سے نکلا ہوا لفظ ہے جس طرح وہ بولے اس کی پیروی جس طرح وہ خیالات رکھتا ہے اس کی اندھی تقلید کہ مسلمانوں ہوتے ہوئے بقر عید کے بارے میں کس طرح کے خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیز مابعد نو آبادیاتی اثرات کے حوالے سے ایک بڑی خوب صورت مثال دیتے ہیں کہ سیلابی صورت میں ایک پانی کا بہت بڑا ریلا چل رہا ہوتا ہے اور جہاں سے گزرتا ہے تباہی پھیلاتا جاتا ہے۔ اس ریلا کے سامنے آنے والی کوئی چیز سالم نہیں رہتی درخت گر جاتے ہیں، فصلیں پانی اوپر تک چڑھ جانے کی وجہ سے گل سڑ جاتی ہیں، پورے پورے شہر جو ریلا کے بہاؤ کے سامنے آتے ہین وہ ساتھ بہالے جاتا ہے۔ بہت سے مکانات وہیں گر جاتے ہیں۔ انسانوں کی ایک کثیر تعداد گھر سے بے گھر ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے مال مویشی ختم ہو جاتے ہیں لیکن وہ ریلا جب گزر جاتا ہے اور باقی اپنے ایک عرصہ کے لیے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک تصویر کے دو رخ دیکھتے ہیں۔ ایک صورت حال تھی جب پانی بہہ رہا تھا۔ اور اس کی اونچائی مثلاً سات یا دس فٹ تھی اور دوسرا رخ جب پانی اترتا ہے تو یہی تصویر دوسرے رخ سے پہلے کی نسبت واضح نظر آتی ہے کہ ہر طرف تباہی اور بربادی بکھری ہوئی ہے۔ یہی بعد کے اثرات اہم ہیں اس کو ہم سیلابی صورت نہیں کہہ سکتے یہ بعد کے اثرات کو زائل کرنے میں وقت لگتا ہے۔

برصغیر میں سیلاب کی صورت حال جس میں پرجوش پانی سر کے اوپر سے گزر تارہا اس کو مدت ہو چکی ہے ۳۵۰ سال۔ یہ نو آباد کار کی موجودگی کے حوالے سے ہے منظرنامہ تھا اس میں بیرونی حملہ آوروں نو آباد کاروں کے تناظر میں برصغیر کو دیکھا جائے تو یہ کئی سو سال سے غلام چلا آرہا ہے اور اسی پرجوش ریلے کی زد میں رہا مگر ظاہری طور پر ۱۹۴۷ء میں وہ پانی اتر گیا۔ مگر آج تک پاکستان میں وہی سیلابی پانی کے اتر جانے کے بعد والی (مابعد نو آبادیاتی) صورت حال ہے۔

> وہ (عارف) اس سیدھے راستہ پر لگا ہوا کام کرتا چلا جاتا ہیا سی کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں یہ بات بھی سما گئی تھی کہ انگریزی کپڑے اچھی طرح پہننا، انگریزی زبان بالکل انگریزی لہجہ میں بولنا، کلکٹری کے امیدوار کا فرض ہے۔[۸۵]

برطانوی نو آباد کار کا قطعاً یہ مقصد نہیں تھا کہ میں برصغیر کے لوگوں کو انگریزی سیکھائے تا کہ یہ دنیا کے ساتھ شانہ بشانہ چل سکیں اور دنیا کے نظریات اور سوچ سے واقف ہو سکیں۔ اس نے تو صرف ترجمان پیدا کرنے تھے جو وہ کرتا رہا مگر اس معاملہ میں نو آباد کار نے اگر چار الفاظ سیکھانے تھے لیکن نو آبادی میں سے اکثر و بیشتر انگریزی پڑھنے والوں نے دس الفاظ سیکھ لیے۔ یہ مکمل طور پر برصغیر کے لوگوں کی اپنی محنت اور صلاحیت تھی کہ وہ انگریزی زبان پر مہارت حاصل کر لیتے ہیں اور پھر یہی مہارت آزادی کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

عارف یہاں پر دو باتیں کرتا ہے۔ ایک تو اسے انگریزی بولنی چاہیے یہ کسی حد تک مان لیا ہم کسی حد تک اس بات کو مان لیتے ہیں کہ وہ زبان سیکھنا چاہتا ہے اور سیکھ رہا ہے۔ اس بات کو ہم سیلابی ریلا کہہ سکتے ہیں۔ اور دوسری بات جو عارف کہہ رہا کہ انگریزی کو اس کے لہجہ میں بولنا چاہیے یہ بعد کی صورت حال ہے یعنی عارف ایک گورا ہے جو نو آبادی میں کسی کے گھر پیدا ہوا ہے یا اس بات کو دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ دیسی کو نو آباد کار نے اپنے سانچے میں ڈال کر ہم دیسی اور نیم گورا کر دیا ہے۔

عارف جیسے اور دیگر کردار برصغیر پر طویل برطانوی تسلط میں بہت کار آمد ثابت ہوئے اور یہ لوگ خود اپنے لوگوں کو نو آباد کار کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ وہ مخصوص ذہنی تشکیل ہے۔ جو نو آباد کار کر رہا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی تناظر مین آج ان اثرات کو دیکھیں۔ ہماری بیوروکریسی کے اعلیٰ آفسران سمیت مختلف شعبوں میں کام کرنے والے اعلیٰ عہدے داروں کو اچھی تربیت کے لیے آج بھی برطانیہ بھیجا جاتا ہے اور وہ وہاں سے کورس کر کے واپس آکر یہاں مقامی لوگوں سے اسی طرح کا رویہ رکھتے ہیں جس طرح کا نو آباد کار کا تھا۔

مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی پاکستان اس قابل نہیں ہوا کہ وہ اعلیٰ سول عملہ کی تربیت اپنے ملک میں کرسکے یوں لگتا ہے کہ الٹا ہم آج نو آباد کار کے جانے کے بعد مشکل میں ہیں پہلے وہ یہاں رہ کر مفت میں ہماری ذہن سازی کر رہا تھا اور آج ہمیں اپنے لوگوں کو وہاں لندن بھیجنا پڑتا ہے اور کافی سارا خرچہ ہو جاتا ہے آج بھی ہمارے اعلیٰ افسران اور مختلف اداروں کے سربراہ سب سے پہلے تو وہ عام عوام سے ملنا گناہ کبیرا خیال کرتے ہیں اور اگر کبھی کو عام عملہ سے بھی بندہ ملے تو وہ انگریزی بول رہا ہوگا اور انگریزی لہجہ کے ساتھ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ میں اس بات کو مقامی زبان میں بہتر سمجھا سکتا ہوں۔ افسران کے پانچ پانچ صرف پی۔ اے ہوتے ہیں اس لیے ان پر عام لوگوں کی رسائی بھی نہیں ہوتی اور انہیں عام عوام سے دور رکھا جاتا ہے۔

مقامی سطح پر بہت لائق بندے کے مقابلے میں برطانیہ سے ڈگری لینے والوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور اسے عوام پر مسلط کیا جاتا ہے الیکشن میں کھڑے ہونے والے ہمارے نام نہاد نمائندوں میں سے کسی کی اولاد پاکستان میں تعلیم حاصل کرنا گناہ سمجھتی ہے۔ آج نواز شریف، زرداری، عمران اور دیگر پارٹیوں کے سربراہوں کی اولاد بطور مثال ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو پاکستان سے کتنی دل چسپی ہے۔ بنک بیلنس تک ان کا دنیا کے ترقی یافتہ ممالک خاص کر لندن میں ہے۔

ہم ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو جسمانی لحاظ سے تو شائد آزاد ہو چکی ہے مگر ذہنی طور پر آج بھی انہی انگریزوں کے غلام ہے تو بس غیرت جگانے کا معاملہ ہے نہ جانے کب جاگتی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے برطانیہ یہاں برصغیر میں بیٹھا ہوا تھا اور یہاں سے ہم کو کنٹرول کر رہا تھا مگر اب بھی اپنے بناتے ہوئے لوگوں کے ذریعے ہم پر مسلط ہے۔ میرے خیال میں تو ہمیں مکمل آزادی ملی ہی نہیں بس ادھوری آزادی ملی اور اسی کے ساتھ ہم خوش و خرم جی رہے ہیں۔ آج بھی پاکستان میں دیکھ لیں یورپی طرز زندگی، یورپی لباس، موسمی لحاظ سے ناموافق ہونے کے باوجود یورپی طرز تعمیر۔ یہاں تک کہ گنجائش نہ ہونے کے باوجود یورپی نظریات کو بڑی جلدی قبول کر لیا جاتا ہے اور ہم ان باتوں پر فخر کرتے ہیں کہ میرے پاس کوئی چیز یورپی ہے۔

> کولونیل ازم ایک نیا ڈراما تھا جن کا اسکرپٹ یورپ نے لکھا اور جیسے کھیلنے کے لیے ایشیا و افریقا کی سرزمین کو منتخب کیا گیا ڈرامے کے مرکزی کردار یورپی تھے تاہم کچھ معاون اور ضمنی کردار ایشیائی و افریقی تھے۔۔۔[۸۶]

''لندن کی ایک رات'' میں عارف اور مسلمان کلکڑ جیسے کردار معاون اور نچلی سطح کے لوگوں کے نمائندہ ہیں۔ کیوں کہ نو آباد کار کے لیے مقامی معاون کے بغیر چلنا ناممکن تھا اور یہ مقامی لوگ بہت کار آمد

ثابت ہوئے مال متاع کی لوٹ کھسوٹ میں اور مخالف ذہن رکھنے والے باغیوں کو کچلنے میں لیکن کوئی اہم عہدہ یا اہم فیصلے میں نو آبادی کا نمائندہ شامل نہیں ہوتا تھا جس معیار، اصول اور طور طریقہ پر نو آبادی کی تربیت ہوئی اس سے نکلنا آسان نہیں نظر آتا۔

دنیا میں مثالیں موجود ہیں کہ پسماندہ قومیں اٹھی ہیں اور ترقی کی منزلیں طے کر گئی ہیں چین اور جاپان کی مثالیں دیکھ لیں مگر وہ ذہنی طور پر پسماندہ نہیں تھیں اپنی تہذیب وثقافت کے بارے میں احساس کمتری کا شکار نہیں تھیں۔ ہم اپنی چیزوں کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہیں۔ کسی بھی نو آبادی پر مابعد نو آبادیات کے اثرات بہت دیر پا ہوتے ہیں اور ان اثرات کی جڑیں بھی انتہائی گہری ہوتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان اثرات کو زائل کرنا ناممکن ہے۔ مگر مشکل بہت ہے جس طرح پہلے طوطے اور ہاتھی کے بچے کی مثال دی گئی کوئی بھی خطہ جو نو آبادی بنا اس کی وجہ کیا تھی۔ دنیا میں ایشیا وافریقا میں جو اقوام زیر رہی ہیں۔ وہ کیوں ہوئیں یہ ایک الگ بحث ہے کہ اگر ان میں اتنی جان ہوتی تو ایسا کچھ نہ ہوتا۔ قومیں محنت لگن سے آگے بڑھتی ہیں۔ کوشش کا عنصر ان میں پایا جاتا ہے مگر انتشار سب کو لے ڈوبتا ہے ایسا ہی برصغیر میں ہوا۔

> قومی تشخص اور ثقافتی وجود کو جو کاری زخم نو آبادیات نے لگائے تھے۔ ان سے اب تک خون رس رہا ہے کہیں تو یہ زخم ناسو بن گئے ہیں۔[۸۷]

اصل بات یہاں آجاتی ہے کہ ہم اسی ماحول میں خود کو محفوظ تصور کرتے ہیں اور ذہنی طور پر اس سے مقابلے کے لیے تیار ہی نہیں خود کو کر پاتے برصغیر میں یک جہتی کا ہمیشہ فقدان رہا ہے اسی لیے دنیا بھر کے حملہ آوروں نے برصغیر کو خوب لوٹا اور اپنی مرضی سے آئے اور لوٹ مار کر کے مرضی سے گئے انہیں بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ زمین پہلے ہموار ہو چکی تھی۔ یہ کوئی ایک دم ہونے والا واقع نہیں تھا۔ ایک عرصہ کے بعد جا کر مطلوبہ نتائج سامنے آتے ہیں۔

> لندن کی ایک رات کے تمام کردار شائد اسی کیفیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ نو آبادی کے لوگ ایک نہیں ہو سکتے سب کے خیالات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ لیکن کمیونزم کے خلاف شدت ہی ہمارے دل میں یہ خربہ پیدا کرتی تھی کہ ضرور کمیونزم کوئی اچھی چیز ہے۔۔۔[۸۸]

Divide and rule کے فارمولا کے تحت اشتراکیت کی بھی مخالفت کی جاتی رہی کیوں کہ دنیا بھر کے مزدوروں کے مسائل ایک جیسے تھے اور برصغیر میں بھی اگر کمیونزم اپنایا جاتا تو سامراج کو خطرہ لاحق ہو

جاتا اور وہ کسی صورت یک جہتی پیدا نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ مختلف پروپیگنڈوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اسے کسی طرح روکا جائے ورنہ برطانیہ میں بھی تو مزدوروں کا حال کچھ اچھا نہیں تھا اور برصغیر میں تو اور بھی حالات بُرے تھے بہر حال اشتراکیت نے نو آبادی کو جگانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا اور نو آبادی کو اپنے حقوق سے آگاہ کرنے میں بہت اہم نقاط سے پردہ اٹھایا اور پس منظر نو آبادی پر واضح کیا۔ نو آباد کار نے سب سے زیادہ اہمیت برصغیر میں لوگوں کے ذہن سازی پر دی کیوں کہ وہ ڈرائیور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے جب ڈرائیور ہاتھ میں ہو تو پوری گاڑی کو آپ اپنی مرضی سے موڑ سکتے ہیں۔ برصغیر کے لوگوں کی ذہن سازی میں اگرچہ زیادہ عرصہ لگ گیا اور کافی کچھ نو آباد کار کا خرچہ ہو گیا مگر وہ دور اور آج مابعد نو آبادیاتی دور سب وہی طریقہ چل رہا ہے اور وہ سانچے آج بھی بخوبی ذہن سازی کر رہے ہیں۔ اور ہم انہی سے نبرد آزما ہیں۔ برصغیر میں نو آباد کار نے ایک چال چلی وہ سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور سب سے پہلی بنیادی اینٹ ہے کہ مقامی لوگوں کو اپنی چیزوں، تہذیب و ثقافت کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا کر دو کلچر، ثقافت نو آباد کار نے سب چیزوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ ادنیٰ درجے کی چیزیں ہیں۔ اصل تہذیب و ثقافت تو گوری چمڑی والوں کی ہے اپنی سانولی، کالی رنگت کے بارے میں بھی ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے۔

> ان ہندوستانی لڑکوں کو آخر کیا ہو گیا؟ گورا چمڑا دیکھ کر انہیں اپنے اوپر بالکل قابو نہیں رہتا۔۔۔[89]

گوری لڑکیاں ان کالوں کی ترجیح ہیں خواہ کردار کے لحاظ سے وہ کیسی ہی ہوں کریمہ اسی بات کی وضاحت کرتی ہے اور ہندوستان سے جانے والے طالب علم ڈگری کے ساتھ اکثر و بیشتر ایک گوری بھی ساتھ بیاہ کر ہندوستان واپس لے آتے ہیں کردار شخصیت کچھ بھی نہیں آج بھی لوگ شہریت لینے کے لیے اپنوں کے مقابلے میں انہی کو ترجیح دیتے ہیں اپنا رنگ خواہ جیسا بھی ہو شادی کی خواہش کہ گوری سے، مابعد تناظر میں آج بھی دیکھ لیں کہ ہمارے لیے معیاری درجہ انہی کی جلد ہے اور انہی کی تقلید ہمارا فرض بنی ہوتی ہے۔

> یہ (شیلا گرین) بڑی آئی ہندوستان کی دوست بننے والی صرف ان لڑکوں کی خوشامد کے لیے کہتی ہے کہ ہمیشہ سے اسے ہندوستان سے دلچسپی ہے شرابی، سوز خور، کرسٹان ہمیں اس دوستی کی حقیقت خوب معلوم ہے۔[90]

سجاد ظہیر نے اگرچہ ناولٹ میں پردہ ہندوستان سے تعلیم کی غرض سے لندن میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا اُوڑھ رکھا ہے مگر بے اختیار اور بار بار اپنی اصل بات کی طرف پلٹتے ہیں اگرچہ سجاد

ظہیر کو احساس ہے کہ میرے اتنے واضح پیغام یا بات کہنے سے کیا کچھ ہو سکتا ہے مگر پھر بھی آزادی چاہنے والا غلامی کی زندگی سے تنگ اشتراکی سجاد ظہیر عالم لے کر اصل شکل کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ دوستی شیلا گرین کی اور اس پر کریمہ بات کرتی ہے گویا یہ نو آباد کار اور نو آبادی کا خود کلامی کے انداز میں مکالمہ ہے۔

نو آباد کار بار بار اونچی آواز سے چلاتا ہے کہ میں نو آبادی کا دوست ہوں خیر خواہ ہوں میں ہی امن قائم رکھے ہوئے ہوں ورنہ یہ نو آبادی تو آپس میں لڑ لڑ کر مر گئی ہوتی، میری وجہ سے تم آج دنیا کے منظر نامہ پر موجود ہو۔ غرض جس طرح ایک بے لوث دوست دوستی کا حق ادا کرتا ہے میں اس سے بڑھ کر کرتا ہوں اور کر رہا ہوں مگر نو آبادی (کریمہ) کو احساس ہے اگرچہ وہ کچھ کرنے سے قاصر ہے اس کے اپنے لوگ نو آباد کار سے ملے ہوئے ہیں نو آبادی کے سردار ان کے جوتے چاٹتے ہیں مگر وہ حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ دوستی کے پس پردہ ڈھونگ ہے بس اصل تو معاشی مقاصد اور مال و دولت کا حصول ہے مگر لبادہ اور اوڑھا جا رہا ہے حقیقت کچھ اور ہے۔ ظاہری منظر کچھ اور دیکھائی دے رہا ہے جس طرح کھڑے پانی پر سبزہ کی ایک تہہ جم جاتی ہے ہمیں تو صرف وہی تہہ دکھائی دیتی ہے اس تہہ کے نیچے کیا ہو رہا ہے وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے مہذب ہونے کے دعوے دار اندر سے کیسے ہیں تاریخ کے اوراق گواہ ہیں اور ان کی ترقی کی عمارت میں لگی بنیادی اینٹیں آج بھی برصغیر کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اگرچہ آگاہی کے باوجود کریمہ کچھ کرنے سے قاصر ہے مگر احساس ہو جانا بھی بہت بڑی بات ہے اور کریمہ ایک بہت بڑے گروہ کی نمائندہ ہے جو برصغیر میں موجود ہے یعنی دوستی کی قیمت سے آگاہ ہے کہ اس دوستی کی قیمت وہ اپنے تن کے کپڑے تک بیچ کر اور اپنے منہ کے نوالوں اور بچوں کے منہ سے نوالے چھین کر ادا کر رہے ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی اثرات کے تحت آج بھی برطانیہ نے اور دیگر غیر مسلم ممالک نے وہی دوستی کا لبادا اوڑھ رکھا ہے اور پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں امن قائم کرنا چاہتے ہیں اور اصل ان کی منزل آج بھی اپنے مقاصد کا حصول ہے کیوں پہلے وہ یہ سارے کام یہاں (برصغیر) میں بیٹھ کر کرتے تھے آج اپنے ملک میں بیٹھ کر ان نو آبادیوں کو کنٹرول کر رہے ہیں۔

برطانیہ کو کیا غرض تھی کہ وہ نو آبادی کو معیاری تعلیم دے کر اپنے راستے کی مشکلات پیدا کرے نو آبادی کی ایک طویل تاریخ ہے کہیں ایک بھی مثال موجود نہیں جہاں نو آباد کار نے صحیح ایمان داری سے تعلیم و تربیت پر توجہ دی ہو۔ یہی رویہ برطانیہ نے اپنائے رکھا صرف اپنا مقصد سامنے رکھا اور برصغیر کی ترقی اور معیار کا گراف نیچے کی طرف ہی رہا۔ نو آباد کار نے نو آبادی کو یہ بات باور کروادی اور ذہن نشین کروادی کہ

ان کا اپنا سارا کچھ انتہائی کم درج کا ہے اور نو آبادی کی تہذیب و ثقافت سب کچھ ہیچ ہے اگر اعلیٰ معیار پر کوئی تہذیب و ثقافت پوری اترتی ہے تو وہ صرف ہماری (برطانیہ) ہے اس وجہ سے بار بار ایک بات سامنے آئی کہ نو آبادی غیر مہذب ہے اور پھر نو آبادی کے کان میں یہ بات اتنی دفعہ ڈالی گئی کہ اس نے یقین کر لیا کہ ہاں جی ہم غیر مہذب، جاہل گنوار ہیں۔

شیلا گرین سے عارف کا یہ مکالمہ محض عارف کی بات نہیں اور نہ یہ کسی ان پڑھ کی بات ہے۔ پڑھے لکھوں کی کثیر تعداد یہ بات مان چکی ہے کہ ہمارا سب کچھ گھٹیا ہے اور اسے چھوڑ دینا ہی سب سے بہتر ہے اور قابل تقلید معیار کی کسوٹی پر پورا اترنے والا تو نو آباد کار کا ہے۔ یہ سب کچھ ایک خاص طریقہ کے تحت نو آبادی کی ذہن سازی کا نتیجہ تھا کہ آج بھی وہی قابل تقلید ہیں اور ہماری قوم انہی کی پیروی کرتی ہے مثالیں وہاں کی دی جاتی ہیں اور ہم بغیر اچھا بُرا سوچے ان کی ہر بات کو مان لیتے ہیں کیوں کہ وہ (برطانیہ) ایسی کوئی بات یا فیشن کر ہی نہیں سکتے جو اعلیٰ معیار پر پورا نہ اترتا ہو ایڈورڈ سعید، ڈی، کے فیلڈ ہاؤس کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

> سامراجی حاکمیت کی بنیاد نو آبادی کا ذہنی رویہ تھی اس کی جانب سے محکومیت کی قبولیت نے ایمپائر کو پائیدار بنایا۔۹۱

یہ بات نو آبادی کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے اپنی تہذیب، ثقافت، کلچر، یہاں تک کہ کھانا کھانے کے انداز تک کہ چھوڑ دیا۔ یہ سوال بہت اہم ہے کہ اپنا سب کچھ کیوں چھوڑ دیا۔ نو آباد کار کے لیے یہ کام اتنا آسان نہیں ہوتا کہ جاتے ہی ایک حکم کے ذریعے نو آبادی کے تمام کاموں اور چیزوں کو کالعدم قرار دے دیا جائے۔

دنیا میں ایسے خطے جہاں نو آبادیات کا نظام قائم ہوا اس تسلط سے پہلے بھی اگر نو آبادی کو دیکھا جائے تو وہ انتشار کا شکار ہو گی اور ایسے خطوں میں امن امان کی صورت حال خراب ہو گی۔ ایسی افراتفری کی صورت حال میں وہ پہلے سے ہی ایک عجیب ذہنی کشمکش میں آ چکے ہوتے ہیں اور یہ کہ کہ باقی کچھ بھی نہ رہے میری جان بچ جائے۔ جب نو آباد کار کے تسلط کو نو آبادی ذہنی طور پر قبول کر لیتی ہے تو نو آباد کار کے لیے اپنے تسلط کو طوالت دینے میں اور تسلط قائم رکھ کر اپنے مقاصد حاصل کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے یہی سب برصغیر میں ہوا آج بھی ہمارا اپنا کچھ بھی اچھا نہیں گوروں کا لائف اسٹائل اور سب کچھ قابل تقلید ہے۔ اور ہم اچھائی برائی کے تصور کو چھوڑ کر اندھا دھند تقلید کرتے جاتے ہیں اور کر رہے ہیں کیوں ہمارا رشتہ ہمارے ماضی سے

کاٹ دیا گیا ہے۔ آج بھی فیشن سے لے کر کھانے پینے تک ہم انگریزوں کی چیزوں یا جیسی انہوں نے پہن رکھی ہوں ویسی پسند کرتے ہیں یعنی اچھائی، برائی میں بھی ہم انہی کی پیروی کرتے ہیں۔

نو آبادی میں ایک محدود طبقہ موجود ہے جن کی کریمہ نمائندہ ہے جو ایک الگ طرز پر سوچتی ہے اور اپنی ایک رائے قائم کرتی ہے محض پیروی نہیں کرتی مگر معاشرہ میں ان لوگون کی تعداد خاصی کم ہے۔ کریمہ بات تو اپنی (برصغیر) اچھائیوں کی کرتی ہے مگر پڑھنے کے لیے وہ بھی وہیں برطانیہ میں گئی ہے اور سب دوستوں جن میں زیادہ لڑکے شامل ہیں ان کے ساتھ پارٹیوں میں جاتی ہے اور ان کے ساتھ کھاتی پیتی ہے ہاں ناچتی نہیں ''لندن کی ایک رات'' میں یہ بحث خاصی گرما گرم انداز میں کرداروں کے درمیان ہوتی ہے کہ کیا مغرب سے صرف اچھایاں لے لینی چاہیں یعنی صرف اچھی اچھی چیزیں ان کی تہذیب وثقافت سے لے لیں اور باقی جو برائیاں ہیں ان کو چھوڑ دیں۔

تہذیب کوئی بھی ہو اس میں ہم جزئیات کو دیکھ سکتے ہیں پرکھ سکتے ہیں مگر ان میں سے کوئی ایک چیزیں چن کر دوسری تہذیب ثقافت اور کلچر میں شامل نہیں کرسکتے، نہ ایسا کوئی تہذیب یا کلچر قبول کرتا ہے ہر تہذیب اپنا ایک خاص پس منظر رکھتی ہے اور مخصوص معاشرہ اور خاص کر یہاں جن دو تہذیبوں کی بات ہو رہی ہے ان میں تو ویسے زمین آسمان کا فرق ہے جو مکمل طور پر ناممکن ہے۔ اکبر نے کیا خوب کہا ہے؟
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر خوشی سے پھول جا۔

احسان اکبر کے شعر کا حوالہ دینا ہے کہ اب کلرکی بھی آسانی سے نہیں ملتی۔ احسان مایوسی کا شکار نظر آتا ہے اس شعر کے حوالے سے احسان دو باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ایک تو اپنا نظام تعلیم جو صرف کلرک پیدا کر رہا ہے اور کچھ بھی نہیں ایسا پیدا کر رہا جو کسی دوسرے شعبہ کے بارے میں زندگی میں کام آسکیں ایک ہی طرح کی پیداوار کب تک آگے کام آسکتی ہے۔ دوسری بات روحانیت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ چار دن زندگی ہے اتنا تردد اور محنت کر کے مقام حاصل کرنے کا کیا فائدہ فضول بیٹھے رہیں اور بغیر کام کیے وقت گزاریں۔ پہلے یہ تھا کہ کلرکی بھی پیٹ پالنے کے لیے مل جاتی تھی اب وہ بھی مشکل ہو گئی ہے کیوں کہ اسی تعلیمی نظام نے اتنے کلرک پیدا کر دیے ہیں کہ آگے کوئی ملازمت ہی نہیں۔ یہی روحانیت ہمیں لے ڈوبی اور زندگی میں کام اور محنت کرنے والی قومیں آگے نکل گئیں۔ بنیادی طور پر کساد بازاری کی دنیا میں احسان اپنے مستقبل سے مایوس ہے کہ میں پڑھ رہا ہوں مگر پڑھ کر میں کیا کروں گا مجھے کیا حاصل ہو گا۔ جب کہ ملک تو پہلے کلرکوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہیرن پال نو آبادی اور نو آبادکار کی سوچ کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

میں (ہیرن پال) بھلا کس طرح تم سے محبت کر سکتا ہوں ہم میں کون سی بات یکساں ہے میں کالا تم گوری۔ میں ہندوستانی تم انگریز، میں بت پرست تم عیسائی۔۔۔[۹۲]

شیلا گرین بھی اگرچہ اس بات کو بخوبی جانتی ہے اور اسے بچپن سے کالے لوگوں سے دور رہنے کو کہا گیا ہے اور یہ سب سے بڑی نصیحت اسے والدین کی طرف سے کی جاتی ہے کہ ان لوگوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے یہاں ہیرن پال پورے برصغیر کی نو آبادی کی بھرپور نمائندگی کر رہا ہے اور یہی حقیقت بھلی ہے کہ نو آبادی تو نو آباد کار کا مال ہے انسان، حیوان، مال، جائیداد سب انہی کا ہے مگر نو آبادی کا اپنا، اپنا نہیں تو پرایا کیسے اپنا ہو سکتا ہے اگرچہ چند نوجوان لندن سے ڈگری کے ساتھ ایک گوری بھی ساتھ لے آتے ہیں مگر وہ ہوتی نچلے طبقے سے ہے پھر بھی نو آبادی میں وہ شخص بلکہ خان دان سر اٹھا کر جی سکتا ہے اور یہ بات اس کے لیے قابل فخر ہوتی ہے۔

''لندن کی ایک رات'' کے وہ کردار جو نو آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں وہ اکثر و بیشتر سخت مایوسی کا شکار بھی نظر آتے ہیں اگرچہ چند ایک کے سوا سب کرداروں کا تعلق نو آبادی سے ہی ہے مگر پھر بھی ان میں امید کی رمک باقی ہے اور وہ اشتراکی انقلاب کے راستے سے ہوتے ہوئے آزادی کی منزل کو پانے کے لیے پر امید ہیں اور وہ جدوجہد کے لیے عملی طور پر میدان میں اترنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ ''توپ دم'' بھی تو کوئی علاج نہیں کیا اس طرح مسائل ختم ہو جائیں گے نہیں بلکہ عملی کام سے ہی مسائل کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے بیٹھ کر نہیں عملی طور پر مرد میدان بننے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہاں لوگ منہ سے صرف باتیں کر سکتے ہیں عملی زندگی میں کلرکی کرنا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے اور اسی کام کے لیے وہ کوششیں بھی کرتے ہیں۔ شیلا گرین پوری کوشش کرتی ہے کہ عارف کا اس کلرکی کی ذہنیت سے رخ موڑ کر اسے ادھر اُدھر کی تصویر بھی دیکھائی جائے مگر عارف اس کے لیے تیار نہیں۔

عارف کسی اور شعبہ کے لیے بالکل تیار نہیں اور گھر میں بچپن سے اس نے ایک ہی بات سنی ہے کہ آئی۔ سی، ایس اور اسی عہدے کے لیے اس نے تعلیم حاصل کی ہے۔ اشتراکیوں سے وہ نفرت کرتا ہے کیوں کہ وہ اس کے آقاؤں کو بھی ناپسند ہیں اور وہ کوئی ایسی چیز یا کام جو ان کو ناپسند ہو یہ کیسے اسے پسند کر سکتا ہے۔ ایک سطح تک عارف کی یہ بات درست ہے کہ ہندوستان میں واقعی یہ دوسری چیز ہے مگر شیلا گرین آقاؤں کے حوالے سے بات کر رہی تھی ہندوستان میں تو عام کلرک بھی اپنی نو آبادی کے لیے ایک بادشاہ ہے۔ اور آخر پر

اپنے آقا کا خاص بندہ ہر انہی خاص بندوں نے نو آباد کار کے لیے ہمیشہ آسانیاں پیدا کیں اور مقامی آبادی کو دبا کر رکھنے کے طریقے اور چالیس یہی لوگ بتاتے تھے۔

اس ساری کیفیت کے باوجود جہاں سجاد ظہیر مقامی لوگوں سے سخت مایوس ہے اور اس ناولٹ کے کردار جن کا تعلق یا ہمدردی مقامی آبادی سے ہے وہ مایوسی کا شکار ہیں مگر پھر بھی آزادی کی ایک کرن ہے جو دھند، بادل، کہر کو اپنے راستے سے صاف کرتے ہوئے زمین کو چھو رہی ہے اور لوگوں کو نظر آ رہی ہے اگرچہ اس کرن کی روشنی کم ہے کمزور ہے۔ ابتداء میں یہ منظر ہمیشہ دھند لکا ہوتا ہے۔ لوگوں کو کچھ نہ سمجھاتی دیتا ہے نہ انہیں کوئی سمجھ آتی ہے کہ اس دھند اور کم روشنی میں کس طرف راستہ ہے مگر پھر دوسری کرن پہلی کے ساتھ آکر ملتی ہے اور روشنی میں قدرے اضافہ ہوتا ہے اس کے بعد بہت سی کرنیں مل کر دن کا سماں پیدا کر دیتی ہیں۔ مگر اہمیت کے لحاظ سے اور فوقیت تو پہلی کرن کو ہی حاصل ہے جس نے اتنے گہرے اندھیرے میں اتنی اہمیت کی کہ وہ اس اندھیرے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے زمین پر پہنچی اگرچہ اس نے فنا کر لیا۔

۲۰ صدی کی ابتداء سے ہی اس قسم کے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ ایک کرن زمین تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی کوئی کام بھی اچانک نہیں ہو سکتا دنیا میں ایک خاص قسم کے حالات پیدا ہو گئے کہ دھند اور گھپ اندھیرا کے باوجود وہ کرن مدھم ہونے کے باوجود زمین تک آ رہی ہے۔ سجاد ظہیر بھی ایک وہی امید کی کرن دیکھ رہے ہیں اور ان کی دور اندیش نظریں ایک روشن صبح دیکھ رہیں ہیں اگرچہ وہ تقسیم کے حوالے سے نہ سہی مگر ایک آزادی جس میں تمام لوگوں کو بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں۔ پس پردہ اشتراکیت کا نظریہ کار فرما ہے۔ مگر حقوق تو حاصل ہوں نہ کام کرنے والے مزدور بھوکے تو نہ مریں محنت کے باوجود وہ اپنے اور اپنے بچوں کے کھانے کو تو نہ ترسیں جو اب ایک وقت کا بھی بہ مشکل مہیا ہو رہا ہے مگر اب وہ وقت قریب آ گیا ہے۔ جب یہ سارے حقوق جن کو زبردستی سلب کیا گیا ہے وہ دوبارہ سے حاصل ہو سکیں اور جو اپنا قیمتی اثاثہ کھو گیا تھا دوبارہ مل سکے۔ کیوں کہ غلط کام کا انجام ایک دن مٹ جانا ہوتا ہے اور ایمان داری کو ہی پائیداری حاصل ہے۔

> وہ (انگریز) اپنی اس دوسری قانونی خلاف ورزی سے بخوبی آگاہ تھے کہ انہوں نے اپنے لیے ایک دوسری سرزمین کو اپنی جائے مقام بنایا ہے جس سے انہیں غیر معملی دولت حاصل ہوتی ہ ہے اور یہ سرزمین وہ ہے جسے انہوں نے اس کے قدیم باشندوں سے با نفرت غصب کیا ہے۔[۹۳]

احساس نو آباد کار کو بخوبی تھا کہ ہم نے یہ کام غلط کیا ہوا ہے اور غلط طریقے سے دوسرے لوگوں پر اور ان کی چیزوں پر قبضہ کیا ہوا ہے اصل احساس تو نو آبادی کو ہونا اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا برطانیہ نے اپنی منشا سے اپنی نو آبادی (برصغیر) کو آزادی دی، نہیں یہ بات نہیں یہ وہ وقت تھا جب دنیا کے حالات و واقعات ایسے ہو گئے تھے کہ برطانیہ کو نو آبادیاں چھوڑ کر اپنے مرکز پر توجہ دینا پڑ گئی اور یہ ناممکن بن گیا کہ وہ اسی طرح نو آبادیوں کو بھی دبوچے رکھے اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک باز شکار کرتا ہے اور پنجوں میں اسے دبوچ لیتا ہے وہ اسے کھا بھی رہا ہے اور کافی باقی بھی ہے اتنے میں کوئی مشکل آ جاتی ہے۔ اب اپنی آزمائش میں اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا شکار پھینکنا پڑ رہا ہے کیوں کہ اپنی جان اہم ہے اور وہ کھا کر کسی حد تک سیر بھی ہو چکا ہے اور دوسری طرف شکار کے جسم سے اتنا گوشت نوچا جا چکا ہے کہ اس کا جینا مشکل ہو گیا ہے۔

۲۰ویں صدی ذرائع ابلاغ کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ دنیا کے ایک کنارے پر ہونے والے واقعات کی خبر پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ اس سے پہلے ایسا نہیں تھا اور نو آباد کار اپنے خلاف جانے والی خبروں کو دبا دینے میں کامیاب رہتے تھے مگر اب مقامی لوگوں کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ ہم کو لوٹ کر نو آباد اپنا گھر بسا رہا ہے یہ احساس ایک اور طاقت ور کرن تھی جو روشنی میں اضافہ کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئی۔

> جب ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کے خلاف تحریک چلی تو اس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اس نظام نے ہندوستان کو اقتصادی اور معاشی طور پر مفلس و غریب اور پس ماندہ بنا دیا ہے۔[۹۴]

لیکن میرے خیال میں بین الاقوامی سطح پر اس قسم کے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ برطانیہ کی نظریں نو آبادیوں سے ہٹ گئیں اور پہلے جس طرح کی مضبوطی سے تسلط قائم تھا وہ مضبوطی نہ رہی اور اس کے نتیجے میں مقامی لوگوں سے بھی لوگوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ پہلے والی دہشت جس سے لوگ دبے ہوتے تھے وہ بھی نہ رہی تو ایک مواقع مل گیا مقامی آبادی کو بھی کہ وہ آزادی کے لیے اپنی آواز بلند کریں اور اپنے حقوق جن میں آزادی سر فہرست ہے حاصل کریں۔

آزادی کی تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں تو نو آباد کار قطعاً اس حق میں نہیں تھا کہ برصغیر کو آزادی دی جائے اور یہاں کے وسائل کو خود مقامی لوگ استعمال کریں اور ترقی کی منزلیں طے کریں مفت ہاتھ آئی دولت

کو کون اتنی آسانی سے جانے دیتا ہے۔ مگر جب جسم کمزور ہو جاتا ہے اور بدن میں طاقت کم ہونے لگتی ہے۔ تو بازوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگتی ہے تو گرفت میں آئی ہوئی چیز نرمی دیکھ کر سر اٹھانے لگتی ہے برطانیہ کبھی اس آزادی کے حق میں نہیں تھا کہ اس خطہ کو خود مختار حیثیت دی جائے اور یہاں کے وسائل یہاں کے لوگ اپنی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کر سکیں۔ برطانیہ کو دو سطح پر نقصان اٹھانا پڑے ایک طرف منڈی ہاتھ سے نکل جائے اور دوسری طرف خام مال کا حصول مشکل ہو جائے۔ عارف اور وہ ایکٹریس لڑکی پارٹی (نعیم کے گھر) ایک ساتھ چھوڑتے ہیں اور ساتھ ساتھ چل رہے ہوتے ہیں سجاد ظہیر نا تو با آواز بلند آزادی کے حصول کا نعرہ لگانا چاہتے ہے مگر وہ دور پار کی نظر رکھتے ہیں اسے احساس ہے کہ کھلے الفاظ میں آزادی کی بات کے کیا اثرات ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک معمولی ایکٹریس سے ایک انتہائی اہم بات کرواتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ یہ بات عارف یعنی کوئی برصغیر کا کردار کرتا تو مسائل پیدا ہوتے مگر یہاں ایک گوری میم ایک بات کر رہی ہے۔ مختصر الفاظ میں برطانوی ڈوبتی کشتی کا احوال کمال مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔

> اس نے (انگریزی ایکٹریس) میوزم کے شیر وں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ذرا ان کو دیکھیے! آپ نے کبھی غور کیا ہے یہ شیر کتنے بوڑھے معلوم ہوتے ہیں جیسے ان کے منہ میں دانت ہی نہیں۔۔۔ یہ شیر برٹش امپیر لزم کے زوال اور اس کے بڑھاپے کی تصویر ہیں۔ ان کے چہرے پر وحشیانہ شان باقی نہیں رہی بلکہ سانپ کا زہریلا پن آ گیا ہے۔[۹۵]

شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے اور باقی تمام جنگلی مخلوق میں باقی کوئی بادشاہت کا دعوے دار نہیں ہوتا ، شیر ایک انتہائی طاقت ور جانور ہے لیکن کسی کی مجال نہیں کہ وہ شیر کے سامنے آ کر بات کر پائے یا شیر کا مقابلہ کر سکے بے شک سارے باقی جانوروں کی خواہش ہو کر وہ شیر کی جگہ لے لیں اور جنگل پر راج کریں مگر شیر کا سامنا کرنے کی کسی میں طاقت نہیں۔ برطانیہ، فرانس طاقت ور ملک تھے اور انہوں نے ایک مقصد کے لیے نو آبادیاں قائم کیں اور ایک طویل عرصہ ان نو آبادیوں کا استحصال کیا۔ اسی دور میں یہ ملک ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں۔

دنیا بھر میں ایک وقت ایسا تھا کہ برطانیہ کے سامنے ٹھہرنا کسی ملک کے بس کی بات نہیں تھی نو آبادیوں میں کبھی کسی کی جرت نہیں تھی کہ کوئی سر اٹھا سکے جس نے ذرا سر اٹھایا اسے وہیں بری طرح کچل دیا گیا اور اسے باقیوں کے لیے باعث عبرت بنا دیا یہ سر عام پھانسیوں کا سلسلہ اسی وحشت کو قائم رکھنے کی ایک کڑی تھی۔ بغاوت کے معاملے میں کبھی کسی کو کوئی رعایت نہیں دی جاتی تھی اور سخت سے سخت سزائیں نافذ

تھیں۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں ایسے کون سے حالات وواقعات رونما ہوئے جو ایک طاقت ور شیر (برطانیہ) کو اپنے پچھلے قدموں پر ہٹنے کو مجبور کر دیتے اور چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے تسلط کو مزید طوالت دینے سے قاصر ہو جاتا ہے اور شیر کی وہ پہلے والی شان و شوکت قائم نہیں رہ پاتی جو اس کا رعب دبدا تھا وہ بھی ماند پڑ چکا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء ہی جنگ عظیم اول سے ہوتی ہے اور چار سال تک مختلف ملک ایک دوسرے کے ساتھ آگ اور خون کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں اور کثیر تعداد میں انسان کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں امریکی کساد بازاری نے دنیا بھر کو متاثر کیا اور ابھی دنیا ان حالات میں سے گزر رہی تھی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ سپین کی خانہ جنگی بھی اسی ۲۰ویں صدی کے ابتدائی عشروں کا ہی واقع ہے سب سے بڑھ کر برصغیر کی تقسیم بالفاظ دیگر برصغیر کا خود مختار ہونا اور نو آباد کار سے جان چھوڑاتا۔ آسٹریا اور فرانسیسی پارلیمنٹ پر حملہ غرض اس صدی کے ابتدائی پانچ عشرے بربریت کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں دنیا میں امن وامان اور سکون ایک خواب بن کر رہ گیا ہے اقوام عالم کے اتحاد کا خواب ادھورا ہی رہ گیا ہے لیکن یہ صدی ہر چیز دنیا پر روشن کر دیتی ہے اور ہر چیز منکشف ہو جاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی بھی اپنے عروج کی طرف سفر شروع کرتی ہے اور لا علمی اپنا بوریا بستر گول کرتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں برطانیہ اس پوزیشن میں نہیں رہا تھا کہ وہ اپنا تسلط مزید برقرار رکھ سکے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان اور ہندوستان دو آزاد ملک معرض وجود میں آئے۔ پاکستان مملکت خداداد کہنے کو تو ۱۹۴۷ء میں آزاد ہو گیا مگر ایک ''ادھوری آزادی'' جسے ایک مکمل شکل اختیار کرنے میں ابھی کچھ اور وقت درکار ہے۔ اسی آزادی کا اگر مابعد نو آبادیات کے تناظر میں جائزہ لیں تو ایک وہ آزادی جس کا خواب ہم نے دیکھا تھا وہ ابھی تک خواب ہی ہے۔ اور اسے اب تک حقیقت کا روپ نہیں حاصل ہوا۔

> ۱۹۴۷ء میں برطانوی راج سے ملنے والی ادھوری آزادی کی قیمت مذہبی فسادات اور بربریت میں ذبح ہونے والے ۲۷ لاکھ افراد نے چکائی۔ یہ قتل عام کر کے حکمرانی کرنے کی سامراجی پالیسی کا ناگزیز نتیجہ تھا۔ جس کے لگائے گئے گھاؤ ابھی تک بھی نہیں بھر سکے۔ برطانوی سامراج نے جانے سے پہلے یقینی بنا کر براہ راست اقتدار کے خاتمے کے بعد بھی ان کے پیدا کیے گئے مقامی حکمران براجمان ہوں گے۔[۹۶]

مابعد نو آبادیاتی اثرات اور اس نظام کی پیدا کردہ مخصوص ذہنیت کا جائزہ آزادی کے بعد بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کیا ہم ابھی بھی انہی اثرات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا ان اثرات سے جان چھڑانا ناممکن ہے۔ دیگر نو آبادیاں بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔ یا کہ صرف پاکستانیوں میں ان اثرات کی سرائیت اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ابھی تک باقی ہیں۔ یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ساڑھے تین سو سال کے اثرات ۷۰ سال میں مٹائے جاسکیں۔ جیسا کہ اس بات کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ برصغیر میں برطانیہ نے اس طریقہ سے حکومت کی کہ مقامی حکمرانوں کو برقرار رکھا اور انہی کو زیادہ تر اپنے مفادات کے حصول کے لیے بطورآلہ کاراستعمال بھی کیا۔ یہ نو آباد کار کے لیے قدرے آسان طریقہ تھا کہ مقامی لوگوں کو ساتھ ملا کر اپنے ہداف حاصل کیے جائیں۔ اگر وہ گوروں کو مقامی مہروں کی جگہ متبادل کے طور پر استعمال کرتے تو سب سے بڑی رکاوٹ زبان کی بن جاتی کیوں کہ عام عوام میں شرح خواندگی بہت کم سطح پر تھی۔ دوسرا نو آبادی میں نو آباد کار کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوتا۔

اب ایک لمحہ کے لیے ہم واپس نو آبادیاتی عہد میں جاتے ہیں۔ کیا آج ہم اپنے وسائل خود استعمال کر رہے ہیں کیا ہم نے خام مال کو خود استعمال کرنا شروع کر دیا ہے نہیں آج بھی وہی نو آباد کار کے بنائے ہوئے ذہنیت رکھنے والے حکمران ہم پر مسلط ہیں اورآج بھی کپاس سمیت متعدد چیزیں ہم خام مال حالت میں ہی برطانیہ بھیجتے ہیں۔اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ برطانیہ کی ترقی میں برصغیر کا خون شامل ہے شیلا گرین اپنی جگہ پر مگر اس معمولی ایکٹریس کے الفاظ آج بھی صادق آتے ہیں۔ اگرچہ شیر نے دھاڑنا چھوڑ دیاوہ کمزور اور لاغر ہو گیا اپنی کچھار میں گوشہ نشین ہو گیا مگر اپنی تبدیل شدہ جون میں بھی اسی کی وحشت نے زاہر کا روپ اختیار کر لیا ہے اور سانپ کی زہر بھی وہی اثر کر رہی ہے جو پہلے شیر کی ہیبت کرتی تھی۔ مابعد اثرات میں زبان سمیت ہم آج بھی اسی نو آباد کار کی تقلید کر رہے ہیں۔ اس وقت بھی روپیہ مال ودولت برطانیہ منتقل ہوتا تھا آج بھی ویسا ہی ہو رہا ہے آپ کسی عمارت کی تزئین و آرائش کر کے ظاہری حلیہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا ڈھانچہ نہیں بدلا جاسکتا۔ ہمارا بھی ایسا حال ہے۔ کسی تخلیق کار کو عہد سے جدا کر کے نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس تخلیق کار کو مکمل طور پر جانچنے اور پرکھنے کے لیے اس کے عہد کا جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح کسی فن پارے کو مکمل طور پر جاننے کے لیے اسے اس کے عہد میں دیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے کہ اس درد میں کونسارویہ، رجحان یا تحریک چل رہے تھے اس درد کے غالب رجحانات کا جائزہ۔ وہ رجحانات کیسے پیدا ہو ئے کیسے انہوں نے عروج حاصل کیا۔

''لندن کی ایک رات'' کو بھی اسی طرح اپنے عہد سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس ناولٹ کا مکمل جائزہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اس فن پارے کی تخلیق کا عہد دیکھیں کون سی تحریک چل رہی تھی۔ کونسی سوچ پروان چڑھ رہی تھی۔ یہ ناولٹ اپنے عہد کا مکمل عکاس ہے۔ اپنے عہد کے تمام موضوعات کا احاطہ ''لندن کی ایک رات'' میں بخوبی کیا گیا ہے ایک طرف اس دور کا غالب نظریہ مارکسزم تھا دوسری طرف نو آباد کار سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ مارکسزم کے شعور کے تناظر میں آزادی کا حصول اپنے وسائل کے باہر منتقل ہونے کا احساس عرض ایک طرف نو آباد کار کے نو آبادی سے پیروکار تھے تو دوسری طرف آزادی پسند ''لندن کی ایک رات'' اپنے عہد کے تمام موضوعات کا بخوبی احاطہ کرتے ہوئے ان کو احسن انداز میں پیش کرتا ہے اور عوام میں آزادی کا شعور اور مزدوروں میں اپنے حقوق کی جنگ کا پرچار بخوبی کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد فیروز، ڈاکٹر، ''لندن کی ایک رات'' خصوصی مطالعہ اور تجزیہ حیات و خدمات سجاد ظہیر، ساقی بک ڈپو، دہلی، ص ۴۲

۲۔ ایضا، ص ۵۲

۳۔ ایضا، ص ٦۵

۴۔ علی احمد کاظمی، سجاد ظہیر ایک تاریخ، ایک تحریک، جوش اینڈ فراق لٹریری سوسائٹی، آلہ آباد، ۲۰۰٦ء، ص ۵۷

۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیاادارہ، ۱۹۷۴، ص ۱۰۴

٦۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور۔ ۱۹۹۳ء، ص ٦۷

۷۔ ایضا، ص ٦۰

۸۔ ایضا، ص ۸۱

۹۔ ایضا، ص ٦۲

۱۰۔ علی احمد کاظمی، سجاد ظہیر ایک تاریخ ایک تحریک، جوش و فراق سٹریری سوسائٹی۔ الہ آباد، ۲۰۰٦ء، ص ۵٦

۱۱۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات'' نیاادارہ، ۱۹۷۴، ص ۲۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۵۔ نصیر الدین، ڈاکٹر، سجاد ظہیر حیات و جہات، مظہر پبلی کیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۴۲

۱٦۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیاادارہ، ۱۹۷۴، ص ۸۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۹۷

۲۰۔ ایضاً ، ص ۳۹

۲۱۔ ایضاً ، ص ۶۱

۲۲۔ ایضاً ، ص ۶۲

۲۳۔ ایضاً ، ص ۶۳

۲۴۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور۔ ۱۹۹۳ء، ص ۶۲

۲۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، فلیپ، ص ا

۲۶۔ آصف فرخی، ''لندن کی ایک رات'' مضمون سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۵۸

۲۷۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، پاکستان رائٹرز کوپریٹو سوسائٹی لاہور، ص ۲۷۴

۲۸۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴،، فلیپ، ص ا

۲۹۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۹۳ء، ص ۵۵

۳۰۔ ایضاً، ص ۸۳، ۸۲

۳۱۔ ایضاً، ص ۸۴

۳۲۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اورآزادی کے تصورات، پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی، لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۳۷۴

۳۳۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، ۱۹۷۴، لاہور ص ۲۳

۳۴۔ ایضا، ص ۶۹

۳۵۔ سبط الحسن، مغنی آتش نفس، سجاد ظہیر، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۶ء ص ۲۵

۳۶۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۱۷

۳۷۔ ایضاً، ص ۶۸

۳۸۔ ایضاً، ص ۶۹

۳۹۔ سجاد ظہیر، مارکسی فلسفہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۹

۴۰۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۱۲۵

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۴۲۔ ایضاً، ص۱۴۷

۴۳۔ ایضاً، ص۱۲۹

۴۴۔ عتیق اللہ، ''لندن کی ایک رات'' ایک نو آبادیاتی مطالعہ، مضمون، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء، ص ۷۲

۴۵۔ سبط الحسن، مغنی آتش نفس، سجاد ظہیر، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱۰

۴۶۔ سجاد ظہیر، مضامین ظہیر، اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ، ۱۹۷۹ء ص ۲۲

۴۷۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ لاہور، ۱۹۷۴، ص ۱

۴۸۔ ایضاً، ص ۱

۴۹۔ ایضاً، ص۹

۵۰۔ آصف فرخی، ''لندن کی ایک رات''، مضمون سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص۶۸

۵۱۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص۴۶

۵۲۔ ایضاً، ص۲۱

۵۳۔ ایضاً، ص۲۳

۵۴۔ ایضاً، ص۴۷، ۴۳

۵۵۔ ریاض ہمدانی، ڈاکٹر، اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۲۵۷

۵۶۔ ایضاً، ص۶

۵۷۔ سبط الحسن، مغنی آتش نفیس، سجاد ظہیر، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۸۵

۵۸۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۱۰

۵۹۔ ایضاً، ص۶

۶۰۔ ایضاً، ص۵۳

۶۱۔ ایضاً، ص۲۱

۶۲۔ عتیق اللہ، ''لندن کی ایک رات''؛ ایک نو آبادیاتی مطالعہ، مضمون، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۷۵

۶۳۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیاادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ، ص ۷۰

۶۴۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی، لاہور ۲۰۰۶ء ص ۲۷۴

۶۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیاادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۲۰

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۰

۶۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۶۸۔ عتیق اللہ، "لندن کی ایک رات" ایک نو آبادیاتی مطالعہ مضمون، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، گوپی چند نارنگ، ص ۴۷

۶۹۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیاادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۲۲

۷۰۔ ایضاً، ص ۲۲

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۸

۷۲۔ کمال احمد صدیقی، "لندن کی ایک رات"، مضمون، سجاد ظہیر ادبی خدمات اردو ترقی پسند تحریک، گوپی چند نارنگ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸، ص ۸۳

۷۳۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیاادارہ، لاہور ، ۱۹۷۴، ص ۵۲

۷۴۔ آصف فرخی، لندن کی وہی ایک رات، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۶۸

۷۵۔ ایضاً، ص ۶۸

۷۶۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیاادارہ، لاہور ، ۱۹۷۴، ص ۱۱۴

۷۷۔ خالد مسعود، ڈاکٹر، برطانیہ کی طرف سے برصغیر کی تعلیمی ڈھانچے کی تباہی اور اس کا سائنسی زوال، Magazeen.com ۱۴جولائی ۲۰۱۸ء

۷۸۔ ایضاً ۱۱:۲۵ am

۷۹۔ ایضاً، ۱:۰۰ PM

۸۰۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیاادارہ، لاہور ، ۱۹۷۴، ص ۵۱

۸۱۔ ایضاً، ص ۲۵

۸۲۔ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳، ص ۳

۸۳۔ ایضاً، ص ۴

۸۴۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۵۱

۸۵۔ ایضاً، ص ۵۰

۸۶۔ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی ۲۰۱۳ء ص ۶

۸۷۔ ایضاً، ص ۴

۸۸۔ سجاد ظہیر، طویل اور مسلسل سفر کی کہانی، (مضمون) سجاد ظہیر، شخصیت اور فکر، ڈاکٹر سید جعفر احمد، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۴

۸۹۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۵۳

۹۰۔ ایضاً، ص ۵۴

۹۱۔ ایڈورز سعید، ثقافت اور سامراج، مترجم، یاسر جواد، مقتدرہ قومی زیاد، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء ص ۲۴

۹۲۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۱۲۲

۹۳۔ عتیق اللہ، ”لندن کی ایک رات“، ایک نو آبادیاتی مطالعہ (مضمون) سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۴۷

۹۴۔ مبارک علی ڈاکٹر، برطانوی راج، تاریخ، پبلیکیشنز، لاہور ۲۰۱۶ء، ص ۱۶

۹۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۹۴

۹۶۔ لال خان، برصغیر پاک وہند کے بحران اور تنازعات، www.struggle.pk، ۲۱ جولائی ۲۰۱۸ء A.M۶ :۳۰

باب سوم:

"لندن کی ایک رات" کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ

(نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی حوالہ سے)

الف) لندن کی ایک رات کے کردار، نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تناظر میں:

ایک معاشرہ مختلف لوگوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے جس طرح ایک معاشرہ میں افراد کی اہمیت ہوتی ہے اسی طرح مختلف اصناف ادب کے لیے کردار بھی ضروری ہوتے ہیں۔ کرداروں کے بغیر ناول یا ناولٹ کے لیے وجود برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ داستانوی ادب میں کردار عموماً دو اقسام پر مشتمل ہوتے تھے ایک قسم جن کا تعلق ان دیکھی دنیا سے ہوتا ہے۔ دوسرا جن کا تعلق سامنے کی دنیا ہوتا ہے یعنی انسان۔ کردار ہی کہانی آگے لے کر چلتے ہیں اور وہی اسے اپنے قول و فعل کے ذریعے انجام تک لے جاتے ہیں کردار ناول، ناولٹ، داستان، افسانہ غرض ہر کہانی میں بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد کردار ہی کہانی، واقعات کو بنتے ہیں۔

ناولٹ بھی چونکہ کرداروں کے ذریعے منظر عام پر آنے والی کہانی ہے اس لیے اس میں بھی اچھے خاصے کردار جگہ پاتے ہیں۔ جو کہانی کی ابتداء، نقطہ عروج اور پھر آخر میں اختتام کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہر کردار اپنا مخصوص کام سرانجام دیتا ہے۔ ایک کردار اپنا کام خود کرتا ہے وہ نہ کسی دوسرے کردار کا متبادل ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اس پہلے کی جگہ پر آسکتا ہے ایک دفعہ جس کردار کا جیسا تعارف ہو گیا آخر تک وہی رہے گا۔ ہاں مگر ارتقائی صورت میں اس میں کچھ حد تک تبدیلی واقع ہو سکتی ہے یا یہ کہانی نویس پر ہے کہ وہ کس طرح کردار کو ارتقائی عمل سے گزارتا ہے۔ سب سے زیادہ اہمیت خود کہانی (واقعات) کو حاصل ہے کہ اُسے ہمارے آس پاس سے ہونا چاہیے اس کا تعلق ہمارے معاشرہ سے ہو۔ کوئی دور پار ان دیکھی دنیا کی کہانی (داستان) ۲۰ ویں صدی میں بے اثر ہو چکی ہے۔ جو کہانی (واقعات) جتنے ہمارے قریب ہو گی، ہماری دیکھی ہوئی دنیا سے اس کا تعلق ہو گا، اس میں ہماری دل چسپی اور اثر پزیری زیادہ ہو گی۔

اسی طرح اس کہانی کے کرداروں کو حقیقت کے قریب ترین ہو کر اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے اور وہ کہانی کو اس طرح اپنے اوپر اوڑھ لیتے ہیں، اس میں کھو جاتے ہیں کہ ہمارے جذبات و احساسات بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ اور ہم ناظر سے بڑھ کر اس کہانی میں خود کردار بن جاتے۔ کردار ہمیشہ دو سطح پر عمل

کر رہا ہوتا ہے ایک اس کا ذہنی عمل ہے جو بنیادی اہمیت حامل ہے دوسرا ذہنی عمل سے ہی منسلک خارجی عمل ہوتا ہے۔ جس کو عام ظاہری آنکھ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ داخلی اور خارجی عمل مل کر کردار کو مکمل شکل دیتے ہیں۔ کرداروں کو منظر عام پر لانے اور کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے مکالموں کی ضرورت پڑتی ہے اور تخلیق کار کو چاہیے کہ وہ جس کردار سے جو مکالمہ ادا کروائے وہ اس کے حسب حال ہونا چاہیے اور وہ بات کہانی اور کردار کو صحیح طور پر ابھارنے میں مدد دے نہ کہ الٹا الجھاؤ کی کیفیت پیدا کرے۔

ناولٹ بھی ایک کہانی پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا تعلق زندگی کی حقیقتوں کے بہت قریب سے ہوتا ہے کوئی فرضی کہانی سامعین اور ناظرین کے جذبات پر قابو اس وقت تک نہیں رکھ سکتی جب تک اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح زندگی کی حقیقت سے نہ ہو۔ ناول نگار یا تخلیق کار خود تو ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا اور نہ وہ کچھ کہہ رہا ہوتا ہے یہ کردار ہی ہوتے ہیں جو تخلیق کار کے خیالات کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ کردار کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ادا کرتے جو تخلیق کار کے خیالات سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

تخلیق کسی تخلیق کار کے لیے مختلف طرح سے منسلک ہوتی ہے ایسا کیسے ممکن ہے کہ فن پارا اپنے مصنف کا ترجمان نہ ہو تخلیق کار کو تخلیق سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ میرے خیال میں مصنف کی نفی کرنا مناسب نہیں۔ کردار مصنف کی منشا کے مطابق اپنا حصہ ڈالتے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھائے جاتے ہیں۔ سامعین و ناظرین کے احساسات و جذبات کرداروں کے احساسات و جذبات بن کر سامنے آتے ہیں اور کردار کی تکلیف اور مشکل قاری کی مشکل بن جاتی ہے اور وہ اس سے ہمدردی محسوس کرتا ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' میں بھی جہاں پانچ، چھ کہانیاں بیک وقت ساتھ ساتھ چل رہی ہوتی ہیں۔ وہیں خود سجاد ظہیر کا مقصد جو یہ ناولٹ لکھنے کا تھا وہ ایک الگ کہانی ہے جس طرح ہر لکھنے والے کی مخصوص ذہنیت ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ مقاصد بھی تخلیق کار کے نہ چاہتے ہوئے بھی تخلیق میں در آتے ہیں اور ان کی جھلک جابجا دیکھی جا سکتی ہیں۔ سجاد ظہیر نے بھی ''لندن کی ایک رات'' میں دنیا اور برصغیر کے پس منظر اور پیش منظر کے تناظر میں کرداروں کو مناسب ترین ''role'' دیا ہے۔

کرداروں کے زیر و بم سے ہی کہانی کی خوبصورتی اور حسن ہوتا ہے اور تخلیق کار آسانی کے ساتھ اپنے نظریات کو بھی واضح کر سکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنی مرضی کے کرداروں کو زبان و الفاظ دے کر اپنی بات ان کی زبان سے کہلوا دے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہوتا بلکہ کردار ہی تخلیق کار کی مہارت کے گواہ ہوتے ہیں۔ کردار عموماً زیادہ تر ۲ قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ''پیچیدہ'' یہ وہ کردار ہوتے ہیں۔ جو حالات و واقعات کے ساتھ

ساتھ بدلتے ہیں۔ با الفاظ دیگر ان میں ارتقاء پایا جاتا ہے اور دوسری قسم کے کردار وہ ہوتے ہیں جن کو ہم ''سپاٹ'' کردار کہہ سکتے ہیں جو پورے ناولٹ یا کسی کہانی میں ایک ہی طرح کے رہتے ہیں اور ان میں شروع سے آخر تک کوئی تبدیلی نہیں ہوتے۔

> ناول(لندن کی ایک رات) کے کردار رومان زرہ۔ انٹلکچول جو شیلا انقلابی، اقتدار پرست آئی۔ سی۔ ایس ہیں عشق زادہ انگریز معشوقہ وغیرہ وغیرہ بڑی آسانی سے فرسودہ ٹائپ بن سکتے تھے لیکن ناول نگار کے نفسیاتی شعور اور مشاہدے نے انہیں بچا لیا۔[۱]

''لندن کی ایک رات'' کے کردار اپنے عہد کے بخوبی عکاس ہیں اور نو آبادیاتی،مابعد کی مخصوص ذہنیت کا عکس جگہ جگہ عیاں ہوتا ہے۔ اس ناولٹ میں مختلف قسم کے کردار موجود ہیں اُن میں جدت پائی جاتی ہے۔ سجاد ظہیر جوں کہ خود اشتراکیت کے نظریہ سے وابستہ تھے یہ نقطہ نظر بھی کرداروں میں نظر آتا ہے کیوں کہ اپنے دور میں یہ نظریہ (مارکسزم) مقبول ترین نظریہ تھا۔ کردار ایک قسم کے تو باقاعدہ اس نظریہ سے وابستہ اور اس کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ دوسرا کردار اپنی سرزمین سے وابستہ اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ ایک قوم (انگریز) جو سمندر پار سے آکر ان پر مسلط ہے۔ اس سے بھی چھٹکارا چاہتے ہیں۔ اپنی سرزمین کو آزاد کروانا چاہتے ہیں۔ اور خود یہاں آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ اور چند ایک گورے کردار بھی ہیں۔ جو یہ احساس رکھتے ہیں کہ ہم کسی دوسری جگہ سے لوٹ مار کرنے کے لیے مسلط ہیں۔

> زمان ومکان کے متنوع کرداروں کا اجتماع بذات خود ایک کارنامہ ہے اس کے علاوہ اسی ایک رات میں لندن کی عام زندگی کی بھی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔[۲]

''لندن کی ایک رات'' میں مختلف قسم کے کردار ہیں۔ جو اپنا اپنا کردار بخوبی ادا کرتے ہیں۔ ایک ناول طویل وقت پر مشتمل ہوتا ہے اور اس طوالت کی وجہ سے اس میں ایک تنوع کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں زمان و مکان کی صورت حال اپنی جگہ ایک وسعت رکھتی ہے اگرچہ یہ ناولٹ ایک رات کے کچھ حصہ پر مشتمل ہے اور لینڈ لیڈی کی دھمکی پر یہ پارٹی ختم کر دی جاتی ہے۔ پھر بھی اس ناولٹ میں زمان ومکان کی وسعت کا ایک اپنا وسیع دائرہ کار ہے۔ اور مختصر ہونے کے باوجود ایک وسعت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ہر کردار اپنا حصہ احسن طریقے سے ڈال دیا ہے۔ مختلف تکنیک کی وجہ سے کوئی کردار بھی زیادہ وقت نہیں منظر پے رہتا، اس سے ایک تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس کم وقت

میں بھی سجاد ظہیر کردار کو ڈھیل دینے کی بجائے جلد اپنے مقصد پے لے آتے ہیں۔ مختصر وقت کے باد جود اپنا حصہ بخوبی ادا کرتا ہے۔

> لندن کی ایک رات کے کردار اپنی اپنی جگہ مکمل ہونے کے باوجود ایک وسیع تر نظام کا حصہ ہیں۔[۴]

کردار پوری کہانی کی جان بن کر کہانی کو آگے لے کر چلتے ہیں اور انہی کرداروں کے ذریعے اوران کے منہ سے نکلنے والے مکالموں سے ہی کہانی میں جان آتی ہے بظاہر پردہ سکرین پر نظر آنے والی تصور میں اگر دیکھیں تو ''لندن کی ایک رات'' انگلستان میں بغرض تعلیم مقیم ہندوستانی طالب علموں کی کہانی ہے اس ناولٹ میں ایک وقت میں ایک کہانی پردہ سکرین پر چل رہی ہوتی ہے۔ اور دوسری پس پردہ بالکل پہلی کے مساوی دوسری کہانی بھی چل رہی ہوتی ہے اور یہی سجاد ظہیر کا کمال ہے کہ ''انگارے'' کی طرح کے حشر سے بچنا ضروری تھا اس لیے وہ سامنے کہانی جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور دوسری کہانی جس کو ہم محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کہانیاں کمال مہارت سے ایک ساتھ چل رہی ہوتی ہیں۔

> سجاد ظہیر نے تمام کردار اس طرح پیش کیے ہیں کہ ہم ان سے الجھتے نہیں بلکہ ان سے ہمدردی ہو جاتی ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ اجنبی نہیں بلکہ ہم میں سے ہیں۔۔''

تمام کرداروں کو سجاد ظہیر نے اس مہارت سے پیش کیا ہے کہ واقعی ہم ان کو اپنے آس پاس کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور ہمارے جذبات اُن کے جذبات کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ غیر قوم کے آدمی سے بھی ایسا مکالمہ ادا کروایا کہ ایک غلام قوم کے آدمی سے بھی ہمدردی ہو جائے اور وہ اس کی بات سننے کو تیار ہو جائے تمام کرداروں کو بخوبی ایک لڑی میں پیرو دیا ہے۔ کہ وہ حسب حال ہو گئے ہیں۔

> کہانی صرف کرداروں کی موجودگی کی وجہ سے نہیں ان کے باہمی ربط، ان کی دوستی دوشمنی ایک دوسرے کی تفہیم، عدم تفہیم، ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی دو طرفہ کوششوں سے وجود میں آتی ہیں۔[۵]

درج بالا اقتباس کی روشنی میں ''لندن کی ایک رات'' کے کرداروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ سب خوبیاں یہاں نظر آتا ہے جہاں تک ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی بات ہے تو یہ اس ناولٹ میں زیادہ ہے۔ کیونکہ اکثر کردار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں نا تو ان کا تعلق ایک جگہ سے ہے اور نہ

تربیت ایک جیسی ہے۔ سب کردار ایک پارٹی میں جمع ہے اور وہ باہمی تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو رد و قبول کر رہے ہیں۔

تہذیب و ثقافت کے حوالے سے کرداروں کا جائزہ لیں تو تمام کردار دوہری شخصیت (مشرق اور مغرب میں بٹے ہوئے) کے حامل نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان سب کا پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دوسرا ان کی سوچ باہم نہیں ملتی۔ سجاد ظہیر نے اس مختصر وقت کے ناولٹ میں فنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام کرداروں کو جسمانی لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ اگرچہ ذہنی لحاظ سے قطعاً وہ ایک دوسرے کی سوچ سے مختلف سوچتے ہیں اور ان کا طرز زندگی بھی مختلف ہے۔ اشتراکیت کے حوالے سے ''لندن کی ایک رات'' میں کردار خاص طور پر احسان دوسروں پر اثر انداز ہونے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ سجاد ظہیر خود اشتراکی نظریہ سے وابستہ تھے۔ اور اسی عہد اور اس خاص ذہنیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ فاشٹ نظریہ ان کے خون میں شامل ہو چکا تھا تو اس حوالے سے وہ خاص تبلیغ کرنے والے کردار سامنے لاتے ہیں۔ جو لوگوں کو اشتراکیت کی اہمیت و افادیت بتاتے ہیں اور لوگوں کو ہم خیال بنا کر ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک مختصر ناولٹ سے تخلیق کار (سجاد ظہیر) نے خاص کام لیا ہے۔ تخلیق کار کی شخصیت شعوری یا غیر شعوری طور پر تخلیق میں شامل ہو جاتی ہے اور اس تخلیق میں مصنف کی جھلک اور اُس کے خیالات کی جھلک ہم جابجا دیکھتے ہیں تخلیق کار کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہوتا وہ بھی اپنی زمین سے جڑا ہوا ہوتا ہے اور اس کے احساسات و جذبات اپنی سر زمین سے ہی وابستہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کے خون میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں چلا جائے مگر ذہنی طور پر وہ اپنی زمین سے جڑا رہتا ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' کے تمام کردار طالب علم ہیں چند ایک مزدور جو نو آباد کار کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے سجاد ظہیر فرانسیسی رجعت پسندوں کا فرانسیسی پارلیمنٹ پر حملہ اور آسٹریا میں اشتراکی واقعات کے بارے میں ''یادیں'' لکھتے ہیں۔

> ہمیں محسوس ہونے لگا کہ فاشیٹ کی گو آج جیت ہوئی ہے لیکن دوسری طرف محنت کشوں کا انقلابی شعور بڑھ رہا ہے انہیں ناکامیوں کا تجربہ کامیاب انقلاب کو ممکن بنائے گا۔[۲]

سجاد ظہیر بچپن سے اشتراکیت سے واقف ہوئے اور ابتدائی دور میں گھر کا ماحول ایسا تھا کہ ان کے والد کے پاس مختلف سیاسی رہنماؤں کا آنا جانا رہتا اور یہ ان کی باتیں سنتے اور وہ باتیں ان کے ذہن نشین ہوتی

گئیں ہم واضح الفاظ میں یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ''لندن کی ایک رات'' محض طالب علموں کی زندگی کی پیش کش نہیں ہے۔ بلکہ کچھ اور ہے جس طرف وہ ہمارا ہاتھ پکڑتے ہیں اور منزل کی طرف راہ دکھا رہے ہیں۔نفسیاتی لحاظ سے احسان بھی متشدد ہے، کیوں کہ اشتراکیوں کو خونی انقلاب سے تبدیلی چاہیے جس میں ملک کے ایک طبقہ کو گوارہ ہی نہیں کیا جاتا۔انہیں قتل کر دیا جاتا ہے مثلاً انقلاب روس۔

> اتنے واضح اقرار اور سوشلزم کی نئی راہ اپنانے کے عزم کے واضح اعلان (یادیں میں درج اہم خیالات جو سجاد ظہیر نے اشتراکیت اور مزدور یونین کے حوالے سے کیے) کے بعد یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی اس قسم کا سوال ضرور کیا جائے کہ ان حقائق کے بعد کے لندن کی ایک رات میں سجاد ظہیر صرف اور محض ہندوستانی طالب علموں کی عیش پرستانہ اور بے پروانہ زندگیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھانا چاہتے تھے۔[۷]

''لندن کی ایک رات'' میں ایک طرف رد استعماریت ہے تو دوسری طرف عام عوام اور مزدوروں کے حقوق کی بات کی گئی ہے نو آبادیاتی عہد میں بے حال نو آبادی عجیب زندگی اور موت کی کشمکش میں بستر مرگ پر پڑی ہے اور اسے صرف اتنا کھانا دیا جارہا ہے کہ جس سے اس کے سانس بحال رہیں خون، گوشت تو مسلسل نوچا جارہا ہے ایک طرف یہ نو آبادی کے نمائندہ کردار مخصوص اشتراکی سوچ اور نو آباد کار سے نفرت کی ذہنیت کے حوالے سے موجود ہیں تو دوسری طرف ہر کردار کا ایک دوسرا رخ عشق بھی ہے۔ ہر کردار اپنی مخصوص مشرقی ذہنیت کے دائرہ کار میں عشق لڑارہا ہے۔ عشقیہ و دیگر کہانیاں اپنی جگہ پر مگر اپنے عہد کے مطابق تمام کردار نفسیاتی طور پر منقسم ہیں۔

> ان میں سے ہر کردار کے ساتھ کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی عشق کی کہانی وابستہ ہے۔ یہاں (لندن) چلتے پھرتے فٹ پاتھوں پر گلیوں میں گلیوں میں اس قسم کے مناظر عام ہیں۔۔۔[۸]

''لندن کی ایک رات'' میں پردہ سکرین پر سب سے پہلے جو کردار نمودار ہوتا ہے وہ اعظم جو نفسیاتی طور پر ایک الجھا ہوا کردار ہے اس کے ساتھ بھی ایک طرف عشق کی کہانی جڑی ہوتی ہے تو دوسری طرف ذہنی الجھن نو آباد کار سے نفرت اور اپنے خیالات کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اعظم تعلیم کے سلسلے میں لندن میں مقیم ہے اور میٹرو اسٹیشن پر جین کا انتظار کر رہا ہے۔

اعظم جو شاعرانہ مزاج رکھتا ہے وہ رہتا مغرب میں ہے۔ لیکن خواہش رکھتا ہے کہ ہر
لڑکی مشرقی آداب عشق میں رچی بسی ہو۔۔۔[۹]

اعظم کا تعلق بر صغیر سے ہے اور وہ خود کو اس تعلق سے جدا نہیں کر سکتا۔ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت یہاں (بر صغیر) ہوئی ہے اور اب لندن سے تو ایک ہی ڈگری لینے آیا ہے۔ اعظم کے کردار کا وہ رخ جس میں وہ عاشق ہے وہ خالص ہندوستانی مشرقی اور روایتی قسم کا ہے۔

اعظم اس عشق میں خود فریبی کا شکار ہے اور بار بار اپنے آپ کو ایدھر ادھر کی مثالیں دے کر تسلی دیتا ہے کہ یہ بھی بے عزتی کی بات نہیں یہ بھی نہیں اعظم اردو شاعروں کی مثالیں دیتا ہے اور اس بات سے وہ دل کو تسلی (داخلی خود کلامی سے اپنے آپ کو) دیتا ہے کہ شاعر بھی تو میرے ساتھ ہی ہیں میں ان عشق کی راہوں میں زلیل ہونے والا کوئی اکیلا تھوڑا ہوں۔ کوئی بھی ایک کام جو ایک انسان کر رہا ہوتا ہے وہ اکیلا ہونے کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے اور ایک کام جو شاعر بھی کرتے آرہے ہیں۔ اور ساتھ اعظم بھی شامل ہو گیا ہے تو کوئی عجب بات نہیں ہوئی یہ تو ایک تسلسل سے کام ہو رہا ہے اور اعظم اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

میری (اعظم) آواز میں بجائے غصہ کے گڑ گڑہٹ آگئی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا میں
محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنے آپ کو ذلیل کر رہا ہوں۔[۱۰]

اعظم کے کردار کا یہ رخ روایتی مشرقی عشق و عاشقی پر مشتمل ہے، اسے جین مسلسل نظر انداز کر رہی ہے مگر وہ مشرقی عاشق کی طرح بے بسی کی تصویر بنا ہوا ہے اور یہ عشق میں ذلیل ہونا ایک معمولی بات سمجھتا ہے اعظم کوئی اکیلا اس عشق کی نگری کا مسافر ہے (یہ سوچ کر وہ اپنے دل کو تسلی دیتا ہے)۔ اگر شاعر کوچہ جاناں کے کتے بن کر اور محبوب کے ناز نخرے اٹھا کر الٹا خوش ہوتے ہیں، تو مجھے ایسا کرنے میں کیا حرج ہے (یہ خالص مشرقی ذہنیت ہے)۔ اور ایک چیز جس کو خودداری کہتے ہیں اس نگری میں نہیں ملتی۔

اعظم مغرب میں رہتے ہوئے بھی عشق کے معاملے میں اس کے تقاضے وہی روایتی مشرقی عاشقی کے ہیں اور مغرب کے معاشرہ کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں دیکھائی دیتا۔ بار بار ایک بات جو وہ سوچتا ہے کہ وہ کسی اور سے عشق لڑا رہی ہو گی۔ اس کے پاس پیسے زیادہ ہوں گے اس کے پاس گاڑی ہو گی یہ ساری باتیں مشرقی ذہنیت کی عکاس ہیں۔ اور اس روپ میں یعنی عاشق کے روپ میں اعظم پر مغرب (لندن) کا کچھ اثر نہیں ہے اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی ہے۔

اعظم مشرقی روایتی عاشق کی طرح اپنی محبوبہ جین کا انتظار کرتا ہے محبوبہ کی یاد میں
تڑپنے، ٹونے بہانے شک اور رشک کی ملی جلی کیفیت ہے۔ [۱۱]

مشرق اور مغرب میں ایک طویل خلیج حائل ہے بہت سی چیزیں ایک طرف صحیح تو دوسری طرف غلط اس تہذیبی، ثقافتی روایات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اعظم کا یہ عمل مشرق میں قابل مذمت اور باعث شرم ہے مغرب میں ایسا نہیں۔ مغرب میں لڑکی لڑکے کے لیے ایک کو چھوڑ کر دوسرے سے تیسرے عشق لڑانا معمولی کام ہے مگر مشرق میں یہ ایک مختلف نوعیت کا ہے۔ اعظم کی نظر اخبارات کی سرخیوں پر پڑتی ہے تو وہ اپنے وطن کی حالت پر بہت پریشان ہو جاتا ہے۔ نو آبادکار کے ظلم و جبر اور نو آبادی کے جان کی قدر و قیمت جان کر وہ پریشان ہوتا ہے کیوں کی مستقبل قریب میں اسے کوئی چھٹکارے یا امید بھی نظر نہیں آرہی جسمانی لحاظ سے تو وہ مغرب (لندن) میں ہے مگر ذہنی لحاظ سے اور جذبات اس کے ہندوستان سے وابستہ ہیں۔ اگر وہ "ہندوستان میں گڑبڑ" کی خبر سن کر مایوسی کا اظہار کرتا ہے اور ظاہر طور پر کہتا ہے کہ دفعہ کرو مجھے ان معاملات سے غرض نہیں۔ لیکن سب سے زیادہ غرض اور فکر اسی کو ہے۔

اعظم چاہتا ہے کہ جلدی سے غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکوں اور میرا وطن آزاد ہو مگر ایسا ہوتا ہوا اسے نظر نہیں آرہا۔ آگے چل کر وہ راؤ سے ان معاملات پر سیر حاصل گفتگو کرتا ہے مگر "پب" میں اور پہلے راؤ کی بات کو سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔

وہ (راؤ) لڑکی کے انتظار کو ہندوستان کی سیاست پر اپنی جھنجھلاہٹ اور آزودگی کو
Transfrom کر دیتا ہے اردو ناول کا موڈ اپنی مخصوص آہستگی کے ساتھ عشقیہ کیفیت
سے سیاسی حالات کی طرف مڑ جاتا ہے۔ [۱۲]

اعظم کی جھنجھلاہٹ میں کی گئی باتیں جس میں وہ ہندوستان سے لاتعلقی اور بے رخی کا اظہار کرتا ہے اس کا حقیقت سے تعلق نہیں اصل میں وہ فکر مند ہے اور ذہنی طور پر اس نے نو آبادکار کی اس غلامی کو قبول نہیں کیا اور وہ آزادی کا خواہاں ہے کہ ان (نو آبادکار) سے جان چھڑائی جائے۔ وہ داخلی سطح پر دو محاذوں پر لڑ رہا ہے، ایک طرف اپنے وطن میں نو آبادکار کا جبر دوسری طرف جین کی بے وفائی ہے۔

یہ کم بخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں
"نیٹوز"، ہم "نیٹوز" ہیں۔۔۔ [۱۳]

جس طرح نو آباد کار ایک حکمت عملی کے تحت نو آبادی کے لوگوں کے ذہن میں ایک بات ڈال دیتا ہے کہ ان کی تہذیب و ثقافت سب کچھ گھٹیا ہے اور اصل اور قابل تقلید تو ہماری (نو آباد کار) کی تہذیب و ثقافت ہے۔ بہت سے لوگ اسی بات پر یقین کر لیتے ہیں کہ نو آباد کار یہ بات درست کر رہا ہے اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر انہی کے پیچھے چل پڑتے ہیں لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ تمام کے تمام نو آبادی کے لوگ ایسا کرتے ہیں نہیں اس عمل کی مختلف کرنے والے بھی موجود رہتے ہیں اگر چہ تعداد میں وہ کم ہی کیوں نہ ہوں۔

> اعظم ان طالب علموں کی نمائندگی کرتے ہیں جو شاعرانہ مزاج لے کر لندن میں قدم رکھتے ہیں اور غالب ثابت قدمی کے ساتھ آخر تک جمے رہتے ہیں۔ وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ جانے کس باوجود یہاں کے رسم و رواج رہن سہن اور لوگوں کی آزاد کے بر خلاف عشق کے روایتی تصور رکھتا ہے۔۔ وہ انگریز لڑکیوں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہندوستانی لڑکی کی طرح بس ایک دفعہ نہیں دیکھ کر جی جاں سے فدا ہو جائے۔"[۱۴]

اعظم کا کردار ایک ذہنی لحاظ سے منقسم شخص کا کردار ہے ایک طرف وہ بنیادی تعلق کے لحاظ سے پابند معاشرہ سے تعلق رکھتا ہے دوسری طرف وہ ایک آزاد دنیا یعنی لندن میں رہ رہا ہے اور اگر چہ نوکری کے لیے ہی سہی مگر وہ چل انہی کے بتائے گئے راستے پر رہا ہے۔ جو نو آباد کار نے اسے درست بتایا ہے گو وہ ذہنی طور پر وہ اس راستے کو کسی حد تک غلط ہی سمجھتا ہے اعظم کے دل میں ایک خلش ہے کہ نو آباد کار نے بحیثیت نو آبادی کے انہیں عزت نہیں دی اور اسے حقارت اور نفرت سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ احساس ہونا ہی سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے یہی احساس ایک دن اس کو اس نو آباد کار کے ہاتھوں سے آزادی دلائے گا مگر ابھی تک اعظم کسی ایک فیصلہ تک نہیں پہنچا۔

"لندن کی ایک رات" میں اعظم اور جین کا عشق پوری کہانی میں ساتھ ساتھ چلتا ہے اور جب بھی اسے کچھ وقت ملتا ہے یہ بیٹھ کر جین کو سوچنے لگتا ہے ہاں اعظم اگر جین سے عشق نہ کرتا وہ ایک الگ طرح کا طالب علم ہوتا اور شائد یہ درمیانی کیفیت سے نقل کر عملی طور پر نو آباد کار کے خلاف میدان میں ہوتا مگر اس ظالم عشق نے اعظم کو نکما کر دیا ہے اعظم اور جین کا عشق ناولٹ میں ایک الگ کہانی ہے۔ جہاں تک نو آبادی کے نمائندہ لوگوں میں سے اعظم کا تعلق ہے اعظم نو آبادی میں موجود ایک بہت بڑے اس گروہ کا نمائندہ ہے جو دل میں تو یہ سوچ رکھتا ہے جو ذہنی طور پر آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے غرض ذہنی لحاظ

سے وہ تیار ہے مگر اس بازاری قسم کے عشق و عاشقی کے کھیل سے اسے ابھی اتنی فرصت نہیں کہ وہ عملی طور میدان میں اترے اعظم راؤ کو کیا مشورہ دیتا ہے۔

> اگر ایسا ہی تم چاہتے ہو کہ ہندوستانی ذلت سے نجات پائیں تو پھر جا کر ان لوگوں کی مدد کیوں نہیں کرتے جو وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں[۱۵]

کسی بھی حوالے سے یا ہندوستان کی کوئی عمومی بات ہوتی ہے تو اعظم چند لمحے اس بات پر توجہ نہیں دے پاتا کہ اس کا ذہن جین کی طرف منتقل ہو جاتا ہے وہ کیا کر رہی ہو گی وہ فارغ بیٹھی ہو گی وہ یہ کر رہی ہو گی وہ وہ کر رہی ہو گی وغیرہ وغیرہ اعظم ایک ''بے عمل'' کردار ہے جو صرف عشق بازی کر رہا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا شائد اعظم کی پڑھائی کا حال سجاد ظہیر نہیں بتاتے کہ وہ لائق فائق ہے یا عشق بازی کا اثر اس کی پڑھائی پر بھی پڑ رہا ہے۔

> راؤ اور اعظم کرداروں کی بھیڑ میں ایسے کردار ہیں جو عصری آزادی، اشتراکیت، اجتماعیت وغیرہ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔[۱۶]

اعظم اور مقامی نو آبادی میں فرق صرف یہی ہے کہ اعظم جدید دنیا کے خیالات و نظریات سے واقف ہے اور جو لوگ بر صغیر سے باہر نہیں نکلے وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ آزادی اور حقوق بھی کسی چڑیا کا نام ہے جو اسی دنیا میں وجود رکھتی ہے مگر ابھی ہم سے دور پرواز کر رہی ہے ''لندن کی ایک رات'' میں ہر کردار کے ساتھ عشقیہ کہانی وابستہ ہے اور مخصوص صورت حال پیدا ہونے کے بعد کردار کو ایک خاص سمت (اشتراکی) کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور اسے لازمی طور پر اس موڑ سے موڑنا پڑتا ہے۔ سجاد ظہیر زیادہ ڈھیل نہیں دیتے۔ اگرچہ اعظم بھی سارا وقت ''جزو وقتی'' عشق میں گزر رہا ہے مگر وہ عصری صورت حال سے بے خبر نہیں۔ لیکن ابھی وہ گومگوں کی کیفیت میں ہے۔

> لندن کی ایک رات کے کرداروں کو بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ''کالے'' (جو انگریز نے نفرت کا نام رکھا ہے) ہیں۔[۱۷]

ممکن ہے کہ آنے والا وقت اعظم کا رخ ملکی حالات کے تناظر میں عملی میدان کی طرف کر دے کیوں کہ اس کی باتیں اور اخبارات کی خبر میں دیکھ کر دکھی ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ عنقریب وہ مقام آنے والا ہے جب اعظم عشق کو چھوڑ کر تمام وقت آزادی کی جدوجہد میں صرف کرے۔ مگر فعل حال نو آباد کار کے پھیلائے ہوئے جال میں وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں کہ سر عام اٹھ کر آزادی کا عالم

بلند کیا جائے۔ اعظم جیسے لوگوں کو دس، پندرہ سال بعد اٹھنے کا مواقع ملنے والا ہے جب نو آباد کار کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے اور احساس غلامی کو عملی جدوجہد سے جوڑا جاتا ہے۔

یہ ناول (لندن کی ایک رات) روایتی کرداروں پر مشتمل نہیں ہے۔[۱۸]

اعظم کی نو آباد کار کے خلاف مذہبی سوچ عشق کی کہانی اور جین کی بار بار یاد اور اس کے انتظار میں ڈوب جاتی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ براہ راست اشتراکی نظریہ کی تبلیغ یا اس نظریہ پر بات کرنا اور آزادی کے لیے نعرہ بازی ممکن نہیں تھی اعظم ایک طرف سجاد ظہیر کے دل کی بات کرتا ہے تو دوسری کے لیے وہ اسے جین کے سپرد کر دیتا ہے سجاد ظہیر حسب ذائقہ اشتراکی سوچ، آزادی کا شعور عشق کے ساتھ ملا کر استعمال کر رہا ہے۔ صرف ایک پہلی چیز صحت اور جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر عشق کو ایک طرف کر کے اعظم کے کردار کو دیکھا جائے تو ایک طرف تو وہ روایتی روکھا سوکھا بن جائے گا تو دوسری طرف نو آباد کار اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا اور یہ نو آباد کار کے لیے بڑے خطرہ علامت ہو گی۔

کرداروں کا "بے عمل" ہونا، بے حسی کا مظاہرہ کرنا اور سخت مایوسی کی باتیں کرنا بھی اپنے عہد اور اس کے روحجانات کے تناظر میں دیکھانا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ عہد بھی عجیب کشمکش کا ہے تعلیم حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ کیا کلرک بن گیا اور تو کوئی راستہ نظر آتا ہے اور نو آباد کار کی دہشت اور زاہر بھی عام لوگوں کے لیے کافی ہے بلکہ اس کی مثالیں معاشرہ میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں ایک کے بدلے "دس"، "پندرہ" کالے لوگ مارے جاتے ہیں۔ پھر بھی غصہ کم نہیں ہوتا اور اعظم کی طرح سوچتے سب ہیں مگر اٹھنے کی مجال کسی میں نہیں۔

> سفید آدمی کی روح (یعنی روح عسائیت) "کالے" اور "نیٹو" کی اصلاح و تہذیب کے لیے خود کو حاکمانہ احساس کے ساتھ پیش کرتی ہے اور اس بات سے غرض نہیں رکھتی کہ کالے اور نیٹو کی زندگی کے کتنے ہی اساسی، صدیوں کے چاک پر بننے والے خدومال مٹ جائیں یا مسخ ہو جائیں۔[۱۹]

اعظم بھی اگرچہ مکمل طور پر نہ سہی مگر جانتا اور مانتا ضرور ہے کہ نو آباد کار حد سے زیادہ احساس برتری میں مبتلا ہے اور ہماری تہذیب و ثقافت انحطاط کا شکار ہو گئی ہے نو آباد کار کا یہ ایک انتہائی کامیاب حربہ تھا کہ نو آبادی کو پہلے احساس کمتری میں مبتلا کر دو اور ان کی نظروں میں یہ ثابت کرو کہ ان کی ہر چیز ادنی درجہ کی

ہے اور نو آباد کار کی ہر چیز اعلیٰ درجہ کی اور قابل تقلید ہے اسی لیے نو آبادی اپنے ماضی سے کٹ کر ان کے ساتھ چل پڑتی ہے اور وہ نہ ادھر کی رہتی ہے اور نہ ادھر کی۔

یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں مگر سویز کے اس پار ہم سب ' کالا لوگ نیٹوز '، غلاموں سے بر تر سمجھے جاتے ہیں۔[۲۰]

اعظم کی بات بالکل درست ہے کہ یہاں (لندن) میں بھی دودھ، شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ گورے مزدوروں کا حال بھی گیا گزرا ہے اور ان مزدوروں کے ساتھ بھی برطانوی حکومت کوئی اچھا سلوک نہیں کرتی اور الٹا ملک میں مزدوروں کی آواز کو اشتراکیت سے جوڑ کر بدنام کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ یہ زر خرید ہیں اور روس ان کو مدد فراہم کر رہا ہے اسی طرح انگلستان میں بھی اور خاص کر دار حکومت لندن میں مزدوروں کی حالت ٹھیک نہیں اور وہ خط غربت کے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اعظم یہ حالات دیکھ کر کم از کم احساس کمتری کا اس حد تک شکار نہیں ہوتا کیوں کہ وہ دیکھ چکا ہے کہ لندن میں عام عوام کا کیا حال ہے۔ اعظم عجیب کشمکش میں الجھا ہوا ہے ایک طرف وہ اپنے مقصد (پڑھائی) سے ہٹ چکا ہے اور سارا وقت جین کو سوچتا رہتا ہے۔

اعظم اس کے جسم کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں کیوں کہ اس کے نزدیک گوری جلد اور جسم ہی سب کچھ ہے۔[۲۱]

برصغیر اور انگلستان کے ماحول میں بہت فرق ہے اور خاص کر عورت کی آزادی کے حوالہ سے برصغیر جیسے معاشرہ میں جہاں برقع اور پردہ کا رواج ہے اور عاشق محبوب کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس جائے عورت کا گھر سے باہر نکلنے کا کوئی تصور نہیں اور کہاں لندن جہاں عورت جو مرضی کرتی پھرے۔ اعظم جیسے لوگ جب وہاں جاتے ہیں تو وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ مابعد عہد میں بھی جب طالب علم وہاں جاتے ہیں تو ان کا حال بھی اعظم سے کچھ مختلف نہیں ہوتا۔ اعظم پڑھائی پر وہ کوئی بات نہیں کرتا اور ہر وقت عشق بازی کے چکر میں لگا رہتا ہے گھر سے چھوٹی بہن کا خط ملا ہے اور وہ ماں کی اداسی کا لکھتی ہے اور ایک دلہن کا بھی ذکر کرتی ہے جیسے ماں نے اس کے لیے پسند کیا ہے مگر یہ صاحب ہیں کہ بس جن کو گوری لڑکی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اور جین ہے کہ بار بار اسے خود سے دور رکھتی ہے۔ اور اسے بہت قریب نہیں آنے دے رہی اور یہ (اعظم) وقت برباد

کرتے جارہے ہیں اور ڈگری کے لیے اب مذید وقت درکار ہوگا اور ہو سکتا ہے ڈگری کا حصول ویسے بھی ممکن نہ رہے۔

> اعظم مغربی تمدن اور جین کی محنت کا سحر میں اس حد تک مبتلا ہو چکا ہے کہ اسے اب ہندوستان واپس جا کر زندگی گزارنا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے۔۔۔[۲۲]

نوآبادیاتی عہد سے شروع ہونے والی کہانی مانعد نوآبادیاتی عہد میں بھی اسی طرح چل رہی ہے اور بہت سے طالب علم جو پاکستان سے حصول تعلیم کے لیے جاتے ہیں وہ بھی گوری لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہی اپنا سارا وقت ضائع کرتے ہیں اور اگر کوئی موقع مل جائے تو وہ وہیں رہائش پذیر ہو جاتے ہیں بلکہ برطانوی شہریت کے حصول کے لیے تو وہ کسی حد تک بھی گر سکتے ہیں۔ اعظم کو ماں اور چھوٹی بہن کے محبت بھرے خط کا کوئی احساس نہیں ہوتا اور وہ پڑھ کر رکھ دیتا ہے مگر کبھی اس نے ماں اور اپنی دھرتی کی طرف رخ نہیں کیا کہ اس کے بارے میں بھی سوچے اور جین بھی اسے کوئی خاص وقت نہیں دے رہی ہو سکتا ہے وہ بھی نوآباد کار کی طرح ذہنیت رکھتی ہو کہ یہ "کالا" ہے اور میں گوری ہوں اور میں (جین) اس سے برتر ہوں یہ کم تر درجہ سے تعلق رکھتا ہے۔ راؤ، اعظم سے مختلف کردار ہے اور اگرچہ وہ اعظم کا لندن میں مقیم دیگر طالب علموں کا قریبی دوست ہے۔

> ناول (لندن کی ایک رات) میں راؤ ایک سنجیدہ مزاج کا حامل کردار ہے جیسے ٹام اور جم ایسے انگریزوں کی اس ذہنیت پر غصہ آتا ہے کہ ہندوستانی بڑے جاہل، گنوار اور پسماندہ ہے[۲۳]

راؤ کے رویہ میں ایک تلخی اور جھلاہٹ کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے یہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہے اس کے مقابلے میں اعظم ایک غیر سنجیدہ کردار ہیں۔ جب کہ راؤ سنجیدگی سے اپنے ملک کے لوگوں کے بارے میں غور و فکر کر رہے اور یہ سوچتا ہے کہ اس تسلط اور جبری مسلط شدہ نوآباد کار سے کیسے آزادی حاصل کی جائے۔ راؤ کی سوچ دو دائروں میں گھومتی ہے ایک طرف تو مستقبل بے چینی اور بے قراری کی کیفیت میں مبتلا ہے کہ ہم غلامی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ یہ سوچ رکھتا ہے کہ لندن میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم واپس جا کر ملک و قوم کی آزادی یعنی خدمت کا فریضہ سرانجام دیں۔

> راؤ کے ذریعے ناول نگار نے ایسا ماحول بنایا کہ انگریزوں کی سامراجی سوچ کو اجاگر کیا ہے جو اپنے علاوہ دوسرے انسانوں کو کمتر سمجھتے ہیں۔[۲۴]

''لندن کی ایک رات'' میں راؤ کا کام یہ ہے کہ وہ نو آباد کار کے طریقہ واردات اور قبضہ کے مقاصد کو اجاگر کرے اور یہ کام وہ بخوبی سر انجام دیتا ہے۔ راؤ سامراج سے پردہ کو اٹھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے کہ کیسے نو آباد کار نے شرافت اور امن و امان قائم کرنے والے کے روپ میں کون سے کام کیے ہیں اور امن و امان نہیں اصل مقصد کیا ہے جس کے تحت وہ قابض ہیں۔ راؤ اور اعظم کے مکالمے میں راؤ پوری طرح سنجیدگی سے بات کرتا ہے اور کھل کر قابض لوگوں کی مخالفت میں سامنے آتا ہے۔ راؤ پوری طرح دل لگا کر ایمان داری سے پڑھائی کو وقت دے رہا ہے اگرچہ عادات و خصائص اس میں بھی دیگر طالب علموں جیسے ہی ہیں مگر پڑھائی میں یہ ان سے بہتر اور مخلص ہے راؤ بھی عملی جدوجہد پر یقین رکھتا ہے دوسرے کرداروں کی طرح ''بے عمل'' نہیں ہے اور نہ رہنا چاہتا ہے۔

> سمندر کی کئی لہریں، آگے بڑھنے کی کوشش مگر راستہ رکا ہوا ہے۔۔ اخر ہم آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ یہاں تک پہنچ کر رک جانے کا فائدہ ہے۔ اتنی دور تک آئے اور اب رکے ہوئے ہیں آگے بڑھو۔ آگے بڑھو۔۔۔[۲۵]

درج بالا پیراگراف میں انقلاب کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ایک دریا کی چند لہریں بپھرے ہوئے سمندر (چند ہزار انگریز اور کروڑوں ہندوستانی) کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہیں لیکن سمندر کی لہریں اٹھتی ہیں اور ان میں جوش پیدا ہوتا ہے مگر یہ کچھ وقت یا عارضی ہوتا ہے یہ جوش و جذبہ مستقل نہیں ہوتا۔ راؤ کے خیال میں سب سے بڑا مسئلہ لہروں کا پیدا ہونا ہوتا ہے۔ اور جب پیدا ہوتی ہے تو پھر ان کے سامنے کوئی دیوار نہیں ٹھہر سکتی اور انہیں روکنا ناممکن ہوتا ہے۔ مگر یہاں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور سینوں پر گولیاں کھا کر چپ بیٹھ رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ایک ہی کامیابی کا راستہ ہے وہ اگے بڑھنے سے ہی ملے گا۔ یہاں ایک اشارہ انقلاب روس کا بھی ہے کہ ایک ملک میں عوام نے کیسے آگے بڑھ کر سرخ انقلاب کو ممکن بنایا۔

برصغیر میں نو آبادی جن کی تعداد کرداڑوں میں ہے ایک سمندر ہے مگر یہ سمندر ساقت اور بے جان پڑا ہے۔ اور اس میں کوئی حرکت نہیں۔ ان لہروں کو اٹھ کر سامنے آنے والوں کو خس و خاشاک کر دینا چاہیے اور ایک انقلاب برپا کرنا چاہیے۔ آزادی حاصل کرنی چاہیے لیکن شائد ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ جلیانوالہ باغ اور دیگر چند ایک مزدور یونین کے اجتماع کے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان مضبوط اور بلند لہروں کے سامنے ان سے بھی ایک مضبوط بند موجود ہے (جس میں بہتر منصوبہ بندی شامل ہے)۔ (اگرچہ وہ

بند بعد میں کمزور ہوتا ہے اور وہ لہریں کامیابی سے ساحل عبور کر جاتی ہیں) راؤ کے اندر ایک خلش ہے وہ نو آبادی کو اٹھتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ نو آبادکار سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔

> اس کے (انگریز مزدور) بھائی بندوں نے ہمارے بھائی بندوں پر گولی چلائی۔ یہ دنیا بھر میں گولیاں چلا کر اور آسمان سے بم برسا کر تہذیب پھیلاو، صلح اور امن قائم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔[۲۶]

طاقت کا استعمال نو آبادکار ایک طویل عرصہ سے کرتا آ رہا ہے۔ اور ظلم و بربریت کا بازار گرم کر رکھا ہے اور الٹا یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ ہم یہاں امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہماری وجہ سے یہاں امن وامان ہے مابعد نو آبادیاتی تناظر میں آج بھی وہی نو آبادیاتی منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور آج بھی یہی طریقہ کار گر چلا آ رہا ہے۔ اور اسی طریقہ کے مطابق آج بھی ملک کے ملک ملیامیٹ کر دیے جاتے ہیں صرف اور صرف اپنے مفادات کے لیے اور ان مفادات کے حصول میں جو رکاوٹیں آتی ہیں۔ ان کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر کہا جاتا ہے کہ یہ امن و امان قائم کرنے کا طریقہ ہے اور اس طرح دیرپا امن قائم ہو جائے گا بم بارود کا استعمال نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی عہد میں یکساں استعمال ہو رہا ہے صرف آج طریقہ بدل گیا ہے مگر راستہ وہی ہے منزل وہی مفادات کے حصول کا طریقہ وہی ہے۔ جس طرح نو آبادیاتی عہد میں نو آبادکار نے ایک بیانیہ اپنایا ہوا تھا کہ یہ ہم نے "وحشی" قوم پر احساس کیا جو ان کو زیر تسلط لے لیا اب بھی برطانیہ سمیت تمام اتحادی ممالک باہم اکٹھے ہو کر یہی کر رہے ہیں اور اب اکیلے برطانیہ یا امریکہ کے لیے اپنے مفادات کا حصول ممکن نہیں تھا اس لیے وہ اکٹھے ہو گئے ہیں اور سلسلہ وہی چل رہا ہے کہ یہ کرنا ضروری تھا نو آبادیاتی عہد میں بھی کہا جاتا تھا کہ اگر ہم برصغیر کو چھوڑ دیں تو امن قائم نہیں رہے گا اور خون کرابا ہو گا۔ آج بھی شعیہ، سنی اور دیگر جماعتیں تشکیل دے کر یہی ڈراما رچایا جاتا ہے اور ہم سیدھے سادھے لوگ (عوام) اس ڈراما کے کردار بن کر ان کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ نہ جانے یہ ترقی پذیر ممالک پر احسانات کا سلسلہ کب تک جاری رہیں گے۔ اگرچہ انگریز مزدور حقیقت میں راؤ اور اعظم کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے مگر راؤ سب گوروں سے نفرت کرتا ہے مگر بعد میں راؤ کو احساس ہو جاتا ہے کہ ہمارے مفادات ایک جیسے ہیں اور اسی طرح دنیا بھر کے مزدور ایک دوسرے کے ساتھ اسی لیے وابستہ ہیں۔ برصغیر میں تقسیم اور حکومت کرنے کے تحت پیدا ہونے والی تقسیم یہاں ناولٹ "لندن کی ایک رات" کے کرداروں میں بھی نظر آتی ہے۔

راؤ اگرچہ اشتراکیت کی طرف مائل ہے۔ اسے یہ خیالات اچھے تو لگتے ہیں لیکن ابھی
تک اس کے دل و دماغ پر تشکیل کا غلز ہے۔ وہ اپنے طور پر ہندوستان کے سیاسی مسائل
کے بارے میں بھی سوچتا رہتا ہے اور زندگی کے مسائل پر بھی۔[۲۷]

سجاد ظہیر کے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کے بہت سے کردار کسی نہ کسی حد تک اس نظریہ اشتراکیت سے وابستہ ضرور ہیں۔ عرض وہ پکا اشتراکی ہو یا ابھی خام حالت میں بہر حال جھکاو اسی نظریہ کی طرف ہی ہو گا۔ راؤ بھی دنیا بھر میں پھیلتے ہوئے اشتراکی نظریہ سے متاثر ہے اور اسی کے لیے اپنی کوشش واقف کرنا چاہتا ہے مگر ابھی وہ عملی طور پر میدان میں نہیں اترا۔

راؤ اپنے آنے والے کل سے خوف زدہ ہے کیوں کہ اسے اپنا مستقبل روشن نہیں نظر آرہا۔ دنیا بھی پہلی جنگ عظیم کے اثرات سے نہیں نکل پاتی۔ دوسری طرف عالمی کساد بازاری کا جن بوتل سے باہر نکل چکا ہے اور دنیا بھر میں ایک کثیر تعداد میں لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں یہاں تک کہ خوراک کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ دنیا بھر کے سارے ملک اور باشندے ان حالات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اور راؤ بھی اپنے مستقبل سے مایوس ہوتا جا رہا ہے نو آبادیاتی حوالے سے ایک بڑی یونی ورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے کے باوجود وہ پر امید نہیں کہ اسے کوئی سرکاری نوکری مل پائے گی۔ ہر طالب علم جو پڑھائی مکمل کر کے روزگار کے لیے میدان میں آنے والا ہے وہ سب اسی شک میں مبتلا ہے کہ نہ جانے اب کیا ہو گا۔ کیوں کہ دنیا میں بے روزگاری اپنی آخری سطح کو چھو رہی ہے۔ راؤ سے لوگوں کو اپنے مستقبل کی فکر ہے جو انہیں تاریک نظر آرہا ہے اور راؤ کی طرح دیگر طالب علم جو حقیقی دنیا میں رہتے ہیں۔ اور حقیقت پسند ہیں اور وہ آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھتے پرکھتے ہیں۔ وہ اپنے سامنے اپنی محنت کو رائگاں ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ اگر راؤ ہندوستان کی بھلائی کا ذکر مزاحیہ انداز میں کرتا ہے مگر وہ حقیقت ہے کہ ہر بندہ اپنے طور پر کرنے والے کام کو ہندوستان کی بھلائی سے جوڑتا ہے مگر عملی طور پر ایسا کچھ نہیں ہوتا بس اپنے اپنے مفادات۔ اپنی اپنی الگ الگ منزلیں ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی دنیا میں آج بھی یہی کچھ ہمیں سننے کو ملتا ہے۔

مابعد نو آبادیاتی دنیا میں آج بھی یہی نسخہ چل رہا ہے کہ ہر بندہ دعویٰ دار ہے کہ وہ تو عوام کی خدمت کر رہا ہے وہ مزدوروں اور عوام کی بھلائی کے لیے کام کر رہا ہے۔ غرض وہ سو طرح کے دعوے کرتے ہیں اور سو طرح کے ڈرامے رچاتے ہیں۔ مگر اپنے مفاد سے آگے نہیں کی سوچ کچھ کام نہیں کرتی اور خدمت بھی وہی ہوتی ہے۔ نو آباد کار کے بنائے ہوئے چہرے آج بھی سیاست میں یہی کھیل کھیل رہے ہیں۔ اخبارات کی

نفرت پر مبنی خبریں پڑھ کر راؤ اور اعظم سخت نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اور نفرت اور مایوسی دونوں کے ملے جلے جذبات ہیں۔

> یہ درست ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں چیزیں اس طرح واضح نہیں تھیں جس طرح پہلی جنگ عظیم کے بعد واضح ہونا شروع ہوتیں۔[۲۸]

یہ مایوسی کی کیفیت صرف راؤ اور دیگر ہندوستانی طالب علموں تک محدود نہیں۔ دنیا بھر میں مستقبل کے حوالے سے لوگوں کو کوئی واضح صورت نظر نہیں آرہی۔ مستقبل کے حوالے سے وہ فکر مند ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد نو آبادی کے لیے موافق حالات پیدا ہوتے ہیں اور مستقبل کی واضح شکل دیکھائی دیتی ہے۔ راؤ کا لب ولہجہ طنز بھرا اور غصہ سے بھرپور ہے۔ وہ نو آباد کار کے مقابلے میں نو آبادی کا قصور زیادہ سمجھتا ہے اور کہنا ہے کہ ہم ہیں ہی خوشامدی اور خوشامدیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ایک طرف نو آباد کار ہمیں کیڑے مکوڑے سمجھتا ہے اور ہماری تذلیل کرتا ہے دوسری طرف ہم انہی کے پاؤں میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ اور انہی سے اچھائی کی امید رکھتے ہیں اور ان کے نزدیک ہماری جان کی کوئی قدر نہیں ہاں البتہ ہمارے مال کی قدر ہے کیوں وہ ان کے لیے کام کی چیز ہے۔ باقی کسی چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ بے قراری اور بے چینی کی زندگی سے۔

> سجاد ظہیر نے لندن کے ان بے قراروں کی تصویر کشی کی جو کہ دھوئیں اور کہرے کی اندھی سرنگ میں بند ہیں جن کے ارمان بہت سے ہیں مگر ان کی زندگیاں مفہوم سے عاری اور معنی سے خالی ہیں کیوں کہ ان کے رشتے نہ اپنے عوام سے ہیں اور نہ زندگی سے وہ ایک بے نام خلا کے مسافر ہیں۔[۲۹]

سجاد ظہیر چوں کہ خود بحیثیت طالب علم لندن میں مقیم رہے اور انہوں نے ہندوستان سے بغرض تعلیم گئے ہوئے دیگر طالب علموں کی زندگیوں کو بغور دیکھا اور ان کا مطالعہ کیا۔ وہ ان حالات و واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان طالب علم کو کس قسم کی صورت حال کا سامنا کر رہے ہیں؟ کیا سوچتے ہیں کیا کرنا چاہتے ہیں؟ سجاد ظہیر کو بخوبی معلوم ہوتا رہتا تھا۔ سجاد ظہیر کو لازمی ان طالب علم کی باتیں سننا پڑتی ہوں گی جب وہ ان کے قریب آتے ہوں گے تا کہ ان کو اشتراکیت زدہ آزادی کے حوالے سے ہم خیال بنانے بنایا جائے۔ راؤ کی طرح راستے میں بھٹکتے ہوں کو زندگی بھی بھاری معلوم ہوتی ہے اور خودکشی تک سوچنا شروع کر دیتے ہیں اور اگر سفر بھی کرتے رہیں تو بغیر منزل کے راؤ بھی دل میں ایک خلش لیے زندگی کا سفر طے کر رہا ہے۔ اور اسے نو

آبادی سے ہمدردی بھی ہے مگر خود بے سہارا بے سمت کا مسافر بنا ہوا ہے۔ راؤ اور اعظم، کے کردار کے حوالے سے دو باتیں مشترک ہیں۔

> یہاں (ان دونوں) بھی سیاست اور محبت کا امتزاج ہے بلکہ یوں کہیے کہ رومان پیش منظر ہے تو سیاست پس منظر یا محض بین اسطور کی حد تک۔۔۔[۳۰]

''لندن کی ایک رات'' میں ظاہر طور پر نظر آنے والا منظر عشق و محبت ہے جب کہ اصل منظر جو براہ راست نہیں دیکھایا جاتا وہ نو آبادکار کے خلاف مزاحمت۔ آزادی کا حصول منصفانہ تقسیم پر مبنی معاشرہ ہے۔ '' لندن کی ایک رات'' میں دو فورم بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اور زیادہ تر گفتگو انہی دو فورم پر ہی ہوتی ہے ایک طرف تو ضمنی طور پر ایک فورم ریلوے کا اسٹیشن ہے۔ دوسری طرف اصل مرکزی فورم نعیم کا گھر ہے۔ ایک اور فورم ''پب'' مطلب وہ شراب خانہ ہے جہاں راؤ اعظم، جم، ٹام اور دیگر مزدور اور شرابی اکٹھے ہوئے ہیں اور شراب نوشی کرتے ہیں۔ مگر یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ نشہ کے عالم میاں بھی مطلب کی بات کرتے ہیں کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو کسی نہ کسی طرح نو آبادی، نو آبادکار یا اشتراکیت کے مطالق نہ ہو۔ اعظم رہبری یا خدمت کے حوالے سے ہندوستان میں موجود لوگوں کو رد کرتا ہے نہ وہ کسی وزیر پر یقین کرتا ہے اور نہ گاندھی پر کہ چرخہ کاتنا کون سی خدمت ہے۔ راؤ، اعظم کو کوئی مخلص رہنما اپنی پوری نو آبادی میں نظر نہیں آرہا۔

> لندن میں ایک رات میں سجاد ظہیر کے یہاں ہونے والی فکری تبدیلی کی ایک فنگشنل تمہید میں اس کی Story Time اور کردار۔ اس کے مکالمے اشتراکی فکر و نظم کے Sourgates ہیں۔[۳۱]

راؤ صرف اشتراکیت نہیں چاہتے وہ صرف مزدوروں کے حوالے سے نہیں حقوق کی بات کرتے۔ وہ تو پورے معاشرہ میں برابری کی سطح کے حقوق والی آزادی کی بات کرتے ہیں کیوں کے مزدوروں اور عام کسانوں کے ساتھ دیگر لوگ بھی شامل ہوں گے تو آزادی کا حصول ممکن ہو سکے گا۔ کسی حکومتی عہدہ تک پہنچ جانے والے شخص سیکرٹری یا وزیر، مشیر بن جانے والے شخص سے بھلائی کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ وہ بھی یہی راگ الاپ رہا ہو گا۔ نو آبادکار کی طرح کہ میں بھی ہندوستان کی بھلائی کے لیے خیر خواہی کے لیے کام کر رہا ہوں اور اصل میں وہ اپنے مفادات کو گلے لگائے بیٹھے ہو گا۔ سجاد ظہیر کمال مہارت سے ''پب'' سے پہلے ریلوے اسٹیشن پر راؤ اور اعظم کی ملاقات کرواتے ہیں جو شدید کرب اور ذہنی طور پر پریشانی سے گزر رہے

میں اگرچہ جبین کا عشق وقفے وقفے سے اعظم کا رخ حسین وادی (عشق) کی طرف موڑتا رہتا ہے مگر پھر بھی اضطراب اور بے قراری بار بار سر اٹھاتی ہے اور جو انہیں آمادگی کی طرف لے جانا چاہتی ہے کہ وہ اٹھے اور حقوق، آزادی، معاشرہ میں وسائل کی برابر تقسیم کے حوالے سے کوشش کریں۔

ب) "لندن کی ایک رات" کے کرداروں پر نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات کے اثرات:

ناولٹ کے کردار ایک معاشرہ یا ملک کا حصہ ہوتے ہیں اس معاشرہ یا ملک پر پڑنے والے اچھے یا برے اثرات لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ تخلیق کار انہی لوگوں میں سے چند کردار اٹھا کر بطور نمائندہ ایک ناولٹ میں شامل کرتا ہے۔ تمام کردار خاص ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں، پھر وہ کردار انہی اثرات کو لے کر کہانی میں اگے چلتے ہیں اور وہ اثرات بار بار اپنی جھلک دکھلاتے ہیں۔ "لندن کی ایک رات" کے کردار ملکی اور بین الاقوامی طور پر مسائل ذدہ دنیا کے بہترین نمایندہ ہیں۔ نو آبادی (برصغیر) میں جو بیج بویا گیا اس دور میں وہ ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ پیروکاروں کی ایک بڑی کھیپ تیار ہو جاتی ہے۔ ایک نسل کی اپنے مخصوص مقاصد کے تحت تربیت کی گئی اس سے اگلی نسل کی تیاری اس پہلی نسل نے خود شروع کر دی اس طرح ایک سلسلہ چل نکلتا ہے۔

نو آبادیاتی لحاظ سے تقسیم شدہ ملک میں آج بھی وہی تقسیم در تقسیم چلی آ رہی ہے، امیر، امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور غریب غریب تر ہو رہا ہے۔ اور ترقی پسند ممالک ان بڑے سرمایادار ملکوں سے ان کے بنائے ہوے اداروں، مثلاً۔ آئی۔ ایم۔ ایف اور ورلڈ بنک سے قرضے لینے پر مجبور ہیں اور آج بھی وہ ملک یہی کہتے ہیں کہ یہ ہم ان غریب ملکوں سے بھلائی کا سلوک کر رہے ہیں اور یہ ان کے لیے بہتر ہے جب کہ سود اور دیگر راستوں سے وہ ان غریب ملکوں کا خون نچوڑ رہے ہیں۔ موجودہ عہد میں بھی راؤ اور اعظم کی طرح کا ہی حال ہمارے ان نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک گھٹن والے معاشرہ سے جب نکل کر آزاد معاشرہ میں جاتے ہیں تو ان دونوں سے کچھ مختلف کام نہیں کرتے۔ انہی کی طرح وہ بھی دن رات پاس کرتے ہیں۔ ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے کہ نو آبادی کے لوگ جو ساری زندگی کی جمع پونجی لگا کر لندن اور یورپ کے ممالک میں جاتے ہیں وہ وہاں غیر محفوظ ہوتے ہیں۔

راؤ کو ڈر محسوس ہونے لگا۔۔ سائیکلوں پر گورے اس کے قریب آنے لگے [۲۳]

راؤ ایک طرف تو گوروں سے نفرت کرتا ہے اور دوسری طرف وہ ان کے یعنی انگریز کے اوچھے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ اور اس سے واقفیت کی بنا پر وہ ان سے دلی طور پر کوف زدہ ہے اور وہاں

"پب" کے باہر گوروں کا اکٹھے ہونا بھی راؤ کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے اور جان چھڑا کر نکلنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح چپ چاپ راؤ کا نکلنا ایک نفسیاتی طور پر برتری مان لینے کے مترادت ہے کہ وہ (گورے) کم سے کم کسی جھگڑے کی صورت میں انہی گوروں کی ہی طرف داری کریں گے اور ایک کے بدلے پندرہ والی ساری باتیں اور واقعات اسے اچھی طرح ذہن نشین ہیں۔

یہ نفسیاتی پستی سے مابعد بھی نو آبادی نہیں نکل پا رہی۔ پوری دنیا میں آج بھی منظر یہی ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے بے شک سارے لوگ مارے جائیں مگر گوروں پر حملہ یا کسی ایک گورے کا مارا جانا گویا پورے ملک کو تناہ کرنے کے برابر ہے۔ پوری دنیا میں ایک طویل عرصہ سے یہ بات عام لوگوں کے دماغ میں ڈال دی گئی ہے۔ کہ جان تو صرف گوروں کی قیمتی ہوتی ہے باقی تو بقول راؤ کے کیڑے مکوڑے ہوئے جن کے مرنے اور زندہ رہنے سے رؤے زمین پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

> کرداروں کی بے حسی یا خاموشی کو بھی اس عہد اور سیاست کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔[۳۳]

انسان باتوں کے مقابلے میں عملی کاموں سے زیادہ سیکھتا ہے اور اگر مثالوں کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے ہو تو معاملات آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں راؤ اس بات کا اچھی طرح ادراک رکھتا ہے کہ اگر ہم جھگڑے کو بڑھاتے ہیں اور مار پیٹ ہو جاتی ہے تو دونوں صورتوں میں گناہ گار ہم ہی ٹھہریں گے اور گورے کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا۔ یہ اس عہد کا ایک نفسیاتی اصول تھا کہ گورے پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑا پاپ ہے اور اس کی سزا شائد زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں۔

> گویا میخانہ طبقاتی تقسیم کی تمثیل ہے راؤ یہاں اعظم کے عشق کی لایعنیت اور اس کے کرب کی بے مائیگی کا مارکسی جائزہ لیتا ہے۔ عشق بھی افیون ہے جو ذہنوں کو معطل کر دیتا ہے۔ یہ تو بالکل بے فیض اور لاحاصل اذیت ہے جس کا اثر سوائے دل و دماغ کے معطل ہو جانے کے سوا کچھ نہیں۔[۳۴]

راؤ اشتراکی نقطہ نظر سے ہر چیز کا تجزیہ کرتا ہے۔ وہ شخص جو معاشرہ کی بہتری کے لیے کام نہیں کرتا عوام کے لیے بھلائی نہیں کرتا عملی طور پر کوشش نہیں کرتا وہ بے کار اور فضول ہے۔ شاعری، عشق، شراب نشہ اور یہ جین جو اعظم کے دماغ معطل کیے بیٹھی ہے اور اعظم اپنے اعلیٰ واضح مقاصد عشق کی نظر کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہیرن پال بہترین کردار ہے جو اعظم سے الٹ چل رہا ہے۔

سجاد ظہیر اشتراکیت کے دلدادہ تھے۔ اور ان کا عہد یورپ اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے اب ''لندن کی ایک رات'' ناولٹ کو تخلیق اور تخلیق کار کے تعلق کے تناظر میں دیکھیں اور اس کا تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اشتراکیت کس طرح سجاد ظہیر کے دماغ پر چھائی ہوتی ہے اور دوسری بات اشتراکیت کا نقطہ رکھنے والے اشتراکی نوآبادیاتی نظام کو ایک الگ طرح سے دیکھتے ہیں۔ اس ناولٹ کے کردار بھی کسی نہ کسی سطح پر اشتراکیت کے نقطہ نظر سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ سرمایادار ریاستیں ایک خاص منصوبہ سے غریب ریاستوں پر تسلط قائم کر لیتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اور بھی خط غربت سے نیچے چلے جاتے ہیں۔ اور نوآبادی کے لوگوں کو خوف زدہ کر کے رکھا جاتا ہے تاکہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ ایک طرف انہیں خوب دہشت زدہ کیا جاتا ہے اور جسمانی لحاظ سے سخت سزائیں دی جاتی ہیں تو دوسری طرف طویل عرصہ کے لیے تسلط کی راہ ہموار کرنے کے لیے ان (نوآبادی) کی خاص طرح کی ذہن سازی (brain washing) بھی کی جاتی ہے راؤ نوآبادی کا ہی ایک نمائندہ ہے مگر وہ اندھا دھند تقلید کا قائل نہیں اور وہ جسمانی طور پر نوآبادکار کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ذہنی لحاظ سے ان کا مخالف ہے۔ لندن میں وہ جب بھی اپنے دوستوں سے اور دیگر ہم خیال لوگوں سے ملتا ہے تو اسی عنوان پر ہی زیادہ تر گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔

> مارکسٹ دانشوروں نے امپیریل ازم کو سرمایہ داری کی پیداوار قرار دیا۔ ۱۹۳۹ء میں ماسکو کمیونسٹ پارٹی نے ایک اعلامیہ میں کہا کہ امپیریل ازم پس ماندہ ملکوں پہ معاشی معاہدے تھوپتا ہے، ان کا استحصال سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ہوتا ہے۔۔۔[۳۵]

اسی اعلامیہ کی بنیاد پر دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور ایک طرف سرمایہ دارانہ طرز حکومتیں رکھنے والے ملک اور دوسری طرف کمیونزم کا پرچار کرنے والے ملک نظر آتے ہیں اور برصغیر میں ایک طاقت اور نوآبادکار سرمایہ دارانہ طرز حکومت کا سب سے بڑا حامی تھا۔ وہ کیسے برداشت کرتا کہ سجاد ظہیر طالب علموں کی زندگی اور عشق کا پردہ ہٹا کر سرعام مارکسیت کا پرچار کریں شاید یہی وجہ ہے کہ راؤ گورے دیکھ کر چپ سادھ لیتا ہے۔ تمام کردار اشتراکی ذہن رکھنے کے باوجود کھل کر اظہار خیال نہیں کرتے۔

''لندن کی ایک رات' میں چند کردار گوروں کے ایسے ہیں جو اپنی ریاستی چالاکیوں کو بخوبی جانتے ہیں اور جس طرح کا پروپیگنڈا برطانوی حکومت کرتی ہے اس سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ ان میں سے ایک سابقہ فوجی ''ٹام'' ہے۔ ٹام گویا گھر کا باغی ہے۔ اور یہ گھر کی گواہی ہے اور نوآبادی پر تسلط کی جو برطانوی حکومت وجہ بتاتی ہے وہ اسے اندر سے جانتا ہے اور وہ اپنی آنکھوں سے ساری صورت حال کو دیکھ چکا ہے۔ ٹام

کے مقابلے میں اکثریت ایسے لوگون کی ہے جو اصل حالات واقعات سے لاعلم ہے۔ اس اکثریت کو حکومت وقت یقین دلا چکی ہے کی وہ جو کر رہیین درست قدم ہے وہی اکثریت حکومت کو منتخب کرتی ہے۔

> میں (ٹام) یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے فساد، گڑبڑ، خون خرابے کی خبر سن کر خوشی نہیں ہوتی اور جب ہم انگریز ہندوستان میں جا کر بغیر فوج کی روزانہ مدد کے حکومت نہیں کر سکتے۔۔۔ اب اس بات کا وقت آ گیا ہے کہ ہم ہندوستان سے بوریا بستر سنبھال کر گھر واپس چلیں۔۔۔[۳۶]

ٹام خود اصلیت جانتا ہے اور یہ جھوٹی پھیلاتی ہوئی باتیں اس کے سامنے محض ڈراما ہیں۔ وہ حقیقت سے واقف ہے اور یہ بات بھی کافی وزن رکھتی ہے کہ اگر برطانوی حکومت کہتی ہے کہ وحشی قوم پر یہ احسان ہے اور اگر ہم ان پر تسلط قائم نہ کرتے تو وہ تباہ و برباد ہو جاتی تو پھر ہمیں فوج کی مدد کیوں درکار ہوتی ہے؟ اچھے کام کے بدلے میں لوگ خوش آمدید کہتے ہیں اور پھولوں کے ہار پہناتے ہیں۔ دل سے قدر کرتے ہیں۔ اور یہاں معاملات آئے روز فوج نو آبادی میں سر اٹھانے والوں کو کچلتی رہتی ہے اور لوگوں کو مارتی رہتی ہے۔ اور خون خرابے کا ایک سلسلہ ہے جو پہلے دن سے آج تک چل رہا ہے۔ ٹھیک ہے اور لوگوں کو ہو گا یقین وہ کریں یقین۔ مگر ٹام کے لیے سب سے بڑی گواہی یہی ہے کہ وہ خود ہندوستان کو دیکھ چکا ہے۔ اور اب جب وہ اس طرح کا پروپیگنڈا سنتا ہے تو حیران ہوتا ہے کہ اصلیت کیا ہے اور اخبارات جو کہ حکومتی ترجمان ہیں وہ کیا دیکھا رہے ہیں اور مسلسل ایک بات کرتے جا رہے ہیں۔ جو جھوٹ پر مبنی ہے۔

جس طرح نو آبادی میں آزادی پسند گروہ موجود ہوتا ہے اگرچہ تعداد میں وہ کم ہی ہوں اسی طرح نو آبادکار کے نقطہ نظر کے مخالف خود اس کے قلب میں موجود ہوتے ہیں ٹام انہی چند لوگوں میں سے ہے۔ اور جب ''جم'' اخبارات کی خبروں کا حوالہ دیتا ہے تو ٹام کہتا ہے۔

> میں لڑائی کے پہلے ہندوستان میں تھا میں نے وہاں کی حالت دیکھی ہے۔۔۔ میں ہندوستانیوں کو جانوروں سے بدتر سمجھتا تھا۔ ہم لوگوں کو فوج میں یہی سکھایا جاتا تھا۔[۳۷]

ٹام بتاتا ہے اس سے پہلے دیکھیں ان کے سامنے ایک تصویر رکھی جاتی ہے۔ کہ ظلم و ستم، قتل و غارت ایک کے بدلے پندرہ مارتے ہیں۔ یہ سب جائز ہے اور اصول پر مبنی ہے۔ نو آبادی (برصغیر) انہی باتوں کے روادار ہیں۔ جو ان کے ساتھ روا رکھی جا رہی ہیں ٹام کو بھی ذہنی طور پر انہی باتوں کا سامنا کرنے کے لیے امادہ کر لیا جاتا ہے اور وہ بھی نو آبادکار کا ایک روبوٹ بن کر فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ جب یہ سارا کچھ کر کے

واپس اپنے کاموں اور خاص کر اپنی حکومت اور ریاست کا بیانیہ سنتا ہے اور اصل باتوں کا تقابل کرتا ہے۔ تو اپنی حکومتی بیانیہ کو سو فیصد چھوٹا پاتا ہے۔ اور لوگوں کو بتاتا ہے کہ اخبارات کی خبروں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں یہ دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔

ٹام، جم کو اصلیت بتاتا ہے کہ میں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندوستان دیکھا ہے جو غربت زدہ ہے مفلس ہے ایک وقت کے کھانے کو لوگ ترس رہے ہیں جم محض اخبارات کی خبریں پڑھ کر ایک رائے قائم کیے ہوئے تھا اور جب ٹام اسے حقیقت بتاتا ہے اور اپنے احتجاج کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی مثال سے سمجھاتا ہے تو جم کو یقین ہو جاتا ہے کہ ہاں اخبارات ایک خاص مفاد کے لیے سچ کو جھوٹ بنا دیتے ہیں۔ اور خبروں کو اسی رنگ میں پیش کرتے ہیں جو سرمایہ دار چاہتا ہے کیوں کہ اس طرح انہیں کثیر رقم ملتی ہے۔ ٹام، جم کے سامنے ایک اور ڈراما بھی بے نقاب کرتا ہے کہ برطانیہ ایک راگ مسلسل آلاپ رہا ہے کہ وہاں ہندوستان میں ہندو اور مسلمان رہتے ہیں اور وہ لڑتے رہتے ہیں۔ اس وحشی قوم کو ہم کنٹرول کرتے ہیں۔ اور امن و امان ہماری وجہ سے قائم ہے۔ ٹام، جم کی یہ بات سن کر ہنستا ہے کہ یہ سارا خود نو آباد کار کا پھیلایا ہوا پروپیگنڈا ہے محض تسلط قائم کرنے اور اسے طول دینے کا بہانا ہے اور کوئی بات نہیں۔ ''لندن کی ایک رات'' میں سجاد ظہیر، ٹام کی زبان سے نو آباد کار کے طریقہ واردات کو بے نقاب کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور یہ مختلف گوروں کو ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے ٹام کا کردار حقیقت آشنا ہے اور وہ ریاست کی پالیسیوں کی بھرپور مذمت کرتا ہے۔ سجاد ظہیر ایک گورے کی زبان سے اپنی نسلی بندوں کی جھوٹ پر مبنی باتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

> سجاد ظہیر اپنے کرداروں پر مشرق اور مغرب کی نمائندگی کا غیر ضروری بوجھ نہیں لادتے۔ یہ کردار جہاں کے ہیں اور جہاں Belong کرتے ہیں۔ وہیں کے نظر آتے ہیں۔[۳۸]

راؤ، اعظم اور ٹام نو آباد کار اور نو آبادی دونوں کے نمائندہ ہیں اور اس تسلط کو غلط سمجھتے ہیں۔ مگر اب سجاد ظہیر خواہ جو مرضی کر لیں ان کو اپنی حد سے آگے نہیں لے جاسکتے اک تو یہ کم تعداد میں ہیں دوسرا کمزور ہیں۔ اور نو آباد کار کے ہتھ کنڈوں کے سامنے بے بس ہیں۔ حقیقت جاننے کے باوجود کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔ اعظم کے مقابلے میں راؤ اگرچہ اپنی سی کوشش کر رہا ہے۔ اور اسی طرح اکثریت جس ڈراما کو حقیقت سمجھتی ہے ٹام اسے غلط سمجھتا ہے اور فرانس کی اور جرمنی کی برطانیہ سے جنگ کے پس منظر میں بات کرتے

ہوئے کہتا ہے کہ ہم یہ نہیں چاہیں گے کہ یہ دونوں ملک ہم (برطانیہ) پر قبضہ قائم کریں اور ہمیں نو آبادی بنائیں۔

راؤ اور ٹام الگ الگ نسلوں کے نمائندہ ہیں راؤ بھی نو آباد کار کو غلط کہتا ہے۔ برا سمجھتا ہے معاملہ فہم ہے مگر اس کے پاس ابھی تک کوئی ماضح مشکل میں راستہ موجود نہیں۔ مابعد نو آبادیاتی جائزہ لیتے ہو آج بھی بہت سے لوگ معاملہ فہم ہوتے ہیں اور حالات و واقعات کو صحیح پیمانے پر سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت شناس ہوتے ہیں مگر راؤ اور جم کی طرح ان کے پاس کو واضح منزل نہیں ہوتی۔ مگر اس ناولٹ (لندن کی ایک رات) کے مصنف کے ذہن میں ایک واضح منزل تھی۔ وہ کرداروں سے ان کی استطاعت کے مطابق کام کروار ہے ہیں۔ انقلاب لانا بھی راؤ اور چند ہم خیال لوگوں کے بس کی بات نہیں اور ٹام بھی کچھ کرنے سے قاصر ہے۔

> پہلی عالمی جنگ نے نو آبادیاتی علاقوں پر مغربی تسلط گھٹانے میں کوئی بھی کردار ادا نہیں کیا۔ کیوں کہ یورپ افرادی قوت اور وسائل مہیا کرنے کے لیے مغرب کو ان علاقوں کی ضرورت تھی۔ ٹام دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی پر اکٹھے ہونے والے عوامل پہلے سے سرگرم تھے۔[۳۹]

یہ دور اس قسم کا ہے کہ یہ کردار بھی تیار ہیں مگر وقت ان کا ساتھ نہیں دے رہا پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے باوجود اب بھی نو آبادی پر نو آباد کار کے پنجوں کی گرفت پوری طرح مضبوطی سے جمی ہوتی ہے اور اتنا موٹا تازہ شکار کوئی آسانی سے تھوڑا جانے دیتا ہے۔ مگر حالات ایک جیسے نہیں رہتے جنگ عظیم اول کے بعد حالات تبدیل ہونا شروع ہوتے ہیں اور خوف و دہشت کی گرفت ڈھیلی پڑنا شروع ہوتی ہے۔ اور بین الاقوامی سطح پر اس قسم کی صورت حال بن جاتی ہے کہ برطانیہ کو خود اپنی طرف دیکھنا پڑ جاتا ہے اور تمام توجہ اپنی طرف مرکوز کرنے کے لیے اسے اپنی نو آبادیوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور اس اثنا میں بہت سے ممالک برطانیہ سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں وہ ادھوری آزادی حاصل کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ مابعد اثرات مں بھنس جاتے ہیں۔

نعیم کا کردار ہندوستانی طالب علموں کا نمائندہ کردار ہے اور وہ بھی دیگر طالب علموں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ناولٹ (لندن کی ایک رات) میں نعیم کو مرکزیت حاصل ہے اگرچہ اس ناولٹ میں کوئی واضح ہیرو نہیں لیکن پھر بھی نعیم کو اس سے لیے مرکزیت حاصل ہے کہ یہ رات اسی کے کمرا پر گزاری گئی ہے۔

> اس ناول (لندن کی ایک رات) کا مرکزی کردار نعیم ہے۔[۴۰]

نعیم بھی دیگر کرداروں کی طرح ''بے عمل'' کرداروں میں ہی شمار کیا جا سکتا ہے لیکن اس کردار کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ اگر کسی طالب علم کو کوئی مسئلہ ہو تو نعیم اس کی مدد کر دیتے ہیں۔ خیر خواہی کا جذبہ اس میں موجود ہے۔ راؤ، اعظم اور احسان اشتراکیت کی تبلیغ کر کے خدمت کرنا چاہتا ہے اور لوگوں کو ہم خیال بنا کر انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔ ٹام چاہتا ہے کہ اس کا ملک نو آبادیوں کو آزاد کر دے ان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور اپنے وسائل استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔ نعیم بھی کسی کی مشکل نہیں دیکھ سکتا اور مدد کر دیتا ہے ظاہری طور پر اشتراکیت اور نو آبادیات جیسے چکروں سے آزاد ہے۔ سجاد ظہیر، نعیم کا تعارف تیسرے باب کے شروع میں اس طرح کرواتے ہیں۔

> نعیم الدین ان طالب علموں کے زمرہ میں تھا جو ہندوستان سے دو یا تین برس کی تعلیم کے لیے انگلستان جاتے ہیں اور وہاں جا کر پانچ چھ برس تک رکتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ والدین کو خواہ مخواہ ستانا چاہتے ہیں اور ان پر انگلستان میں معینہ معیاد سے زیادہ کا بار ڈالنا چاہتے ہیں اس وجہ سے نہیں کہ وہ کند ذہن کے سبب امتحان نہیں پاس کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو سستی کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔[۴۱]

نعیم کی طرح اکثر طالب علموں کے ساتھ یہی ایک معاملہ سستی والا بڑا خطرناک ہے اور یہی سستی برصغیر کو لے ڈوبی ہے نعیم جیسا اچھا خاصا لائق فائق طالب علم جب سستی کا شکار ہوتا ہے تو پھر وطن کی بھلائی کہاں رہ جاتی ہے۔ ایک طرف وطن ان کی خدمت سے محروم دوسری طرف اس کے والدین جو کماتے ہیں اس میں سے اچھی خاصی رقم وہاں اسے بطور خرچہ بھیج دی جاتی ہے۔ نعیم کے ہوتے ہوئے بہت سے طالب علم آتے ہیں اور مقررہ وقت میں اپنی ڈگری مکمل کر کے چلے گئے مگر ان کا نعیم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بس کمرے میں لیٹ کر آرام کرسی پر سارا دن گزار دیتا ہے۔ اور جب بھی اس سے تھیسس کے مطابق سوال کیا جاتا ہے تو صرف ایک ہی جواب دیتا ہے کہ ''بس پانچواں باب رہ گیا ہے'' اور یہ جواب کافی عرصہ سے دیا جا رہا ہے۔

''لندن کی ایک رات'' کے تمام کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور الگ الگ خاندانی پس منظر رکھتے ہیں۔ مگر مختلف مواقع پر سجاد ظہیر انہیں اکٹھے کرتے ہیں اور ان کی گپ شپ ناولٹ کی رونق بڑھاتی ہے۔ یہ کردار اپنے طرز عمل، ذہن، زندگی گزارنے کے انداز اور شخصیت میں ایک دوسرے سے جدا ہیں لیکن کچھ چیزیں ان میں مشترک ہیں ایک تو فضول باتوں میں گپ شپ کرتے ہوئے وقت گزارنا دوسرا زیادہ تر کردار بے عمل ہیں انہی میں سے نعیم بھی ہے۔ یہ سب ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ ایک نو

آبادی ہے مگر سوچ اور غلامی، آزادی نظریات کے بارے میں سب کی رائے مختلف ہے مگر یہ بات بار بار زیر بحث آتی رہی ہے کہ سجاد ظہیر ہمیں یہ کیوں دیکھا رہے ہیں جب اگر یہی کچھ جاننا تھا تو اس وقت کے اخبارات ور سائل ہمیں اس ناولٹ سے بہتر تصویر دیکھا دیتے ہیں۔ لیکن اصل کہانی اس ناولٹ میں یہ ہے۔

> سجاد ظہیر نے طالب علموں کی گپ شپ کے پردے میں ہی سہی انگریزوں کے ہندوستان پر طرز حکومت اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کے خلاف، اس ناول کو بھی رنگ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔[۴۲]

نعیم کا کمرہ بھی ''گپ شپ'' کا مرکز ہے اور سب طالب علم نعیم الدین کے دوست ہیں اور اس کے قریب ہیں اسی لیے مختلف لوگ اس سے مدد حاصل کرتے ہیں اور '' کالے لوگوں'' کے ساتھ ساتھ '' گورے بھی ان کی پارٹیوں میں شامل ہوتے ہیں۔ گویا ان کا رہائشی کمرہ ایک مشترکہ کلب ہو گیا اس لیے نعیم الدین کے کردار کو دیگر کرداروں کے مقابلے میں مرکزیت حاصل ہو جاتی ہے۔

نعیم الدین کے کمرے میں بند رہنے کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے کہ وہ موٹا ہو گیا ہے۔ اور اس کی توند باہر نکل آئی ہے اور اس نے خود یہ سمجھ لیا ہے کہ میں جسمانی لحاظ سے اور اپنے خدوخال کے حساب کتاب میں بد مشکل ہو گیا ہوں اور اعظم، راؤ کی طرح اسے گوری لڑکیاں کوئی لفٹ نہیں کرواتیں اور اس سے عشق نہیں لڑاتیں۔ یہ احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے لیے کافی ہے۔ دوسری حد یہ ہے کہ سجاد ظہیر نے نعیم الدین کو ناولٹ میں جگہ کیوں دی۔ نعیم الدین ہندوستانیوں کی سستی کا نمائندہ کردار ہے۔ اور یہی سستی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے کہ ہم کام کیے بغیر حالات کو بدلنا چاہتے ہیں۔

روحانیت، بے عملی، کاہلی ہندوستان کو لے ڈوبی ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو کاہلی و سستی ہندوستانیوں کا ورثہ ہے اور آج بھی بہت سے طالب علم جو برطانیہ میں تعلیم کی غرض سے مقیم ہیں۔ وہ نعیم الدین کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ایک طرف وقت کا ضیا کرتے ہیں تو دوسری طرف بہت سا روپیہ پیسا وہاں منتقل ہوتا ہے۔ آج کل بڑے لوگوں میں لندن سے یا اکسفورڈ سے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور یہ بات ان کے لیے قابل فخر ہوتی ہے اور آج بھی جاگیر داروں اور بڑے لوگوں کے سو فیصد بچے انگلستان سے ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

> نعیم بھی بے عمل ہے تصورات کی دنیا میں رہتا ہے لیکن وہ اس حد تک گرا ہوا کردار نہیں جس طرح کا ہمیں اعظم کے روپ میں ملتا ہے۔[۴۳]

اعظم اور راؤ، نعیم الدین کے مقابلے میں لڑکیوں اور شراب کے معاملے میں بڑے بے تکلف ہیں کھل کر بات چیت کرتے ہیں کسی کا کوئی لحاظ نہیں کوئی شرم نہیں۔ گوری لڑکیوں کا شکار کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے لیکن نعیم رکھ رکھاؤ والا بندہ ہے اور عزت نفس کا تصور بھی نعیم اور جین کے ہاں وجود ہے۔ اور خود کلامی میں جب شیلا گرین اس کے کمرہ میں موجود ہوتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ شاید شیلا مجھے اس قابل نہ سمجھے کہ مجھ سے عشق کیا جائے یہاں بھی وہ احساس کمتری کا شکار نظر آتا ہے۔ اگرچہ بعد میں وہ کھل کر شیلا سے عشق پر بات کرتا ہے اور نعیم الدین اپنے عمل سے شیلا پر اپنی محبت واضح کر دیتا ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی اور کو چاہنے کی وجہ سے نعیم کو رد کر دیتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنی گفتگو کے بارے میں سوچتا ہے۔

> اب یہ لڑکی اتنی دیر سے یہاں ہے۔ اور مجھ سے ایک بھی ٹھکانے کی بات نہیں کی جاتی۔ اپنے دل میں خیال کرتی ہوگی کہ کتنا غیر دل چسپ گھامڑ آدمی ہے۔"[۴۴]

نعیم الدین لڑکیوں کو ورغلانے میں اعظم اور راؤ اور دیگر طالب علموں سے بہت پیچھے ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس عشق اور لڑکی کے درمیان میں میری توند آ جاتی ہے۔ لیکن موقع ملنے پر اپنی سی کوشش نعیم بھی کرتا ہے۔ اگرچہ اس کوشش میں وہ ناکام ہی رہتا ہے۔ شیلا گرین سے نعیم کی گفتگو بنیادی طور پر شاعری آرٹ، اور فلسفہ کے گرد گھومتی ہے اگر نعیم اور شیلا گرین کی گفتگو ٹائم پاس ہے کیوں کہ اور ساری رات کیسے گزار دی جاتی۔ نعیم کی سستی پورے ہندوستانیوں کی نمائندگی کر رہی ہے۔ اور وہ یہی کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ ہمارے (ہندوستانیوں) کی سستی کی وجہ شاعری ہو کیوں کہ یہ عقل کو منجمد کر دیتی ہے۔ اور سوچنے سمجھنے کی حس ختم ہو جاتی ہے۔

نعیم الدین اگرچہ ہندوستان میں تعلیم کے دوران بہت لائق تھا اور پڑھنے والوں میں شمار ہوتا تھا مگر لندن میں وہ تقریباً ناکام ہو چکا ہے۔ اور سجاد ظہیر نے نعیم الدین کو ایک سنجیدہ کردار کے روپ میں پیش کیا ہے اور خود دیگر عیاشی کے کاموں میں دل چسپی لیتا ہے مگر جب اسے بھی تھوڑا سا موقع ملتا ہے تو وہ بھی دیگر ساتھی ہندوستانی طالب علموں کی طرح گوری پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیتا ہے۔ اور مغربی لڑکی شیلا گرین سے آرٹ کے موضوع پر ہونے والی گفتگو میں یہ (نعیم) نام نہاد لائق فائق طالب علم بری طرح پھنس جاتا ہے۔ اور اس کے پاس کوئی مناسب جواب نہیں بن پڑتا۔ نعیم روایتی انداز میں اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر آرٹ کی بحث میں وہ بار بار ناکام ہوتا ہے اور بار بار اس کے سراپا پر نظر دوڑاتا ہے۔ ایک طرف شیلا گرین کے سامنے لاجواب نعیم الدین دوسری طرف کریمہ بی بی کو مختلف باتوں میں لاجواب کر دیتا ہے۔

> نعیم اور اس کے دوستوں کی پر جوش گفتگو ایک بہادر نئی دنیا کے خوابوں سے معمور ہے
> اپنی تقدیر اور اپنے وطن کی تقدیر میں نقطہ اتصال کی تلاش ہے۔۔۔[۴۵]

لیکن اس بہادر دنیا تک رسائی کیسے ممکن ہے۔ کیا آرام کرسی پر پڑا رہنے سے یا سارا دن اِدھر اُدھر کی باتوں میں کرنے سے کوئی تبدیلی آسکتی ہے ایسا ممکن نہیں۔ عملی جدوجہد کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں نعیم الدین کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ اور احساس ہے کہ وہ کس راستہ پر چل رہا ہے مگر وہ پھر بھی بے اختیار ہے۔ وہی مشرقی سستی آڑے آرہی ہے نہ وہ کھل کر لڑکی سے اظہار محبت کر سکتا ہے اور نہ وہ کوئی وطن کے لیے کام کر رہا ہے۔ دوستوں کے بار بار شرم دلانے کے باوجود اپنا مقالہ مکمل نہیں کر پا رہا۔ آج کل پر کام چھوڑتا جا رہا ہے۔

> زندگی کی حقیقت اگر تلخ ہے تو اسے بھلانا ہی بہتر ہے۔[۴۶]

نعیم خیالی دنیا کا بندہ ہے اور خیالوں میں رہنا پسند کرتا ہے۔ وہ دنیا کو چشم تصور سے دیکھ کر اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ شعر و شاعری کر کے شعر یاد کر کے، گانے سن کر ڈانس کر کے سگریٹ پے سگریٹ پی کر وہ اصلیت اور حقیقت سے دور بھاگ رہا ہے۔ کئی دفعہ وہ اپنا ماضی دیکھتا ہے کہ ہندوستان میں اچھا لائق اول درجے میں پاس ہونے والا طالب علم تھا۔ مگر یہاں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ بے حسی اسی خیالی دنیا کو گلے لگائے ہوئے ہے۔ نعیم سوچتا ہے کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم اصل دنیا کی تکلیفوں، پریشانیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ یا الفاظ دیگر جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے سوچتا ہے کہ بلی اسے نہیں دیکھ پا رہی۔ یہی اصول نعیم الدین کا ہے۔ جب شیلا گرین اپنی پوری کوشش کرتی ہے کہ اسے حقیقی دنیا سے روشناس کروایا جائے۔ مگر نعیم الدین ایک ہی ڈگر پر سوچنے والا بندہ ہے۔

> نعیم الدین صاحب کی مقبولیت کے اسباب کیا تھے؟ خود یہ حضرت انتہائی کال ہیں۔ چھ سات سال سے ٹکے ہونے کے باوجود بھی اپنے تھیسس پر شائد ابھی ابتدائی کام بھی نہیں کیا ہے۔۔۔ سیاست سے انہیں کوئی دل چسپی نہیں بس اپنی ذات ہی ان کی ساری سوچ اور خود کلامی کا مرکز ہے۔ اور غم صرف یہ کہ کوئی لڑکی ان پر عاشق کیوں نہیں ہوتی۔[۴۷]

جس طرح اعظم کا دماغ جین پر اٹکا ہوا ہے اور وہ بار بار اسی کو سوچتا ہے۔ نعیم الدین کا اپنی ذات کے بارے میں سوچنے کا بھی یہی حال ہے۔ کہ بار بار وہ اپنی توند کو دیکھتا ہے اور اپنے خدوخال کو دیکھتا ہے اپنی عمر کا

اندازہ کرتا ہے غرض وہ گوری لڑکیوں اور خود کے درمیان اپنی توند کو پاتا ہے۔ کہ یہی میرے عشق میں بہت بڑی رکاوٹ ہے لیکن ورزش کا تکلف بھی گوارا نہیں سارادن آرام کرسی پر لیٹے رہنے سے توند کم نہیں ہو سکتی۔ ملکی سیاست سے اسے کوئی دل چسپی نہیں دوسری طرف اس کے سارے دوست جن میں احسان، راؤ، اعظم اور دیگر چند ایک اشتراکی ہیں اور یہ نظریہ دنیا میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے اور یہ ان کے لیے امید افزا بات ہے۔ طالب علم ہی نہیں پوری دنیا میں یہ موضوع بحث ہے مگر نعیم الدین صرف اور صرف لڑکی کو سوچتے ہیں۔ لڑکی بھی وہ موجود چل کر آئے موصوف کو کہے مجھے تم سے پیار ہے۔ ان میں تو اتنی جرات نہیں کہ اس کو یہ الفاظ کہہ سکیں۔

نعیم الدین کی مرکزیت اپنی جگہ اور ناولٹ (لندن کی ایک رات) میں زیادہ صفحات پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں مگر میرے خیال میں اسے مرکزی کردار شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی ایسے کردار کو ہم محض اس وجہ سے مرکزی کردار نہیں کہہ سکتے کہ اس کی شمولیت زیادہ صفحات پر محیط ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' کے کرداروں میں نعیم الدین کو ہی بطور ہیرو شمار کرتے ہیں جو بہت کم حد تک ٹھیک ہے ایک ''سپاٹ'' کردار کا حامل نعیم الدین بہت کم اثر انداز ہو رہا ہے سجاد ظہیر نے ایک طرف دیکھا جائے تو انہیں ٹھیک کردار ہی دیا ہے کہ اپنی بھلائی اور اچھے سلوک کی وجہ سے یہ یعنی نعیم الدین کا مکان اچھی بیٹھک ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک حد تک مان لیتے ہیں کہ نعیم الدین کا کردار خانہ پری ہی سہی مگر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر سارے سیاست دان اکٹھے ہو جائے تو گفتگو بے مزہ ہو جاتی۔

> راؤ کی بات اور ہے وہ سائنس دان کی مانند، بے لوث مشاہدے اور تجزیے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ فکری اور جذباتی جہتوں کا نہایت معروضیت کے ساتھ تجزیہ کرتا ہے۔۔۔[۴۸]

راؤ کے مقابلے میں نعیم الدین سرسری طور پر حالات و واقعات کا جائزہ لیتا ہے اور بس سن لی عملی جدو جہد جس طرح اس کے دیگر دوست کر رہے ہیں اس سے وہ دور ہے عشق بازی کا شغل ہے۔ جو دو تین سال کی ڈگری چھ سات سال سے لے کر بیٹھا ہے۔

نعیم الدین کے کردار کو اگر ہم آج کے تناظرات میں دیکھیں تو اس طرح کے ایک نہیں ہزاروں، لاکھوں کردار جن کا تعلق برصغیر سے ہے اب خواہ وہ مشرق میں موجود ہیں یا مغرب میں وہ ایسے ہی سوچتے اور اسی طرح کے خیالات رکھتے ہیں۔ کہ ہم ''تصور جاناں'' کیے ہوئے ہم بیٹھے رہیں اور تمام کام پایا تکمیل کو پہنچ

جائیں مغربی ملکوں میں آج بھی ڈگری کے لیے جانے والوں میں سے بہت سے طالب علم محض وقت گزاری کر رہے ہیں۔

نعیم الدین کا حال دریا کے کنارے کھڑے اس بگلے کا سا ہے۔ جو نیم مردہ نظر آرہا ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ یہ ابھی گر کر مر جائے گا۔ مگر جب شکار قریب آتے ہی اس کے جسم میں بجلی دوڑ جاتی ہے اور ایک سیکنڈ بعد شکار اس کی چونچ میں ہوتا ہے یہ موصوف بھی آرام کرسی پر تشریف فرما تھے کہ شکار آگیا اب یہ اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہے۔ اور اپنی جال اس کے گرد پھینک رہا ہے اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ اب پر جانے نہ پائے۔ ''لندن کی ایک رات'' میں شیلا گرین کا کردار بھی مشرقی اور مغربی ذہنیت کے تناظر میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

> اس ناول کے کرداروں میں شیلا اور نعیم نمایاں ہیں جو اپنی تنہائی کی وجہ سے ایک دوسرے کی طرف چلے آتے ہیں۔ ''لندن کی ایک رات'' کا ساتھ مگر ان کے درمیان عشق واڈرت بن کر سامنے نہیں آتا۔ سجاد ظہیر نے ان کے خالص انسانی Dimension پر زور دیا ہے۔[۴۹]

شیلا گرین کی کہانی عجیب طرح کی ہے جو کچھ قاری سوچ رہا ہوتا ہے جو ایک منظر وہ پہلے ذہن میں تخلیق کرتا ہے وہ محض خیال ہی رہتا ہے اور اس منظر سے سب کچھ مختلف ہوتا ہے۔ ایک طرف شیلا گرین کی اپنی سابقہ محبت ہے۔ اس کی کسک ہے، یاد ماضی ہے اپنے عاشق کی فکر ہے جو کہ ایک آزادی پسند باغی ہے۔ مگر دوسری طرف راؤ (مسٹر براڈ) سے عشق ہے۔ اس کے ساتھ ناچنا گانا، دوسری طرف نعیم اور شیلا گرین کا قریب آتا ہے۔ مگر یہ محض تنہائی کی وجہ سے ہوا۔

شیلا گرین اور ہیرن پال کا عشق اور شیلا کا یہ داستان محبت سننا دراصل ایک مثالی اشتراکی کی زندگی کو بطور ماڈل پیش کرنا ہے۔ سجاد ظہیر نے کمال مہارت سے شیلا کو نعیم کے ہاں پہلے پہنچایا اور وہ سب سے بعد میں نعیم کا کمرا چھوڑتی ہے۔ اور نتیجہ قاری کی سوچ سے الٹ نکلتا ہے۔

ایک سوال خاصہ اہمیت کا حامل ہے کہ ایک مرد مجاہد جو میدان میں عملی جدوجہد پر یقین رکھتا ہے وہ بھلا عشق وشق کے چکر میں کیسے اتنا وقت برباد کر سکتا ہے شیلا گرین نعیم اور ہیرن پال کے کرداروں کی ایک تکون بن گئی ہے۔ یہ تینوں کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور ان کے الگ الگ نفسیاتی الجھاؤ ہے۔

اس ناول (لندن کی ایک رات) کے کرداروں میں شیلا گرین اور نعیم نمایاں ہیں۔ جو
اپنی ابتداا اور تنہائی کی وجہ سے ایک دوسرے کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔[۵۰]

نعیم اور شیلا گرین کی گفتگو اور ایک دوسرے کے قریب آنے میں ان دونوں کی تنہائی کا بہت بڑا عمل داخل ہے۔ شیلا گرین ایک ''کالے نیٹو'' سے کیوں پیار کرے یا اسے کیوں اپنے قریب آنے دے اور وہ ایک اعلیٰ نسل یعنی گوری ہے لیکن وہ ابھی تک ہیرن پال کے حصار سے نکل نہیں پا رہی۔ نعیم اور شیلا گرین کی گپ شپ اپنی جگہ مگر یہاں ناولٹ (لندن کی ایک رات) میں نعیم اور ان کے کردار کی یہ اہمیت ہے کہ اس نے اپنا مکان اپنے دوستوں کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ اور جب کہ اس کے اکثر دوست نو آباد کار کے خلاف ہیں اور اشترا کی نقطہ نظر رکھتے ہیں پھر بھی وہ ان کی باتیں سنتا ہے اور ممکن ہے کہ اس حوالے سے ان دوستوں کی مدد بھی کرتا ہو۔

شیلا گرین کا کردار خیالی دنیا میں رہنے والا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اصل دنیا صرف وہی تھی جب اسے ہیرن پال کا ساتھ حاصل تھا۔ لیکن راو سے اس کا بھی عشق ہے اور پارٹی میں بھی آگئی ہے۔ شیلا کا کردار محض ایک مثالی دوسرا کردار (ہیرن پال) پیش کرنے کے لیے لیا گیا ہے۔

وہ یہی سوچ رہی تھی (جب نعیم الدین اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے) کہ
بس وہی رات اصلی تھی ہم دونوں جب (ہیرن پال، شیلا گرین) کھڑکی کے نزدیک جا کر
کھڑے ہو گئے تھے۔۔۔[۵۱]

لیکن اب شیلا گرین بخوبی یہ بات جان گئی ہے کہ ہیرن پال کے عشق کا معاملہ اب ختم ہونے کے قریب ہے بلکہ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن شیلا گرین اب بھی نعیم الدین سے دور ہنے کی کوشش کر رہی ہے کہ شائد نو آبادی کا یہ باشندہ بھی جلد یا بادیر انگلستان کو چھوڑ جائے گا اور میں یہ کہانی دوہرانا نہیں چاہتی۔ اس لیے قاری ابتداء سے ہی سمجھ لیتا ہے کہ اب ایک نئی کہانی نعیم الدین اور شیلا گرین کے عشق کی شروع ہونے والی ہے۔ مگر سجاد ظہیر ایک حکمت عملی سے کہانی کا رخ موڑ دیتے ہیں خود سجاد ظہیر بھی سوئٹزر لینڈ میں تھوڑے عرصہ کے لیے مقیم رہے کہیں خود یہ سجاد ظہیر کی آپ بیتی تو نہیں۔ مگر یہ محض ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب نہیں ملا ''روشنائی اور یادیں'' کے سوا کسی واقع سے اس بات کی طرف اشارہ نہیں ملتا کہ یہ آپ بیتی ہے یا جگ بیتی ہے۔ لیکن یہاں ہیرن پال کی گفتگو سجاد ظہیر کی سوچ اور اس کے عمل کا بھرپور عکاس ہے۔

میں کالا' تم گوری' میں غلام '، ' تم آقا'۔۔۔[۵۲]

''میں بت پرست'' سے یہاں مطلب ہندوستان ہے کہ ہم میں کوئی بات مشترک نہیں مذہب ہے وہ بھی ایک دوسرے کی ضد اور سب سے بڑھ کر رنگ ہے، ''کالے'' اور گور کا فرق نہ ختم ہونے والا ہے اور ان سب پر بھاری فرق یہ کہ تم (شیلا گرین) فاتح اور ہم مفتوح۔ ایک کی جان کی بہت زیادہ قدرو قیمت جب کہ کالے لوگوں کی جان کیڑے مکوڑوں کی جان سے بھی سستی۔ جس طرح ''لندن کی ایک رات'' میں جگہ جگہ اس بات کو دوہرایا جاتا ہے، یہ ایک گورے کی جان گئی تو کالے پندرہ کی جائے گی پھر بھی حساب کتاب برابر نہیں ہوتا۔

مابعد صورت حال کا جائزہ لیں تو آج بھی اسی نو آبادیاتی دور کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ آج دنیا میں کہیں بھی جتنے لوگ مارے جائیں ان پے کوئی آواز اٹھانے والا کوئی نہیں اور رب کی مرضی سمجھ کر خاموشی اختیار کر لیا جاتی ہے وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ بے بس ہیں افغانستان، عراق، غرض جہاں بھی گورے فوجی ہیں اگر وہ تمام عوام کے کو قتل کر دیں تو بھی کوئی سوال کرنے والا نہیں ہوتا ہاں اگر کوئی ایک بھی گورا ما جائے تو بم باری کر کے پورے کے پورے علاقے کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ آج بھی نو آبادی کے لوگ گوروں سے ہاتھ ملانے کو ایک بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں اور یہاں تک کہ دیکھنا بھی بہت بڑی بات ہے۔ لیکن یورپ میں آج بھی نو آبادی کے لوگوں سے نفرت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان باشندوں سے ہاتھ ملانے تک کو گوارا نہیں کیا جاتا۔ ابتداء سے ہی سستی مزدوری کے لیے پسماندہ ممالک پر تسلط قائم کیا گیا اور آج بھی ترقی پذیر ممالک سے مزدور ہی اور کلرک پیدا کر رہے ہیں۔ دنیا چاند پر پہنچ گئی اور ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سو سال پہلے کھڑے تھے۔

ہیرن پال ایک اشتراکی ذہن رکھنے والا نوجوان ہے۔ وہ ایک ایسا کردار ہے جو'' لندن کی ایک رات'' سے غائب بھی ہے اور اہمیت کا حامل بھی ہے ۔ناولٹ سے غیر حاضر ہونے کے باوجود اس کے احساسات وخیالات ہم تک پہنچ رہے ہیں شیلا گرین اپنے معاشقے کی داستان سناتی ہے۔ جس داستان کا ہیرو ہیرن پال ہے۔ ہیرن پال کا کردار نعیم الدین اور دیگر ان لوگوں سے مختلف ہے۔ جو محض خیالات یا نظریات کی حد تک اشتراکی ہیں جب رشتہ دار غرض کوئی بھی اس کے راستے کی دیوار نہیں۔ وہ سب کو چھوڑ کر اپنے اشتراکی نظریہ کو لاگو کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے لیے وہ اپنے بنگالی دوستوں کو ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور دیگر اشتراکیوں کے مقابلے میں آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور اس کے کیا نتائج نکلیں گے ان سے بخوبی

واقف ہے۔ کہ ہو سکتا ہے مجھے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ شیلا گرین، ہیرن پال کا ایک واقعہ سناتی ہے جس سے اس کی سوچ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

> ۔۔۔ ہمارے ہاں ایک تیسری قسم اور ہے باتیں کرنے والوں کی یہ لوگ سمجھ دار ہیں۔۔۔ ان میں زندگی کو سمجھنے کا مادہ ہے ہر چیز کی اصلیت اور وجہ جانتے ہیں لیکن بس وہ اگے بڑھنے سے معذور ہیں۔[۵۳]

ہیرن پال ہندوستان میں سوچنے والوں انسانوں کی مختلف اقسام بتاتا ہے ایک قسم تو حالات کو سوچنے سمجھنے سے قاصر ہے غلامی یا آزادی سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑھتا۔ سجاد ظہیر یہاں بنیادی طور پر یہ بات کرنا چاہتے ہیں کہ معاشرہ، ملک کو عملی کوشش سے بدلا جا سکتا ہے محض باتیں کرنے سے نہیں۔ ناولٹ میں بار بار معاشرہ کے بے عمل لوگوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

کیوں کہ اشتراکیت میں انقلاب کے ذریعے تبدیلی کا درس دیا جاتا ہے۔ ہیرن پال (مثالی کردار) بھی عملی جدوجہد پر یقین رکھنے والا جوان ہے ایسے جوان آنے والے حالات سے واقف ہوتے ہیں مگر وطن کے لیے وہ جان تک گنوانے کو تیار ہوتے ہیں۔ اشتراکیت پسند طبقہ کو معاشرہ کے لیے کارآمد لوگ پسند ہوتے ہیں اور بے مقصدی زندگی گزرانے والے کھیتوں کی کھاد۔ لیکن کوشش سے بہت کچھ بدلا جا سکتا ہے اس لیے ہیرن بھی مایوس نہیں ہے۔

> آج دن میں جب میں تم سے (شیلا گرین) اپنے وطن کی باتیں کر رہا تھا تو میں نے صرف وہاں کی تلخ حقیقتوں کا ذکر کیا، تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے، وہاں بہت سی اچھی چیزیں بھی ہیں شام کے وقت جب برسات میں سورج ڈوبتا ہے اور آسمان پر آگ لگ جاتی ہے ۔۔۔ سرسبز میدانوں کے بیچ سے گزرتے دریا پگھلی ہوئی چاندی کی لکیر بن جاتی ہے۔[۵۴]

انسانوں کی اچھائی کے حوالے سے یہاں کسی اچھائی کا کوئی وجود نہیں۔ سارا ہندوستان بے حسی کی نیند سو رہا ہے۔ جو ہے جیسا ہے سب ٹھیک ہے۔ اسی بے حسی کا فائدہ نو آباد کار اٹھا رہا ہے۔ آج بھی پاکستان میں اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والے بڑے لوگوں کو ہضم نہیں ہوتے۔ اشتراکی ذہن رکھنے وایے ہمیشہ ہدف رہے ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے حقوق چاہتے ہیں جو سرمایادار دینے کو تیار نہیں اور آواز اٹھانے والا ان کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔

جب شیلا گرین، نعیم الدین کو آخر میں بتاتی ہے کہ اب میر اہیرن سے رابطہ نہیں پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہے یا قید ہے تو نعیم اسے جواب دیتا ہے۔ یہاں ہندوستان کے حالات کی حقیقی تصویر ملتی ہے اور مابعد بھی یہی صورت حال چل رہی ہے۔ یہ بات آج بھی پاکستان پر صادق آتی ہے۔

ہندوستان میں قید ہونے کے لیے مجرم ہونا ضروری نہیں آزادی کی خواہش اس کے لیے کافی ہے۔۔۔ ۵۵

نعیم الدین کی باتیں بلکل درست ہیں کہ تیسری دنیا میں انسانی جان ومال کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آج بھی پاکستان میں لوگ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ بغیر عدالتی اجازت کے لوگوں کو قید و بند میں رکھا جاتا ہے۔ کسی ڈرامے ،افسانے ،ناول یا ناولٹ میں کرداروں کی کئی طرح کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ تمام طرح کی ذمہ داریوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کردار تخلیق کار کے شخصیت و نظریات کے عکاس ہوتے ہیں۔ وہ اسی کی زبان بولتے ہیں۔ تخلیق کار خود سامنے نہیں آسکتا اور تمام کام انہی کرداروں سے لیتا ہے۔ کردار ایک طرف کہانی کو اگے لے کر چلتا ہے تو دوسری طرف وہ تخلیق کار کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی لکھاری اپنے مخالف نظریات رکھنے والے کردار کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ''لندن کی ایک رات ''میں احسان بھی اسی طرح کا کردار ہے ایک طرف وہ کہانی کے تقاضے دوسری طرفخود سجاد ظہیر کے خیالات کی اشاعت کا فریضہ پورا کرتا نظر آتا ہے۔ احسان پارٹی میں آتا ہے اور یہ واحد کردار ہے جو اپنی منزل کا تعین کر چکا ہے۔

سجاد ظہیر کو ہم احسان کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے یہ خود سجاد ظہیر ہے۔ کیوں کہ یہاں احسان مکمل طور پر اشتراکی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اور دیگر ساتھیوں کو ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں خود تخلیق کے خدوخال نمایاں نظر آتے ہیں۔

احسان عقلیت پسند ہے۔ انسانی نفسیات کی باریکیوں کو خوب سمجھتا ہے اور دوسروں کے بھرم چاک کرنے میں بڑا لطف لیتا ہے۔ حالات کے سامنے سرنگوں ہونے کی بجائے تصادم اور پھر تبدیلی اس کی کوشش ہے۔۔۔ ۵۶

احسان ایک ایسا کردار ہے جو ایک واضح مشن رکھتا ہے۔ یکسو ہو کر اپنے مشن کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ وہ ایک نبض شناس حکیم ہے ،ہر طرح کے لوگوں کی نفسیات اور خامی کو نشانہ بناتا ہے۔ اس کا ہمیشہ دو ٹوک موقف رہا ہے۔ احسان ایک انقلابی اشتراکی مجاہد ہے وہ مغرب سے اچھی باتیں لینا چاہتا ہے مگر اندھی

تقلید کے خلاف ہے۔ مشرق کو اچھی باتیں اپنانی چاہیں۔ پورے برصغیر کی تصویر سجاد ظہیر کے پیش نظر تھی اور وہ اپنے ملک کی صورت حال سے اچھی طرح واقف تھے ہماری تہذیب و ثقافت کیا ہے؟ اور نو آبادکار ہمیں کس طرف لگا رہا ہے۔

احسان جسمانی طور پر تو لندن میں رہتا ہے مگر ذہنی طور پر وہ اپنے وطن ہندوستان میں رہتا ہے۔ وہ جل کر مختلف طالب علموں کو ان کی اوقات یاد دلاتا ہے۔ ایک طرف وہ لوگوں کو ہم خیال بنا کر اپنے وطن کی تقدیر بدلنا چاہتا ہے، دوسری طرف وہ ایک منصفانہ تقسیم پر اپنے ملک کی بنیادیں استوار کرنا چاہتا ہے۔ ایک مواقع پر وہ اپنے دوستوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

> تم سب کے سب رئیس، بنیے، محاجن، برسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، سرکاری نوکر 'جونک' کی طرح ہو اور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کے زندہ رہتے ہو یہ حالت قیامت تک نہیں قائم رہے گی، کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے لاکھوں، کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے۔ اس دن تم سب کا ختمہ ہو جائے گا۔[۵۷]

یہ دور ایسا دور ہے جس میں اشتراکیت کا آزادی سے خاص تعلق پیدا ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں اشتراکیت بھی ایک آزادی ہی ہے۔ ایک طرف تو نو آبادکار سے آزادی تو دوسری طرف سرمایادار طبقہ سے آزادی جن کا ذکر احسان درج بالا پیہرا گراف میں کرتا ہے سرمایادارانہ معاشرہ میں مزدوروں اور کسانوں کی بہت بڑی تعداد بستی ہے یہ ایسا طبقہ ہوتا ہے جن کو مکمل آزادی نصیب نہیں ہوتی یہ ایک مشین کا پرزہ ہوتے ہیں۔ سرمایادار ان کو بس زندہ رکھتا ہے۔ انہیں کوئی حقوق حاصل نہیں ہوتے۔

سجاد ظہیر، احسان کی شکل، میں ایک ایسا کردار سامنے لاتے ہیں جو آزادی کو اشتراکیت کے تناظر میں دیکھتا ہے دولت کی منصفانہ تقسیم چاہتا ہے۔ حقوق برابر چاہتا ہے یہ نہیں کہ ایک بہت بڑے طبقہ کو انسان بھی نہ سمجھا جائے۔ انقلاب روس کے بعد اشتراکیت پسندوں کے بڑی امید پیدا ہوئی کہ اب وہ دن دور نہیں جب ہمارے وطن میں اشتراکی طرز حکومت ہوگی۔

برطانیہ اور ہندوستان کے مقامی حصہ داروں نے عام مزدوروں اور غریب کسانوں کو بے دردی سے لوٹا۔ دونوں طبقوں نے دونوں ہاتھوں سے لوگوں کا خون نچوڑا۔ انسانوں کو زندگی کی حیوانی سطح پر

لا چھوڑا۔ سرمایادار کے سامنے تو انسانی ہمدردی بے معنی چیز ہے ۔ایک غیر منصفانہ بنیادوں پر قائم معاشرہ آزادی کے کیا معانی لے سکتا ہے۔

سجاد ظہیر نے ان حوالوں (اشتراکی) کے سہارے خود اپنے افکاروخیالات کا پرچار کرتا ہے۔[۵۸]

یہ دور ایسا دور ہے جس میں دوسری جنگ عظیم کے لیے حالات ساز گار ہو رہے ہیں،اور دوسری طرف اشتراکیت کا الم بلند ہو رہا ہے۔جنگ عظیم اول کے بعد برطانیہ کی اپنی نو آبادیوں پر وہ پہلے والی گرفت نہیں قائم رہی تھی۔اس دور میں نو آبادیوں کے لیے امید پیدا ہو گئی تھی کہ ان ہمیں بھی ممکن ہے خلاصی نصیب ہو۔اور ہم (اہل ہندوستان) بھی آزادی حاصل کر پائیں۔

''یادیں''اور ''روشنائی'' کے تناظر میں احسان ہی خود سجاد ظہیر ہے۔اصل مقصد اشتراکیت کی تبلیغ کرنا ہے دیگر باتیں تو قصے کی ضرورت پوری کرنے کے کہی جا رہی ہیں، سجاد ظہیر کے نظریات اس کے دوستوں پر عیاں ہیں، کہ یہ پکا اشتراکی ہے۔خود قاری کے لیے اس کا اندازہ لگا مشکل نہیں ہے۔جب احسان بالا طبقہ پر تنقید کرتا ہے تو خان اسے جواب دیتا ہے۔

یہ (احسان) الشویک کہاں 'شے' آ گیا۔[۵۹]

لندن کی ایک رات میں ہمیں سرمایادارانہ نظریات اور اشتراکی نظریات کی ایک جنگ کی صورت حال نظر آتی ہے گویا دنیا میں اشتراکیت نے اپنی جگہ بنالی ہے اور اب یہ نظریہ اپنے آپ کو پھیلا رہا ہے، دنیا کو ان اشتراکیوں سے خطرے کی بو آنا شرع ہو گئی ہے۔ہر ممکنہ کوشش جی جا رہی ہے کہ اس سوچ کو اور اس سوچ کے پیروں کاروں کو جلد ختم کر دیا جائے۔اسی لیے اس انقلاب پسند نوجوان (احسان) سے ان کی دشمنی بن گئی ہے۔احسان اپنے ذہن میں ایک واضح منزل سوچ چکا ہے، عملی کام ابھی شروع ہونا ہے۔

اب اس اشتراکی نظام کی مثال معرض وجود میں آچکی ہے۔جو کہ انقلاب روس ۱۹۱۷ء ہے۔اس ایک کامیابی کے بعد اب اس نظریہ کے لیے کوشیش تیز تر کر دی ہیں۔اور میدان میں اترنے کی تیاری ہو رہی ہے۔جدی نواب خان جب احسان کو اشتراکی ہونے کا طعنہ دیتا ہے تو وہ اسے شرمندہ ہوئے بغیر جواب دیتا ہے۔

انقلاب سے پہلے آپ کی طرح (خان) کے جانور روس میں پائے جاتے تھے بالشویکیوں نے ان کو اپنے کھیتوں کی کھاد بناڈالا۔۔۔[۶۰]

احسان ایک انقلابی جوان ہے۔ معاشرہ کے لیے بے فائدہ لوگ نہ ہوں یا ہوں ان سے کیا فرق پڑتا ہے اس نے ہمیشہ عام مزدوروں، غریب کسانوں کے حقوق کی بات کی ہے، اور ان کو سرمایادار کے منافع میں برابر حصہ دیلانے کی بات کی ہے۔ راؤ، اعظم، اور چند دیگر طالب علم اور ان کی طرح کے کئے اور جوان ابھی مکمل طور پر اشتراکی نہیں ہوئے مگر جھکاو ہے ان کا اس طرف اور ممکن وہ بھی جلد اس طرف آ جائیں۔ اگرچہ "لندن کی ایک رات" میں مجموعی طور پر لندن میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا قصہ ہے۔ اصل بات پردے میں چھپا کر کہی گئی ہے "انگارے" کے بعد سیدھا اپنا موقف کا بیان مشکل تھا اس لیے ظاہری طور پر یہاں اور کہانی ہے لیکن اندر اور کہانی چل رہی ہے۔ لیکن اب حالات پہلے کے مقابلے میں بہت بدل چکے تھے۔ پھر بھی یہی مناسب تھا کہ بات کو اس انداز میں کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لٹھ بھی بچ جائے۔ ایک شرابی بھی سجاد ظہیر کے الفاظ بولتا ہے۔ اس دور میں سیاست اہم موضوع تھا۔ ناولٹ کا ہر کردار کسی نہ کسی حوالہ سے سیاست سے منسلک ہے۔ اسی ہر کردار ذہنی طور پر دو حصوں ن میں منقسم ہے۔ دنیا میں دو نظام آمنے سامنے ہونے کی وجہ سے اور بھی سیاست نے اہمیت اختیار کر لی ہے خان کی بات سنئیں:

> پالیٹکشکش کی باتیں ختم کرو جہاں جاو شالی پالیٹکش دم کے پیچھے لگی ہے، اش شے تو نجات ملنا مشکل ہو گئی۔ برے آئے ہیں، بالشویک بننے والے ہندوستان کو بالشوزم سے کوئی تعلق نہیں۔[۲۱]

نشہ کی حالت میں بولے گئے الفاظ ہیں بھی سرمایادارانہ نظام کے خلاف۔ ہندوستان کا اس نظریہ سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ یہاں قابل عمل ہے؟ سجاد ظہیر ہندوستان میں بھی ایک انکلابی تبدیلی چاہتے ہیں جس کے لیے مجاہد عام مزدور طبقہ ہے انقلاب روس اس کے لیے بہترین مثال تھا۔

احسان اور خان کی باتوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اشتراکیت اور سرمایادارانہ نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی تناظر میں یہ دونوں کردار بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔، ایک طرف ایک نظام والے ملک ہیں دوسری طرف دوسرا نظام رکھنے والے کھڑے ہیں۔ دنیا کا منظر نامہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ دنیا بھر کے مزدور ایک ساتھ کھڑے ہیں کیوں کہ ان کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی اور ورکر ایک مضبوط طاقت بن چکے ہیں۔ اسی انتشار کی کفیت "لندن کی ایک رات" کے کرداروں میں بھی نظر آتی ہے۔

سجاد ظہیر نے اپنے عہد کے نوجوانوں اور طالب علموں کے ذہنی انتشار اور داخلی کرب واضطراب کے پردے میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، اور مذہبی و اخلاقی حالات وکفیات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔[۶۲]

نشہ میں بھی خان یہ بات نہیں بھولا کہ اشتراکیت ہماری دشمن ہے اور اس کے خلاف ہی بولتا ہے۔خان کو روس صرف خوب صورت عورتوں کے حوالے پسند ہے، کمیونزم کے حوالے سے وہ اس کو ناپسند کرتا ہے احسان ان سب لوگوں سے جان بوجھ کر ایسے سوال کرتا ہے جس سے وہ زچ ہوتے ہیں۔ناولٹ کے تمام کردار مالی لحاظ سے خوشحال ہیں اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔لندن میں خوش حال زندگی گزار ہے ہیں لیکن ان کا دل اپنے ہندوستان کے ساتھ دھڑکتا ہے۔اور یہ سارے اپنے نلک کے لیے پرشان ہیں۔یہ مختلف حوالوں سے اپنے وطن کی بھلائی چاہتے ہیں کہ ہارے وطن کو بھی آزاد ہونا چاہیے۔کسی کو ہم اپنے آقا کے طور پر قبول نہیں کریں گے۔یہ سارے طالب علم اپنے مستقبل کو اپنے وطن کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔

احسان اشتراکیت کے ذریعے سیاسی، سماجی انصاف اور معاشی مساوات لانے کا حامی ہے[۶۳]

ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کے تمام کردار ایک الجھاؤ سے دوچار ہیں۔کوئی واضح فیصلہ کرنے کے مقام پر نہیں ہیں کوئی بھی ابھی تک اپنی منزل کا تعین نہیں کر سکے۔احسان ان سب سے مختلف ہے اس کی سامنے ایک منزل ہے اگرچہ وہ جانتا ہے کہ یہ راستہ خاصا کٹھن ہے اور ہموما اس راستے والے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں کیوں کہ سرمایادار کی گرفت ابھی کافی مضبوط ہے، ایک طرف نو آبادکار ہے جو ملک کو کھوکھلا کر رہا ہے دوسری طرف اپنے مقامی لوگ ہیں جو ان کے لیے سہولت کار بنے ہوئے ہیں۔یہ دونوں ہاتھوں سے غریب عوام کا خون چوس رہے ہیں۔یہ راجے، مہاراجے، بڑے زمین دار، جاگیر دار، مہاجن اور دیگر جن کے نام احسان نے گنوائے ہیں یہ لوگ اس سرزمین کی جان اسانی سے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ان لوگوں کے دلوں میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں ہے ان سے سب کچھ چھین کے ہیں غریبوں میں بانٹا جائے۔یہ ساری باتیں ان غریب لوگوں کی سمجھ میں تو آجاتی ہیں یہ سرمایادار ان باتوں کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

اشتراکیت میں ان کا نقصان ہے اور عام لوگوں کے بھلے کی بات ہے۔احسان کیوں کہ پکا اشتراکی ہے۔وہ چاہتا ہے کہ معاشرہ میں تمام لوگوں کو برابر منافع میں حصہ دیا جائے اور ایک فلاحی معاشرہ قائم کیا

جائے دولت کا ارتکاز نہ ہو غیر منصفانہ معاشرہ خرابیوں کو جنم دیتا ہے۔اور بہت بڑے طبقہ میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔احسان کو ہر وقت اپنے ملک کی فکر لاحق رہتی ہے اور وہ جلد اس انقلاب کو دیکھنے کے منتظر ہیں۔وہ ہے مغرب میں مگر اس کا دل ہندوستان کے ساتھ ہے۔ایک طرف احسان بطور اشتراکی سپاہی کے مفرب میں تعلیم حصل کر رہا ہے دوسری طعف اسی نظام کے خلاف بھی ہے اور اسے بدلنے کا متمنی بھی۔بڑے لوگوں کے بارے میں احسان کی رائے سنیں۔

> یہ طبقہ ضرور ایسا ہے جس کے بارے میں یہ کیا جا سکتا ہے کہ بحثیت مجوعی اس میں بھلائی باقی نہیں رہی۔۔۔[۲۴]

احسان کے سامنے دو چیلنج ہیں ایک ملک کو نوآبادکار سے نجات دلانا ہے تو دوسری طرف ایک مکمل طرز حکومت کا بدلنا جس کا راستہ سرخ انقلاب سے ہو کر گزرتا ہے۔

ناول،ناولٹ کی کہانی کو اگے بڑھانے والے کردار ہوتے ہیں اور کردار ایک خاص خطہ یا علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں،بالفاظ دیگر وہاں کے نمائندہ ہوتے ہیں۔دنیا بھر کے حلات وواقعات نچلی سطح تک اثرانداز ہوتے ہیں۔"لندن کی ایک رات" کی تخلیق کا عہد دیکھیں،اس دور کی دنیا کے حالات وواقعات کو دیکھیں تو ایک بے یقینی کی صورت حال ہے۔اور یہ صورت حال ان کرداروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ناولٹ کے تمام کردار ذہنی لحاظ سے ایک کشمکش سے دوچار ہیں،ذہنی اعتبار سے ایک الجھاو کی کفیت ہے ایک طرف اپنا وطن ہے دوسری طرف اپنا مستقبل دونوں غیر یقینی ہیں۔کبھی وہ عشق کی طرف لوٹتے ہیں تو کبھی اپنے وطن کی صورت حال کی طرف۔کسی کردار کے سامنے کو واضح منزل نہیں۔"لندن کی ایک رات" کے کردار ایک کٹ پتلی کی صورت میں نظر آتے ہیں۔جن کو سجاد ظہیر قصہ کے تقاضوں سے نکال کر اپنے مقصد کی بات (اشتراکیت) کی طرف لے آتے ہیں۔گویا تمام کردار کسی نقطہ سے منسلک نہیں نظر آتے۔

حوالہ جات

۱۔ ساجدہ زیدی، لندن کی ایک رات، (مضمون) مشمولہ، سجاد ظہیر ادبی خدماتاور ترقی پسند تحریک، مرتبہ، گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۵۲

۲۔ ایضاً، ص ۵۳

۳۔ ایضاً، ص ۷۱

۴۔ محمد فیروز، ڈاکٹر، لندن کی ایک رات خصوصی مطالعہ مع حیات و خدمات، ساقی بک ڈپو، دہلی: ۲۰۰۶ء ص ۴۳

۵۔ ناصر عباس نیر، اردو ادب کی تشکیل جدید، اکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۱

۶۔ سجاد ظہیر، یادیں (رپوتاژ) مشمولہ، سجاد ظہیر شخصیت اور فکر، مرتبہ، سید جعفر احمد، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۰۹

۷۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۷۹

۸۔ ایضاً، ص ۷۱

۹۔ اے اے فاطمی، سجاد ظہیر ایک تاریخ ایک تحریک، جوش اینڈ فراق لٹریری سوسائٹی، الہ آباد، ۲۰۰۹ء ص ۶۲

۱۰۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۴

۱۱۔ اے اے فاطمی، سجاد ظہیر ایک تاریخ ایک تحریک، ص ۳۹

۱۲۔ آصف فرخی، لندن کی وہی ایک رات، (مضمون) مشمولہ، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، مرتبہ، گوپی چند نارنگ، ص ۶۷

۱۳۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور ۱۹۷۴ء، ص ۶

۱۴۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۶۵

۱۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور ، ۱۹۷۴ء، ص ۱۱

۱۶۔ محمد فیروز، لندن کی ایک رات، خصوصی مطالعہ مع حیات و خدمات، ص ۶۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۲

۱۸۔ ایضاً، ص۵۷

۱۹۔ ناصر عباس نیر، اردو ادب کی تشکیل جدید، اکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۶ء ص ۱۳۳

۲۰۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات،، نیا ادارہ، لاہور ، ۱۹۷۴ء, ص ۱۰

۲۱۔ ریاض احمد ہمدانی، ڈاکٹر، اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ، فکشن ہاؤس، لاہور: ۲۰۱۸، ص ۲۵۴

۲۲۔ ایضاً، ص۲۵۵

۲۳۔ ایضاً، ص۲۵۶

۲۴۔ ایضاً، ص۲۵۶

۲۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور ، ۱۹۷۴ء ص ۱۷

۲۶۔ ایضاً، ص۲۰

۲۷۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۲۷

۲۸۔ ناصر عباس نیر، اردو ادب کی تشکیل جدید، اکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۶ء ص ۲۷۱

۲۹۔ محمد حسن، سجاد ظہیر کی ادبی خدمات (مضمون) مشمولہ آج کل، ماہ نامہ، شمارہ ۵، جلد ۳۲، نئ دہلی: دسمبر ۱۹۷۳، ص ۳۶

۳۰۔ ایضاً، ص۳۶

۳۱۔ انیس رفیع، لندن کی ایک رات، جائزہ و تجزیہ (مضمون) مشمولہ روح ادب، سہ ماہی، شمارہ ۸۸، ۸۷، جلد ۲۴، مغربی بنگال اردو اکادمی: کلکتہ، مارچ ۲۰۰۸، ص ۹۰

۳۲۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ، ۱۹۷۴، ص ۶۸

۳۳۔ اے اے فاطمی، سجاد ایک تاریخ ایک تحریک، ص ۵۹

۳۴۔ انیس رفیع، لندن کی ایک رات، جائزہ، تجزیہ، مشمولہ، روح ادب، ص ۹۳

۳۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، امپیریل ازم کے بدلتے تناظرات، (مضمون) مشمولہ، تاریخ، سہ ماہی، شمارہ، ۳۰، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور: جولائی ۲۰۰۶ ص ۱۴۱

۳۶۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ ص ۲۰

۳۷۔ ایضا، ص ۲۰

۳۸۔ آصف فرخی، لندن کی وہی ایک رات، (مضمون) مشمولہ، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند

تحریک، ص ۷۰
۳۹۔ یاسر جواد، (مترجم) ثقافت اور سامراج، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: ۲۰۰۹، ص ۱۷۵
۴۰۔ اے اے فاطمی، سجاد ظہیر ایک تاریخ ایک تحریک، ص ۶۱
۴۱۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۲۷
۴۲۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۸۴
۴۳۔ ایضاً، ص ۶۹
۴۴۔ ایضاً، ص ۳۴
۴۵۔ آصف فرخی، لندن کی وہی ایک رات، (مضمون) مشمولہ، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، ص ۸ ۵
۴۶۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۴۱
۴۷۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۶۵، ۶۴
۴۸۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، ص ۶۷ ۴
۴۹۔ آصف فرخی، لندن کی وہی ایک رات، (مضمون) مشمولہ، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، ص ۷۰
۵۰۔ ایضاً، ص ۷۰
۵۱۔ سجاد ظہیر لندن کی ایک رات نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۱۱۷
۵۲۔ ایضاً، ص ۱۲۲
۵۳۔ ایضاً، ص ۱۳۰
۵۴۔ ایضاً، ص ۱۳۳
۵۵۔ ایضاً، ص ۱۳۵
۵۶۔ عتیق اللہ، لندن کی ایک رات ایک نو آبادیاتی مطالعہ، مشمولہ، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، ص ۷۸
۵۷۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور ۱۹۷۴ء ص ۶۸، ۶۷
۵۸۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۸۲

۵۹۔ سجاد ظہیر لندن کی ایک رات، نیا دارہ، لاہور، ۱۹۷۴ص ۶۸

۶۰۔ ایضاً، ص ۶۹

۶۱۔ ایضاً، ص ۶۹

۶۳۔ انور پاشا، ترقی پسند اردو ناول، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی: ۱۹۹۰، ص ۶۷

۶۴۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۹۹

باب چہارم:

”لندن کی ایک رات“ اسلوب اور تکنیک کا جائزہ:
(نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تناظر میں)

الف) نو آبادیاتی عہد اور اسلوب:

کوئی بھی لکھاری ایسی تخلیق نہیں لکھ سکتا جس کا تعلق اس کے اپنے معاشرہ سے نہ ہو۔ لکھاری ایک معاشرہ کا حصہ ہوتا ہے اور اس معاشرہ کے اچھے برے دونوں طرح کے اثرات قبول کرتا ہے۔ ایک ایسا فن پارہ جس کا اس معاشرہ، تہذیب و ثقافت سے تعلق نہیں ہوتا وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا اور جلد وہ منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔

تخلیق کار معاشرہ کے اور اپنے ارد گرد کے اثرات صرف قبول ہی نہیں کرتا بلکہ اس کا عکس اسی کی تخلیق میں جگہ پاتے ہیں۔ بہ عین ہی اسی طرح ادب میں بھی یہی انفرادیت سامنے آتی ہے۔ کسی بھی فن پارے کو فن کار سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ فن کار بھی معاشرہ کا ہی ایک فرد ہے اس کے تناظر میں اسے بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔

اسلوب خود شخص ہے یا خیال کا لباس ہے جو بھی اسلوب کی تعریف کریں وہ اس کے کسی ایک رخ کا ہی تعین کرتی ہے۔ جب ہمارے سامنے کوئی فن پارہ آتا ہے۔ اس میں جس حد تک اسلوب کا تعلق ہئیت سے ہے اس کے ہم پلہ تعلق مواد سے بھی ہے۔ انسان کے جذبات و احساسات، خیالات اور رویے آس پاس موجود صورت حال سے مل کر اس کے اسلوب میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور وہ اسلوب اپنے عہد کے تمام حالات و واقعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی تخلیق ہم پڑھتے ہیں تو اس عہد کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور ہم اس عہد کا جائزہ لے رہے ہوتے ہیں۔ دوسرا وہ تخلیق کار کی شخصیت کا بھی آئینہ بن جاتی ہے۔

اسلوب عموماً دو طرح کا ہوتا ہے جو ہر فن پارے میں جھلک رہا ہوتا ہے۔ ایک اس عہد کے مجموعی حالات و واقعات اور صوت حال سے چشم پوشی ناممکن ہوتی ہے۔ وہ ہر حال میں فن پارے میں جگہ پانے میں کامیاب ہوتے ہیں دوسری طرف مصنف کی شخصیت کو بھی بخوبی جان سکتے ہیں۔

ادبی اسلوب کا پہلا عنصر تو وہ خصوصیات میں جو اس عہد کی اپنی ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیات
زبان و بیان دونوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ اس کا تعلق زبان سے بڑا گہرا ہوتا ہے۔ اس
میں اس اس عہد کے مزاج، سماجی حالات اور قومی خصوصیات کو بڑا داخل ہوتا ہے۔[1]

ایک عہد کے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں ایک طرف تو اپنے عہد کی مجموعی صورت حال موجود ہوتی ہے تو دوسری طرف ان تخلیق کاروں میں ایک انفرادیت بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً تقسیم بر صغیر کے دور میں لکھنے والوں کے ہاں ہجرت، اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ بحثیت مجموعی موجود ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کا ایک شخصی زاویہ بھی موجود ہے جن میں ان کی اپنی شخصیت نظر آتی ہے۔ اور اسے ہم "شخصی اسلوب" کا نام دے کر الگ شناخت کرتے ہیں۔

کسی بھی عہد کی مخصوص سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال اسلوب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس عہد کی صورت حال سے صرف نظر ناممکن ہے۔ مصنف بحثیت انسان ایک سوسائٹی کا حصہ ہوتا ہے جو کسی نشیب و فراز سے گزر رہا ہوتا ہے۔ سوسائٹی کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات ذی شعور انسان پر پڑتے ہیں۔ مصنف کسی معاشرہ کا ایک احساس محسوس کرنے والا شخص ہوتا ہے۔ ایک طرف اسلوب مصنف کی زندگی کا عکس لیے ہوئے ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف وہ اپنے عہد کا ایک گواہ بھی ہوتا ہے۔ اور حالات و واقعات کا آئینہ دار۔

نو آبادیاتی عہد میں جس طرح مقامی آبادی دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے ایک گروہ فاتح (نو آباد کار) کا حامی بن جاتا ہے اور دوسرا آزادی کے راستے کا انتخاب کرتا ہے اسی طرح مصنف بھی نو آباد کار کا حامی یا مخالف ہوتا ہے اگر مصنف حمایت کرتا ہے اور نو آباد کار کے حق میں قلم اٹھاتا ہے تو وہ نو آبادی کے پہلے گروپ سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح اگر وہ قلم کو مذاہمت میں استعمال کرتا ہے تو وہ دوسرے مشکل راستہ کا راہی ہوتا ہے۔

اگر نو آبادیاتی عہد کے اجتماعی اسلوب کو دیکھا جائے تو پہلا گروہ سے تعلق رکھنے والا تخلیق کار انہی کی حمایت میں قلم اٹھائے گا اور مخالف تخلیق کار رد نو آباد کار کا پرچار کرتا نظر آئے گا۔

اسلوب جسمانی سطح اور ذہنی سطح سے دست و گریباں ہے۔ ذہنی سطح سے مراد ذہانت،
عقل و دانش، دماغ، قوت فکر اور دوسری طرف رد عمل جسمانی ہو سکتا ہے۔[2]

ذہنی اور جسمانی تعلق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اشتراکیت کا نقطہ نظر بھی واضح ہوتا ہے ذہنی لحاظ سے ایک مصنف ایک بات کو قبول کرتا ہے اور اس پر قلم اٹھاتا ہے۔ وہ میدان میں عملی طور پر بھی جدوجہد کرتا ہے اس کی مثال بہت بڑے ادب سجاد ظہیر ہیں۔ ایک طرف انہوں نے قلم سے اشتراکیت کی تبلیغ کی دوسری طرف برصغیر میں عملی کوششیں بھی کیں۔

اس عہد میں ایک آزاد ملک کا حصول انتہائی اہم تقاضا تھا۔ تخلیقی کاروں نے بحثیت مجموعی ان موضوعات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہر تخلیق کار اپنا ایک مخصوص تہذیبی و ثقافتی پس منظر رکھتا ہے۔ ایک معاشرہ کے فرد ہونے کے ناطے وہ ایسے الفاظ اور موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جو عام فہم ہوں۔ وہ ایسے مشکل پیچیدہ الفاظ یا موضوعات کا کیوں چناؤ کرے گا جن کا اس معاشرہ سے تعلق نہ ہو۔

اشتراکی نقطہ نظر کے تحت " ادب برائے زندگی" کا نعرہ سامنے آتا ہے کہ ادب کا تعلق ایک عام مزدور اور کسان کی زندگی سے ہونا چاہیے محض " ادب برائے ادب" کے تحت تخلیق کردہ ادب بے مقصد اور فضول ہے ادب میں ایسے موضوعات ہونے چاہیں جن کا تعلق اپنی سرزمین سے ہو نہ کہ محض چند سوخوشحال لوگوں سے۔ جب ادب کسی مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے تو اس میں ایک اجتماعیت پیدا ہو جاتی ہے اور تمام تخلیق کار جن کا اس عہد سے تعلق ہوتا ہے وہ ایک ہی رخ پر چل پڑتے ہیں اور " شخصی اسلوب" کا پہلو قدرے پیچھے رہ جاتا ہے۔ لیکن اسی تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو احساسات، خیالات (تصورات) اجتماعی ہو سکتے ہیں مگر اسلوب میں شخصی پہلو نمایاں ہی رہتا ہے۔

> ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۴ء تک کا ادبی ہندوستان ملی رجحانات کے لحاظ سے پیشرو دور کا ضمیمہ تھا کیوں کہ اس عہد میں اسلوب فکر میں کوئی ترقی یا تبدیلی نہیں ہوتی۔۔۔ ۱۹۱۴ سے ۱۹۲۳ تک ہندوستانی فرقہ ورانہ تنازعات کو پس پشت ڈال کر سامراج کے خلاف آوازیں سامنے آتی ہیں۔۔۔ جنگ عظیم اول نے پہلی بار ہندوستانی دماغ کو بین اقوامی طرز فکر دیا۔[۳]

بیسویں صدی انکشافات کی صدی ہے گویا اس صدی میں ایک ہوا کا ایسا جھونکا چلتا ہے، جو دنیا بھر میں پھیل جاتا ہے۔ مختلف تصورات، نظریات جو پہلے ترقی پذیر غلام ممالک سے دور تھے انہوں نے ان ملکوں کا رخ کر لیا ہے ایک دائرہ میں چلنے والے ذہنوں کو ایک وسیع کائنات مل گئی ہے۔ آزادی کے خواب کو تفسیر دینے کا وقت آ گیا۔ اگرچہ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں اتنی آزادی نہیں حاصل تھی کہ آپ جو مرضی لکھیں مگر بین الاقوامی حالات

میں ادبا کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اور نو آبادی کے لوگ پہلے تو ان بدلتے حالات کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور بعد میں ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہو تا چلا جاتا ہے۔ ناولٹ "لندن کی ایک رات" ۱۹۴۰ کی دہائی میں لکھا گیا ہے۔ ناقدین کے خیال میں یہ پردہ میں لپٹا ہوا خیال ہے یعنی ظاہری طور پر ایک طالب علموں کی پارٹی یا ان کی زندگی کا احاطہ ہے لیکن اس پردے کے اندر انقلاب اور تبدیلی کی تبلیغ موجود ہے۔ ترقی پسندوں نے ایک موضوع کو بار بار دہرایا ہے اور یہی اعتراض بھی ان کی تحریروں پر کیا جاتا ہے کہ اشتراکیت کے علاوہ دیگر موضوعات کو کم جگہ دی گئی ہے۔

> احسان (جو خود سجاد ظہیر کا نمائندہ کردار ہے) اپنے اشتراکی خیالات و نظریات کی ہر محفل میں تبلیغ کرتا نظر آتا ہے۔[۴]

مقصدیت کے تناظر میں اگر کسی تخلیق کا جائزہ لیں تو مشکل اور بناوٹی الفاظ یا دوسرے الفاظ میں بناؤ سنگھار سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ اصل اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ آپ اپنا نظریہ سوچ دوسروں تک منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں قارئین کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ ان کا خواندگی کی سطح کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت پسندوں کے ہاں لفظی ہیر پھیر کے مقابلے میں اصل مقصد کی بات کہی گئی ہے۔ سجاد ظہیر کے سامنے ایک منزل تھی اور اس منزل کی طرف سفر شروع کرنے والا وہ خود اکیلا تھا۔ قافلہ اور کاروان تو بعد میں بنتا ہے۔ اس لیے وہ بات کو اس انداز میں عوام کے سامنے رکھتا ہے کہ انہیں سمجھ آئے ایک آزاد اور منصفانہ معاشرہ یعنی ایک طرف آزادی کا حصول منزل ہے۔ تو دوسری طرف ایک نظام حکومت۔ سجاد ظہیر ابتداء سے ہی اشتراکیت کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے اور ایک ارتقاء کے بعد وہ عملی طور پر میدان میں اترے اور جب انہوں نے عملی جدوجہد کا آغاز کیا تو پھر قلمی کوشش دوسرے درجے پر چلی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ناولٹ "لندن کی ایک رات" کے بعد نظمیں لکھیں مگر بہت زیادہ تخلیقی کام نہیں کیا۔ تبلیغ کے لیے انسان کو تمام الفاظ بلکہ جن کو تبلیغ کرنی ہو انہی کے الفاظ و انداز اپنانے پڑتے ہیں۔ مصنف کی شخصیت اپنی جگہ مگر قارئین کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ وہ کیا اور کس طرح لکھا ہوا بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔

> چند مخصوص جذباتی کشمکش سے متاثر ہو کر سو دو بڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھاتی مال غیروں۔ کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر وڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لیتا ہے اور ان کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔[۵]

جذباتی یا مقصدی تحریر میں اسلوب کی طرف وہ توجہ یا خیال نہیں دیا جاتا ہے جو ایک عام تخلیق کار ایک عام حالات میں دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سجاد ظہیر جب عملی جدوجہد میں شامل ہوتے ہیں تو تخلیقی طور پر جدوجہد انہیں کم زور اور کم موثر لگنے لگتی ہے۔ جذبات میں مقصدیت سامنے ہوتی ہے الفاظ کا چناؤ نہیں اصل منزل نظام کی تبدیلی ہے اور دوسرے نظام کا لاگو کرنا ہے اور اس کے لیے کمرہ کرسی اور لکھنے کا سامان نہیں بلکہ ایک انقلاب کے ذریعے تبدیلی کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔

''لندن کی ایک رات'' میں سجاد ظہیر نے براہ راست ''بیانیہ اسلوب'' اپنایا ہے اور کم سے کم الفاظ میں'' شعور کی رو'' کے ذریعے جلد اپنے اصل نظریہ کی طرف بات کا رخ موڑ لیتے ہیں۔ اور بات وہیں اشتراکیت یعنی مقصدیت پر آکر رکتی ہے۔ سجاد ظہیر ایک طرف برطانیہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف ان کا دل و دماغ کبھی برصغیر کی صورت حال سے غافل نہیں ہوا بنیادی طور پر وہ دو اسالیب (مغربی، مشرقی) کے درمیان کھڑے نظر آتے ہیں۔ شعور کی رو کے استعمال کے باوجود وہ خیال اور جملے کو بکھرنے نہیں دیتے۔ اور جس طرح وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ میں نے یہ ناولٹ جہاز کے سفر کے دوران اور پیرس میں مکمل کیا تو اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی کتنی توجہ تھی۔

اصناف ادب میں ناولٹ دیگر اصناف کے مقابلے میں ایسی صنف ہے کہ اس میں بے شک دنیا جہاں کی باتیں ہوں اور پر داداری میں باتیں کی جائیں مگر مصنف کی شخصیت (نظریہ) سامنے آہی جاتا ہے 'لندن کی ایک رات'' کی بہترین شامل ہمارے سامنے ہے۔

> سجاد ظہیر ایک بنیادی طور پر ادبی مزاج رکھتے تھے۔ لندن میں اور دنیا بھر کے اہم ادبا سے تعلق تھا۔۔۔ اور ان کا اثر بھی قبول کیا۔[۸]

''یادیں'' اور نظمیں پڑھنے پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ''لندن کی ایک رات'' کا اسلوب ان سے ذرا ہٹ کر سجاد ظہیر نے خواہ جتنی زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا تھا اور وہ ادبی مزاج ہونے کی وجہ سے ہر طرح کے اسلوب پر مہارت رکھتے تھے۔ مگر ان کے سامنے پڑھنے والا قاری کون ہے۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ ایک عام طبقہ جن کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ اس کی تعلیم اور ذہنی سطح کیا ہے اس لیے انہوں نے محض بیانیہ اسلوب اپنا اور سادہ الفاظ میں بات قارئین تک پہنچائی۔

ب) لندن کی ایک رات میں ''شعور کی رو اور سر رئیلزم'':

سجاد ظہیر نے جب ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' لکھا اس وقت ناول بر صغیر میں اپنا سفر شروع کر رہا تھا اور صنف کا واضح تعین ہی ہوا تھا۔ شعور کی رو یا آزاد تلازمہ خیال'' جیسی تکنیک کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر جیسا کہ اس سے پہلے اس بات کا ذکر ہوا ہے کہ انہوں نے لندن سے تعلیم حاصل کی اور وہاں بہت سے ادبا کو پڑھا تو انہوں نے اس تکنیک کا جائزہ لیا ہو گا۔ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ جس ناول سے اور کس مصنف سے سجاد ظہیر نے ''شعور کی رو'' کا استعمال ہونے لگا، یا یہ خیال کہاں سے لیا؟

لندن میں رہتے ہوئے سجاد ظہیر کے سامنے اپنے وطن کی غلامی کا منظر تھا اس کے لیے انہوں نے لندن کی ایک رات لکھا اور اپنے خیالات قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی اور اگر وہ شعور کی رو استعمال نہ کرتے تو ناولٹ کی ضخامت بڑھ جاتی اور انہیں اپنے خیالات اپنی غلام قوم تک پہنچانے کی جلدی تھی۔ ''شعور کی رو'' کا استعمال ناول میں مغرب سے آیا ہے جیسا کہ خود ناول اور ناولٹ سمیت مختلف اصناف بھی مغرب سے درآمد کردہ ہیں اسی طرح یہ تکنیک بھی مغرب سے آئی اور ادب میں شامل ہوتی ہیں اور ان کے استعمال میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو تا گیا۔ مگر سجاد ظہیر نے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں بہترین انداز میں برتا ہے جب کہ دوسری طرف وہ تکنیک استعمال کرنے والوں میں سے ابتدائی شخص ہیں۔

> شعور کی رو سے ملتی جلتی دو تکنیک اور بھی ہیں ایک تلازم خیال اور دوسری سر رئیلزم،
> تلازمہ خیال میں بات سے بات نکلنے والی صورت حال در پیش ہوتی ہے۔۔۔ جب کہ
> سر رئیلزم میں کردار کا ذہن کسی سامنے کی چیز کو دیکھ کر اس کے مماثل کسی دوسری چیز
> تک پہنچ جاتا ہے[۹]

سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' میں درج بالا تینوں تکنیک کو بہ حسن خوبی استعمال کیا ہے اور ان کا استعمال کمال مہارت کا تقاضا کرتا ہے اور وہ ان کے تقاضے بخوبی پورے کرتے ہیں او کوئی کمی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں نظر آتا۔

''لندن کی ایک رات'' میں شعور کی رو سے طوالت کو بخوبی قابو میں رکھا گیا ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ نصیحت کم الفاظ پر مشتمل ہونی چاہیے اسی طرح تبلیغ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اگر یہی ناولٹ ایک ہزار صفحہ پر پھیلا ہوا ہوتا تو قارئین ہاتھ لگانے سے بھی ڈرتے۔ یہاں سجاد ظہیر کو دو محاذوں کا سامنا تھا۔ کرداروں کو ان کے اصل حال و احوال میں رکھنا اور انہیں لے کر چلتا تو دوسری طرف سے ان سے اپنے مقصد کی بات بھی

کہلوانا تھی۔ یہاں شعور کی رو کی مدد سے کام آسان ہو تا گیا ہے۔ جہاں تک انفرادیت کی بات ہے ''لندن کی ایک رات'' کسی پکی ٹھکی تکنیک اور اصولوں پر نہیں لکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ خود سجاد ظہیر اس کو بطور صنف کوئی واضح نام نہیں دیتے۔ یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

سجاد ظہیر اپنی کتاب (لندن کی ایک رات) کو ناول یا افسانہ کہتے ہوئے جھجھکتے ہیں کیوں کہ اس میں روایتی یا بندھی ٹکی تکنیک کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔''[1]

سجاد ظہیر برصغیر کی عوام کے سامنے چند حقائق رکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے ''لندن کی ایک رات'' لکھا اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ادبی آدمی تھے ادب ان کے مزاج میں رچا بسا ہوا تھا۔ اپنے عہد کے نہ صرف یورپی، روسی اور اشیاکے ادبا سے تعلقات تھے بلکہ وہ اعلیٰ کانفرسوں میں بھی شریک ہو چکے تھے مگر یہ ناولٹ لکھتے ہوئے قطعاً ان کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ اہل ادب میں ان کی قدو منزلت بنے گی وہ بڑے ادبا میں شامل ہو جائیں گے ان کے سامنے تو ان کی اپنی نو آبادی تھی، عام غریب کسان تو لگان میں پھنسے ہیں اور عام مزدور کو ایک وقت کا کھانا بھی بہ مشکل میسر ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ یورپ سے واپس آتے ہیں تو وہ عملی کام شروع کرتے ہیں اور لکھنے کا کام جو بعد میں سامنے آتا ہے وہ قید کے دور میں کیا۔ کیوں کہ اس وقت وہ عملی جدوجہد میں شامل ہونے سے قاصر تھے۔

''شعور کی رو'' بنیادی طور پر نفسیات کی ایک اصطلاح ہے جس میں خیالات کا ایک تسلسل کارفرما ہوتا ہے۔ انسانی دماغ کسی ایک موضوع پر زیادہ وقت مرکوز نہیں رہ سکتا اور لمحہ بہ لمحہ ذہن ایک بات سے دوسرے بات تک مشکل ہو تا رہتا ہے۔ اعظم، جین کا انتظار کر رہا ہے اور جب وہ اسٹیشن پر نہیں آتی کہتا ہے۔

کم بخت آج پھر وعدہ کر کے معلوم ہوتا ہے نہیں آتے گی۔ یہ پہلی با نہیں ہے۔۔۔ کتنی دفعہ ارادہ کر چکا ہوں کہ اس سے ملنا چھوڑ دوں۔۔۔''[2]

اعظم کھڑا تو ریلوے اسٹیشن پر ہے مگر اس کا ذہن ماضی اور ماضی سے حال اور مستقبل تک سوچ رہا ہے گویا شعور کی رو سے وہ وقت کی گرفت سے مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وہ سوچ رہا ہے کہ لندن میں اور لڑکیاں بھی ہیں مجھے ان کی طرف جانا چاہیے دوسری طرف گزرے ہوئے دن۔ جین کے وہ عہد جو وفا نہیں ہو سکے ان کو یاد کر رہا ہے۔

اعظم کا جین کا انتظار کرنا اور اس کا نہ آنا اور اعظم کا دماغ اس واقعہ کے بعد سو طرح کی باتیں سوچتا ہے۔ یہاں تک کہ اور شاعری کی اہمیت و ضرورت بھی اس کے دماغ کی گرفت میں آجاتی ہے گویا ایک طرف

اعظم خود کو تسلی دے رہا ہے کہ شاعروں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا آیا ہے اور یہاں ذلیل وخوار ہونے والا اکیلا نہیں ہوں۔ یہاں شعور کی رو کی بدولت سجاد ظہیر کو یہ مواقع مل جاتا ہے کہ وہ مزدوروں کی حالت زاد کا نقشہ کھینچ سکے، اگر یہ تکنیک استعمال نہ ہوتی تو اعظم کے دماغ کو، ان حالات وواقعات تک ارتقامیں کئی صفحات لکھنا پڑتے۔ مگر سجاد ظہیر نے بخوبی کم سطروں میں غریبوں اور اپنے حقوق مانگنے والوں کے ساتھ روا رکھا جانے والے ظلم کو بخوبی قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

راؤ اور اعظم جسمانی لحاظ سے لندن میں موجود میں اور پب میں بیٹھے وسکی پی رہے ہیں مگر شعوری سطح پر وہ ہندوستان میں موجود ہیں اور یہاں کے مناظر ان کی نظروں کے سامنے چل رہے ہیں اور ان کے ذہن پر ہندوستانی مظلوم لوگوں کی تصویریں ابھر ڈوب رہی ہیں۔

> کسی واقع کی وجہ سے ماضی کی یادوں کو حال میں پیش کیا جاتا ہے جس میں بہت سے گزرے ہوئے واقعات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔[۱۲]

یہی صورت حال اعظم اور راؤ کے ساتھ در پیش ہے اخبار کی ایک خبر سے ان کے ذہن میں پچھلے ایک طویل عرصہ کی کہانی (برصغیر کے حالات) کے مناظر ابھرنے لگتے ہیں۔ اعظم کے ہاں ناولٹ کی ابتداء میں ہی ایک طویل داخلی خود کلامی ملتی ہے جس میں اعظم اور جین کی دوستی کے گذشتہ اوراق دیکھے جاسکتے ہیں۔ جو اس کے ذہن کے پردے پر نمایاں ہو رہے ہیں۔

یہاں پر ایک اور تکنیک Flash Back کی استعمال ہوئی ہے کہ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ یاد آتا رہتا ہے اور واقعات ایک تسلسل میں چل نکلتے ہیں۔ جس طرح اگر ایک بات ذہن میں موجود ہو اور وہ اسے تکلیف دے رہی ہو تو خیال اسی طرف بار بار جاتا ہے اور کثر اوقات وہ بات منہ سے بھی بے اختیار نکل جاتی ہے۔ یہی معاملہ راؤ اور اعظم کا ہے۔ ان کو برصغیر کی غلامی بہت تکلیف دے رہی ہے اور ان کا ذہن ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہے۔

اسی طرح راؤ اور اعظم کو دیکھ کر ٹام کا ذہن ہندوستان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور بحیثیت فوجی جو وقت اس نے یہاں (برصغیر) میں گزرا ہوتا ہے اسے وہ یاد کرتا ہے اور راؤ اور اعظم کو بھی صورت حال سناتا ہے کہ اس وقت وہ کیا سوچتا تھا۔

> میں لڑائی سے پہلے ہندوستان میں تھا اور میں نے وہاں کی حالت دیکھی ہے۔ اس وقت میں جو اں تھا میں احمق تھا سنتے ہو مجھے، میں احمق تھا۔[۱۳]

داخلی خود کلامی کے تناظر میں نعیم الدین کا کردار کا کردار خاصی اہمیت کا حامل ہے اور بار بار وہ مختلف باتیں سوچتا ہے مثلاً کہ وہ ہندوستان میں ایک لائق فائق طالب علم تھا وغیرہ وغیرہ اور اس کا اصل مسئلہ احساس کمتری ہے۔وہ خود کو شیلا سے کم تر سمجھتا ہے اور اپنے مٹاپے کے بارے میں بار بار سوچتا ہے۔بنیادی طور پر ناولٹ لندن کی ایک رات پر نعیم الدین کے کردار کا غلبہ ہے مگر چند ایک کردار مختصر ہونے کے باوجود زیادہ موثر ہیں۔

نعیم الدین، گرین کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھتا ہے تو مشکل سے اپنے خیالات پر قابو پاتا ہے اور یہاں اس کا ذہن وقت کے پنجوں سے نکل کر ماضی ،حال اور مستقبل کی طرف محو پرواز ہوتا ہے اور طرح طرح کے منصوبے اپنے ذہن میں تیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔

بیچاری نیک معلوم ہوتی ہے۔اس نے (نعیم الدین) اپنے دل میں خیال کیا۔۔۔[۱۴]

اس کے بعد نعیم الدین کا ذہن راؤ کی طرف چلا جاتا ہے کہ اس لڑکی کا ذکر اس سے راؤ('مسٹر براڈ' یہ نام اس نے جین کو بتا رکھا ہے۔ناولٹ میں اور کوئی اسے اس نام سے مخاطب نہیں کرتا) نے پہلے کیوں نہیں کیا۔شائد عشق بازی کی داستانیں راؤ پہلے اسے سناتا تھا مگر یہ کیوں نہیں سنائی۔ہر بندہ اپنے ملاقاتی سے ملنے سے پہلے اس کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے مگر یہ رائے کوئی حتمی نہیں ہوتی لیکن نعیم الدین نے دیکھتے ہی اس لڑکی کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کر دیا کیا یہ خوب صورت اور اچھی ہے دوسری طرف اس کا ذہن اپنی طرف بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ میں کیا ہوں۔

آخر یہ کون ہے ؟ کیا کرتی ہے ؟ راؤ اسے کہاں ملا ہو گا خوب صورت لڑکی ہے۔خوب صورت لیکن میں ؟ مجھے کوئی خوب صورت کہہ سکتا ہے ؟ مجھ پر کوئی لڑکی عاشق نہیں ہوتی۔۔۔[۱۵]

نعیم الدین کی شخصیت عجیب تضاد کا شکار ہے ایک طرف وہ مسلسل اپنے بارے میں فکر مند ہے اور ہر بات کرنے سے پہلے دس، بار خود سے وہی بات دہراتا ہے دوسری طرف اس کا دوستوں کے ساتھ رویہ ہے جو کہ بہت اچھا اور مدد کرنے والا ہے مگر پڑھائی میں بہت سست ہے۔

نعیم الدین کا مکان ایک پلیٹ فارم ہے۔تمام دوست احباب وہاں جمع ہوتے ہیں اور حالات حاضرہ سمیت تمام امور اور خاص طور پر ہندوستان کی صورت حال زیر بحث رہتی ہے اور احسان جو کہ خود سجاد ظہیر کا ترجمان ہے اسے بھی ایک خاص مواقع مل جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو ہم خیال بنائے اور لوگوں تک اپنے نظریات

پہنچا سکے۔ یہ کمرہ ایک محدود پلیٹ فارم ہے اور موضوعات کی تو داد بہت زیادہ ہے۔ چند لمحات میں شعور کی رو سے مدد سے تمام کرداروں کے سامنے دنیا بھر کے موضوعات آجاتے ہیں اور وہ جسے چاہیں زیر بحث لائیں اور ان پر رائے زنی کریں اس پر کوئی پابندی نہیں۔

دیکھا نا، آخر میری خاموشی سے تنگ آکر تو اسی کو جولنا پڑا۔ نعیم نے اپنے دل میں کہا۔۔۔[۱۶]

شعور کی رو کی مدد سے سجاد ظہیر نے یہاں ایک خاص موضوع ادب، آرٹ اور شاعری کی افادیت و اہمیت کے لیے راہ ہموار کی ہے اور اس تکنیک سے اب یہ کردار دنیا جہاں کی شاعری، آرٹ، فلسفہ کو زیر بحث لاسکتے ہیں سجاد ظہیر یہاں اردو شاعری جو کہ ان کے خیال میں بحثیت مجموعی اور اشتراکیت نقطہ نظر سے محض محبوب کے لب دار خسار کے قصے ہیں، اس کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ وقت سے پہلے شیلا گرین کا آنا اور نعیم الدین کا پریشان ہونا یہ تو خاص موضوع کی طرف بات موڑنے اور خود مصنف کا اپنا نقطہ نظر دینے کے مترادف ہے۔

''شعور کی رو'' تکنیک کے استعمال سے کردار قصہ کے پابند نہیں رہے۔ کیوں کہ کردار دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے ایک طرف تخلیق کار کے نظریات، سوچ کے تقاضے دوسری طرف قصہ کے اپنے تقاضے جن کو نبھانا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس تکنیک سے کردار تخلیق کار کے ہاتھ میں آگئے ہیں اب وہ اس کی مرضی سے موڑے جاسکتے ہیں اور اس کی مثال لندن کی ایک رات ہے یہاں کردار مصنف کے نظریات کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

''لندن کی ایک رات'' میں ''شعور کی رو'' دو سطح پر برتی گئی ہے ایک طرف تو کسی سامنے والی چیز کو دیکھ کر کردار کا ذہن دوسری طرف منتقل ہوجاتا ہے یہ عمل ایک طرف کردار کے تانے بانے مغرب سے ملاتا ہے تو دوسری طرف اپنے وطن ہندوستان سے پورے ناولٹ میں شعور کی رو کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف رہتا ہے کیوں کہ ایک طرف فاتح ہے دوسری طرف مفتوح جو غلامی میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں جن سے نکلنا مشکل لگتا ہے۔

کریمہ بیگم اپنی روایتی مشرقی ذہنیت رکھتی ہیں اور اسی کے تناظر میں ان کی ایک طویل داخلی خود کلامی ہے اور خاص کر بحیثیت مجموعی ہندوستانیوں کے تناظر میں وہ عارف کا ذکر کرتی ہے۔

گورا چمڑا دیکھ کر انہیں (بھی ہندوستانیوں کو) اپنے اوپر بالکل قابو نہیں رہتا۔ سوا سفید چمڑے کے اور اس فریگین (شیلا گرین) میں کیا رکھا ہے۔۔[۱۷]

کوئی بھی تکنیک یا سادہ ترین طریقہ بھی ایک طویل ارتقاء کے بعد ایک کسی حد تک مکمل روپ اور شکل میں سامنے آتا ہے اور ناول نگاری کے ابتدائی دور میں سجاد ظہیر نے اپنے افسانوں اور ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں بہت بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک طرف تو سامراج کی ذہنیت اور طریقہ کار کو بیان کرنا دوسری طرف اپنی نو آبادی جو کہ شاعری کے اثر میں غنودگی کے عالم میں سو رہی ہے اس کا بیان خاصہ مشکل ہو جاتا مگر اہم کام اشتراکی نقطہ نظر کا اپنے کسانوں، مزدوروں اور دیگر لوگوں تک پہنچانا بھی خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اس ایک تکنیک سے سجاد ظہیر نے کمال مہارت سے سب کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

آزاد تلازمہ خیال کے تناظر میں کریمہ بیگم کا کردار اور گفتگو بار بار Falish Back کی وجہ سے عجیب کشمکش کا شکار ہے۔ جب احسان اس سے ناچنے کی فرمائش کرتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے اور وہ جواب ایک خاص تناظر (مشرقی دہنیت) میں اہمیت کا حامل ہے۔

۔۔۔ پھر یکا یک انہیں خیال آیا کہ جفاکشی بری اور ذلیل چیز ہے۔ انہوں نے طنزیہ لہجہ میں جواب دیا معلوم ہوتا ہے آپ بھول گئے کہ ہمارے ہاں (ہندوستان) ناچنا محبوب سمجھا جاتا ہے۔[۱۸]

گھر والوں سے بغاوت کر کے اور اپنی روایت کو توڑ کر لندن میں موجود کریمہ بیگم کی ذہنیت وہی مشرقی ہے۔ ایک طرف انہیں اسے شکایت ہے کہ ہندوستانی گوری چمڑی پر فدا ہیں دوسری طرف یہ ناچ دیکھ کر اسے اپنی چھوڑی ہوتی روایات یاد کرتی ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' میں کرداروں کا ذہنی تخیل اور سوچ کا محور ہندوستان ہے اور ان کی سوچ کا رخ مستقبل کی طرف ہے۔

کریہ بیگم کا احسان کو اپنے کلچر کے تناظر میں جواب دینا خارجی خود کلامی کے تناظر میں آتا ہے ایک بات اس نے سوچی اور پھر اس کو احسان کے کانوں تک پہنچا دیا۔ اس ایک بات سے احسان کا ذہن اپنی پرانی فر سودہ ہندوستانی رسومات کی طرف منتقل ہو گیا۔

ہندوستان میں سینکڑوں برس تک زندہ عورتیں مردوں پرستی ہو جاتی تھیں۔۔۔ ساری دنیا میں سینکڑوں برس تک اپنے سے کمزور انسانوں کو غلام بنانا اور بردہ فروشی قریب قریب ہر ملک میں رائج تھی۔۔۔[۱۹]

ایک رات کا ایک پہر گزرا ہے اور ایک پہر باقی ہے اور سجاد ظہیر، احسان کو موقع دیتے ہیں۔ جس کا دماغ بر صغیر سے ہوتا ہوا دنیا جہاں کے اہم موضوعات اور ایک بہت اہمیت کے حامل موضوع جو انسانوں کو غلام بنانے تک ہے۔ اسے زیر بحث لا رہا ہے یعنی شعور کی رو یا آزاد تلازمہ خیال سے کردار وقت یا کہانی کا پابند نہیں رہا اب وہ آزادی سے ذہن میں آنے والے سوالات اٹھا رہا ہے اور ان سوالات کو اپنے وطن کے تناظر میں پرکھ رہا ہے کہ مغرب میں یہ نظام کوئی ایک دن یا ہفتہ میں نہیں آیا اس کے پس منظر میں ایک طویل سفر ہے اور وہ سفر نشیب و فراز سے بھرا ہوا ہے یہ مخدب قوم پہلے کن مراحل سے گزری ہے اس میں انسان کو انسان تک نہیں سمجھا جاتا تھا۔

شعور کی رو سے کردار ارتقاء کے مراحل سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں اور ہر واقعہ ایک تسلسل میں پچھلے واقعہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے مگر زیر بحث تکنیک سے ارتقاء کی زنجیر ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اور اگر لندن کی ایک رات کی وسعت یا دوسرے الفاظ میں کنیوس کو دیکھیں تو وہ بہت مختصر ہے اتنے کم وقت میں یہ عمل بہت مشکل تھا مگر شعور کی رو سے جہاں ایک طرف انتشار کی کیفیت ہوتی ہے وہیں انتظامی طور پر یہ باہم واقعات کا تسلسل میں شامل ہو جاتے ہے اگر احسان کا ذہن لندن سے ہندوستان کی طرف منتقل ہوا ہے تو یہ بے رابطی بھی ایک تسلسل میں ہے کیوں کہ اب لندن (نو آباد کار) اور بر صغیر ایک تناظر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ شیلا گیرین کا دماغ بھی بار بار سوئٹزر لینڈ میں ہونے والے واقعہ (عشق) کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ نعیم الدین کے اسرار پر شیلا گرین نے پوری گزشتہ کہانی سنانی شروع کرتی ہے۔

> تم (نعیم الدین) اسے نہیں جانتے ہوگے۔ میں کئی برس ہوئے اس سے سوئٹزر لینڈ میں ملی تھی۔۔۔[۲۰]

ہیرن پال ایک مکمل کردار ہے جو کہ سجاد ظہیر کے تصورات کے عین مطابق ہے یہ کردار عملی طور پر ناولٹ میں موجود نہیں مگر پھر بھی شامل ہے یہ شیلا گرین کا آزاد تلازمہ خیال کی تخلیق ہے۔ یہ اشتراکیت پسند ایک مجاہد ہے جو زندگی کی پروا کیے بغیر جدوجہد میں حصہ لے رہا ہے اس کے لیے نہ پیار اہم ہے اور نہ زندگی ''شعور کی رو'' سے ہیرن پال ''لندن کی ایک رات'' میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔ شیلا گرین اور ہیرن پال کی عشق کی داستان مکمل شعور کی رو کی بنیاد پر ناولٹ میں جگہ پاتی ہے اور ہیرن پال ایک انقلابی سوچ کا حامل جوان اپنی زندگی واقف کر دیتا ہے کیوں اشتراکیت ایک خونی انقلاب سے گزر کہ عملی شکل میں سامنے آتا ہے اس کی بہترین مثال روسی انقلاب ۱۹۱۷ء ہے۔ سجاد ظہیر سمیت تمام اشتراکی نظریہ کے پیروکار ایسی ہی ایک

تبدیلی چاہیے تھے کہ جس میں بقول احسان بے کار لوگوں کو کھیتوں کی کھاد بنا دیا جائے اور صرف معاشرہ اور ملک کے لیے کار آمد لوگوں کو زندہ رکھا جائے کیوں کہ یہ لقّگ معاشرہ کا ناسور ہیں۔

عارف تمام کرداروں سے مختلف کردار ہے پوری طرح نو آباد کار کا پیروکار اور فرماں بردار طالب علم ہے۔ جب اس کے ساتھ چلتی لڑکی بوڑھے شیروں پر طنز کرتی ہے تو وہ جواب دیتا ہے یعنی خود کلامی کے انداز میں عجب کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے اور سوچتا ہے۔

جہاں جاؤ یہی تذکرہ رہتا ہے اس کا دوست کوئی کمیونسٹ ہو گا۔ ہر جگہ یہ لوگ (کمیونسٹ) گڑبڑ اور فساد پیدا کرتے ہیں ایک وہ احسان صاحب ہیں۔۔۔[۲۱]

عارف کے خیالات سرریئلزم (surrealism) کے حوالے سے عمدہ مثال ہیں کہیں بھی کوئی بات ہوتی ہے یا کوئی واقعہ تو عارف کا ذہن بے اختیار کمیونسٹوں کی طرف چلا جاتا ہے عارف چوں کہ اتحادی گروپ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے احسان اور دیگر لوگ اسے برے لگتے ہیں۔ یہ ایسا دور ہے کہ جہاں جاؤ یہ نظریہ غالب نظر آتا ہے۔ اور انقلاب روس کے بعد تو واضع نظر آرہا ہے کہ یہ سوچ (کمیونسٹ) اپنی جگہ بنا چکی ہے اور اب لاگو ہونے والی صورت باقی ہے جب یہ نظام سرمایاداری کی جگہ لے گا۔

شعور کی رو تکنیک کے متعلق کہی گئی تمام باتیں مکمل طور پر اور بھرپورا طریقے سے ’لندن کی ایک رات‘ میں نہیں ملتیں لیکن جس طرح اس تکنیک میں یہ تمام باتیں پیش ہوتی ہیں اور اس کا اندازہ کس قدر ناول سے ہوتا ہے۔[۲۲]

ہر انسان کا ایک نقطہ نظر ہوتا ہے اور وہ باہر دینا بھر میں واقع ہونے والے واقعات کو اپنے مخصوص پیرائے میں دیکھتا ہے اور ان پر اپنے مخصوص خیالات نظریات کے تناظر میں سوچتا ہے۔ یہی حال ”لندن کی ایک رات“ کے کرداروں کا ہے احسان ہر بات رسوم ورواج، اچھائی برائی کے بارے میں اپنے خاص کمیونسٹ نقطہ نظر سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔

آزاد تلازمہ خیال یا سرریئلزم کے تحت ذہن کی سکرین کے پردے پر بدلنے والے مناظر کہاں سے آتے ہیں اور ان کا پس منظر اور پیش منظر کیا ہوتا ہے؟ ایک شخص کے ذہن میں مختلف خیالات کا ذخیرہ پہلے سے موجود ہوتا ہے کچھ ظاہری ذخیرہ الفاظ یا خیالات تو شعور میں ہوتے ہیں اور بہت کچھ ہمارے لاشعور میں بھی شامل ہوتا ہے جو آزاد تلازمہ خیال کے تناظر میں جب ذہن میں پہلے سے موجود ان سے متعلق چیزوں کی

طرف ذہن سفر کرتا ہے اور وہ عکس تازہ ہو کر دوبارہ ابھر آتے ہیں۔پہلے سے ذخیرہ میں موجود خیالات اور سوچ کا ابھر کر نئے روپ میں سامنے آنے کی مثال عارف اور نعیم کی ہے۔

عارف کے ذہن میں اشتراکیت سے نفرت پہلے سے موجود ہے اور جب کبھی کوئی سیاست کی بات کرتا ہے تو وہ اسے کمیونسٹوں اور اس تحریک سے وابستہ لوگوں سے جوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح نعیم الدین کے ذہن میں ایک خیال پہلے سے موجود ہے کہ اس کی توند نکلی ہوتی ہے اور وہ شکل صورت وصورت کا اچھا نہیں وغیرہ وغیرہ۔

> لندن کی ایک رات میں نعیم کے خیال کی وہ رو ہے جو اپنی پارٹی میں آنے والے مہمانوں میں شیلا گرین کو دوسرے مہمانوں سے پہلے آتے دیکھ کر بہہ نکلتی ہے۔ اس بہاؤ کا محرک شیلا گرین کی خوب صورتی یا پر کشش شخصیت سے کہیں زیادہ نعیم کا اپنا احساس کمتری ہے۔۔۔[23]

نعیم الدین کے خیال میں بہت کچھ پہلے سے موجود تھا مثلاً درج بالا چیزیں اور یہ کہ وہ راؤ کے مقابلے میں کم کشش رکھتا ہے توند رکاوٹ ہے وغیرہ وغیرہ اور جب اس کی نظر شیلا گرین پر پڑتی ہے تو وہ دبے ہوئے خیالات منظر عام پر آتے ہیں۔ کم دافعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی سامنے کی چیز کو دیکھ کر کوئی نئی بات ذہن میں آئے۔ نعیم الدین کے ذہن میں پہلے سے موجود خیالات ایک ایک کرکے اس کے ذہن کے پر ابھرتے میں اور ان خیالات کو منظر دلانے میں محرک کا کردار شیلا گرین کا ہے جن کو وہ پہلی دافعہ دیکھ رہے ہیں۔ یہی حال شیلا گرین کا ہے وہ نعیم الدین کو اپنے گزرے ہوئے واقعات میں ایک واقعہ سناتی ہے ایک طرف اس واقعہ کی کڑی سوئٹزرلینڈ سے جڑی ہے جو کہ معلوم ہے،جب کہ دوسری طرف کی کڑی نا معلوم ہے اور اس واقعہ کا ایک کردار لندن میں موجود ہے اور دوسرا بنگال میں۔ ماضی جو کہ معلوم ہے اور مستقبل جو کہ تاریک ہے کی داستان سناتی ہے۔

> نعیم کی خود کلامی محض چند اشارات ، چند جھلکیوں اور مختصر ترین الفاظ میں اس کے اسکول کے درد سے لے کر زمانہ موجود تک حالات آگئے ہیں۔[24]

لکھاری لکھتے وقت جب یہ تکنیک استعمال کرتا ہے تو محض ایک شعوری کی رو کو ہی نہیں لے کر چل رہا ہوتا۔ اب نعیم الدین کی سوچ دیکھیں ایک لمحہ میں وہ بر صغیر میں پہنچ جاتا ہے اپنے اسکول کے دنوں کو یاد کرتا ہے اور اس وقت کی اپنی پڑھائی اور آج کی سستی کا تقابل کرتا ہے۔ اپنے جسم کا دیگر طالب علموں کے جسم کے

تقابل کرتا ہے جن میں تو ندا اسے اور پریشان کرتی ہے اور وہ اسے اپنی خامی (لڑکیوں کے وریب نہ آنے کی وجہ) سمجھتا ہے۔

مصنف شعور کی رو کے استعمال میں عام قارئین کی ذہنی سطح کا مکمل خیال رکھتا ہے وہ محض شعور کی رو کو استعمال کر کے سمجھ سے بالاتر نہیں کرتا کبھی تو وہ آزاد تلازمہ خیال کے تحت کردار سے واقف کرواتا ہے اس کی سوچ تک پہنچاتا ہے تو کبھی خود کلامی سے وہ اپنے موقف سے واقف کرواتا نظر آتا ہے۔ شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال، خود کلامی یہ تینوں عناصر خاص ترتیب سے استعمال ہوتے ہیں۔

شیلا گرین کی خود کلامی لندن کی ایک رات میں ایک الگ کہانی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ یہاں شعور کی رو صرف ایک سمت میں بہہ رہی ہے کیوں کہ صرف حافی کا قصہ بیان ہو رہا ہے۔ خود کلامی کا بیان درست مگر اکثر اوقات انسان کی خواہش ہوتی ہے کوئی اس کی بات سنے۔ یہی شیلا گرین کے ساتھ مسئلہ در پیش ہے۔

> شعور کی رو کی تکنیک کر برتتے ہوئے عمل (واقعات) کو کم سے کم الفاظ میں محدود کیا جاتا ہے۔[۲۵]

اس کی بہترین مثال ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' ہے۔ پانچ چھ قصے جو بہت حد تک مکمل شکل میں موجود ہیں وہ بیان ہوتے ہیں اور ضخامت میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اور ہر کردار ''شعور کی رو''، میں بہتا جاتا ہے اور اپنی سطح پر بہت سے اگلے پچھلے خیالات سے جڑے ہوئے ہیں۔ مصنف اس تکنیک سے خاص حد تک دفا کرتا ہے آگے چل کر یہ بیانیہ اسلوب کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے مصنف کو نبض شناس ہونا چاہیے جو کردار کی صورت حال سے مکمل آگاہ ہو اور تمام واقعات پر گرفت رکھتا ہو۔ اعظم کے ذہن میں وقفے وقفے سے ایک ہی بات گردش کر رہی ہے۔

> اگر جین اس وقت میرے ساتھ آگئی ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ توبہ توبہ کوشش بھی کرتا ہوں پھر بھی اس کا خیال آہی جاتا ہے۔[۲۶]

اس خود کلامی میں ایک طرف جبر کا رویہ واضح ہو رہا ہے تو دوسری طرف اعظم کے عشق کی نوعیت جو شاعروں کو تو برا بھلا کہتا ہے مگر خود اسی ڈگر پے چل رہا ہے اعظم کی خود کلامی یک رخی نہیں ایک طرف اخبارات دیکھ کر اس کا ذہن اپنے ''نیٹوز'' اور ''کالے لوگوں'' کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور چند لمحے بعد اس

کے ذہن کی سکرین پر منظر بدل جاتا ہے اور جین کے خیالات بار بار پردہ سکرین پر ابھرتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں ایک لمحہ میں خیال کی رو دنیا جہان کا سفر کر کے ایک موڑ پر آکر رکتی ہے اور پھر اگلے سفر پر نکل جاتی ہے۔

اعظم کی خیال کی رو خاصی طویل ہے اور یہ طوالت سجاد ظہیر کے لیے بھی مشکل پیدا کر رہی ہے۔ اعظم کا ذہن ایک جگہ پر مرکوز نہیں رہتا، بلکہ وہ مسلسل گردش میں ہے۔

۔۔۔دوسروں کے ذہن میں جاری خیالات کی اتھل پتھل اور جاری تصویروں کو اپنے الفاظ میں کوتی دوسرا امتیں نہیں کر سکتا اور نہ کوئی دوسرا شخص اہل ہو سکتا ہے لہذا تخلیق کار اس صورت حال کا اسی کردار کی خود کلامی کے ذریعے اظہار کرتا ہے کبھی کبھی یہ خود کلامی مہمل گوتی اور بے مقصد بھی ہو جاتی ہے۔۔۔[۲۷]

اعظم کے ذہن میں بھی خیالات کی اتھل پتھل ہو رہی ہے کبھی ہندوستان میں اسے اپنا گھر، ماں اور بہن یاد آتی ہیں تو کبھی یہاں کے موسم اور لکھنو کے بازاروں اور گلیوں میں کھیلا جانے والا کھیل شطرنج، گویا اعظم کی طرح یہ صورت حال ہے کہ پوری دنیا اس کی دسترس میں ہے اور اس کا ذہن دو تین بر اعظم کے چکر لگا کر واپس آتا ہے۔ ایک طرف کہیں اعظم کی خاموش خود کلامی ہے اور کہیں بلند اعظم کی سوچ مسلسل گردش میں رہتی ہے۔ جب بھی ذہن کو وقفہ ملتا ہے تو پھر نئے سرے سے وہ جین کو یاد کرنے لگتا ہے۔ ظاہری طور پر تو اعظم کے کردار میں تکرار نظر آتا ہے مگر اس تکرار میں بھی الجھاو نہیں بلکہ منظر نامہ ایک تسلسل سے بدلتا رہتا ہے۔

اعظم اور دیگر کردار ایک انتشار کی کیفیت سے دوچار ہیں اور مستقل مزاجی کسی کردار کا حصہ نہیں۔ ان کا کبھی ایک طرف جھکاو ہے تو کبھی دوسری طرف۔ اس ذہنی انتشار کو ہم اس دور کے تقاضوں کے تناظر میں بہتر دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں اس عہد میں بھی ایک غیر یقینی کیفیت ہے اور کوئی بھی مستقبل کے حوالے سے بے فکر نہیں سب پریشان ہیں کہ آگے کیا ہو گا؟ بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں جنگ عظیم اول، انقلاب روس، اشتراکیت، سرمایادارانہ دنیا اور عالمی کساد بازاری اور دوسری جنگ عظیم کے لیے ہموار ہوتے ہوئے حالات کو دیکھ کر تمام کرداروں کے ذہنی انتشار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

جب ناول نگار آپ کو کسی ایک کردار کے ذہن میں جاری خیالی پیکار کو دکھاتا ہے تو خیال کے سب تلازمے اس مخصوص کردار سے جڑ جاتے ہیں۔۔۔[۲۸]

جب ایک کردار "شعور کی رو" میں بہہ رہا ہوتا ہے تو وہ اطراف کے بہت سے حالات و واقعات سے بے خبر ہو جاتا ہیں۔ اعظم کی خود کلامی اور آزاد تلازمہ خیال میں اس کا ماحول اور حالات بھی سامنے آتے ہیں اسی طرح کریمہ بیگم کی خود کلامی جس میں وہ لندن کے ثقافت، کلچر کو ہندوستان کے تناظر میں دیکھتی ہے وہاں اس کے ارد گرد کا ماحول اور اس کی مخصوص ذہنیت کو ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

خاموش خود کلامی میں انسان مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے اور وہ ایسی بھی بہت سی باتیں دہرا رہا ہوتا ہے جو سر عام معاشرہ میں وہ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ہر انسان کا ذہن خود اس کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہوتا ہے۔ جہاں وہ مکمل اجارہ داری اور اختیار رکھتا ہے۔ ذہن کی اس محفوظ پناہ گاہ کے حالات و واقعات سے واقفیت کے لیے تخلیق کار کو بہت سے اور کردار بھی لانا پڑتے ہیں اور ایک واقع سے وابستہ تمام کرداروں اور ماحول کو پیش کرنا پڑتا ہے مگر خود کلامی خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی اس تکنیک سے ایک ہی کردار سے تخلیق کار تمام منظر نامہ پیش کر سکتا ہے۔ اس تکنیک سے ایجاد و اختصار کسی بھی تخلیق کا حصہ بن جاتا ہے۔ شیلا گرین کی اپنی کہانی ایک الگ کہانی ہے جو اس کی ذات سے وابستہ تھی اور دوسری کہانی اب اس رات والی ہے۔

> میں ایک کافی کے سائبان میں اکیلی بیٹھی جائے پی رہی تھی۔ قریب ہی ایک ہندوستانی لڑکا بیٹھا ہوا تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔۔۔ ہماری پہلی ملاقات اتفاق، ہماری زندگی میں کیسی ہوتے ہیں۔۔۔[۲۹]

شیلا گرین اپنی سابقہ یادر شتوں کو دہراتی ہے۔ یہ کہانی بھی جہاں اپنی ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ وہیں اشتراکیت سے بھی پوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ شیلا گرین کا شعور اپنے ماضی کی طرف بہہ نکلتا ہے اور وہ تمام مناظر اسی رو سے قاری کے سامنے آتے ہیں وہ مستقبل قریب میں آنے والا طوفان، بوڑھے شخص کی پیش گوئی ہیرن ہال سے ملاقات ہونا وہ سارے سوئٹزرلینڈ کے مناظر بھی اسی رو کے تحت دوبارہ تازہ ہوتے ہیں ایک پیش گوئی تو ایک انقلاب کی ہے دوسری اشتراکی نظریات کی تبلیغ کرنے والوں پر جبر ہے۔ اپنی سطح پر ہیرن پال کا ذہن سوئٹزرلینڈ میں بیٹھے ہوئے بھی ہندوستان میں اٹکا ہوا ہے۔ اگرچہ اپنے مستقبل سے کسی حد تک وہ آگاہ ہے مگر وہ جان دینے کو پوری طرح تیار ہے۔

> میں (ہیرن پال) بھلا کس طرح تم سے محبت کر سکتا ہوں ہم میں کون سی بات یکساں ہے۔ میں کالا، تم گوری، میں ہندوستانی تم انگریز میں بت پرست تم عیسائی۔۔۔[۳۰]

یہ پورا نفرت بھرا پس منظر ہیرن پال کے دماغ میں پہلے سے موجود ہے اور ایک، پندرہ کا فرق بھی وہ جانتا ہے اور جن راہوں کا انتخاب اس نے کیا ہے اس کی رکاوٹوں سے بھی واقف ہے۔ یہ سارے مناظر جو بر صغیر کی حالت زاد کے ہیں اس کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ہندوستان میں اور دنیا میں ہم (بر صغیر) ''کالے لوگوں'' کی جان کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس بات کا ہیرن کو بخوبی احساس ہے۔ شیلا گرین کی ایک بات جہاں سے ان دونوں کی کہانی کی ابتدا ہو رہی یعنی اظہار محبت کی، مگر ہیرن پال آگے کر اس بات کو پس منظر اور پیش منظر کے کن تناظرات میں دیکھ رہا ہے۔

ناولٹ 'لندن کی ایک رات'' میں جہاں ہر کردار ایک طرف مجموعی طور پر ایک کہانی کا حصہ ہے اور اس پلاٹ کے واقع کو آگے لے کر چل رہا ہے وہیں وہ اپنی ذات میں ایک الگ کہانی بھی ہے۔ ظاہری کہانی یا شعور کی رو کے ذریعے تشکیل پانے والی ایک الگ کہانی ہر کردار سے کسی نہ کسی سطح پر جڑی ہوئی ہے، اور وہ اسے ماضی کی طرف لے جاتی ہے یا مستقبل کے در پیش چلنج سے۔ شعور کی رو کے استعمال سے بہت سے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں اور تخلیق کار کی مہارت ہی ان کو قابو میں رکھ کر اور ساتھ لے کر جاتی ہے ورنہ شعور کی رو اگر بے قابو ہو تو اس سے کہانی کا حسن خراب ہو تا ہے۔ سجاد ظہیر نے نہایت عمدگی سے شعور کی رو کا استعمال کر کے کرداروں کے سامنے ایک پوری دنیا کا منظر نامہ رکھ دیا ہے۔ ناولٹ کے کردار دو بر اعظموں اشیا اور یورپ میں منقسم دو کشتیوں کے سوار نظر آتے ہیں۔ دنیا جہاں کے موضوعات کردار زیر بحث لا سکتے ہیں اور پھر اپنے مرکز (ہندوستان) پر لوٹ جاتے ہیں۔

> شعور کی رو کی تکنیک سے متعلق کہی گئی بہت سی اور مکمل باتیں اور بھرپور اظہار 'لندن کی ایک رات' میں نہیں ملتا۔[۳۱]

یہ باتیں یوسف سرمست نے جیمس جوائس کے ناول(day of dabln) کے تناظر میں اور دیگر انگریزی کے لکھے گئے ناولوں کے تناظر میں کہی ہے۔ اس بات کو ایک حد تک مان لیتے ہیں کہ جو تمام تکنیک یا شعور کی رو سے وابستہ ہیں وہ اس ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں استعمال نہیں ملتیں۔ مگر عہد کے تناظر میں اس بات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں ان کے برتنے کا اتنا رواج نہیں ہوا تھا۔ انگریزی ناول ایک طویل ارتقا کا سفر طے کر چکا تھا جب ''لندن کی ایک رات'' منظر عام پر آیا اور ناولٹ میں اور دیگر اردو کی اصناف میں یہ بالکل ابتدائی تجربات تھے۔ اگر اسے مان بھی لیا جائے تو کیا صرف سجاد ظہیر نے تکنیک وہاں سے لی ہے یا جیمس جوائس کے ناول کی نقل ہے تو کیا اس کے علاوہ اور اردو ادب میں کوئی خیال یا

تکنیک انگریزی ادب سے نہیں آئی۔ اردو ادب میں بہت سی تکنیکس بغیر ارتقا کے اپنالی گئی ہیں۔ ''ڈبلن کا ایک دن'' یا ''لندن کی ایک رات'' میں تقابل صرف ظاہری طور پر نظر آتا ہے۔

> تکنیک اور وقت کے دورانیہ میں ایک رات اور ایک دن سے یولی سس اور لندن کی ایک رات کا ظاہر رشتہ قائم ہوتا ہے۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہے۔[۳۲]

سجاد ظہیر کے سامنے اپنی ایک واضح منزل تھی وہ کوئی بھٹکتا ہوا مسافر تو تھا نہیں کہ جو موضوع سامنے آیا وہ لکھ دیا اس ناولٹ کا اصل محرک تو برصغیر میں نو آبادیاتی عہد ہے اور دوسرا اشتراکی نظام حکومت ہے۔ جیسا کہ ایک بات کی پہلے بھی وضاحت کی گئی ہے کہ کوئی ناول یا ناولت خواہ اس کا تعلق کسی بھی موضوع سے ہو تخلیق کار شعوری یا غیر شعوری سطح پر اپنی سوچ اس میں شامل کر رہا ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر کا اصل مقصد ایک آزاد اور منصفانہ معاشرہ پر مبنی ایک آزاد وطن کا حصول تھا جہاں پر ہر ایک کو برابر حقوق (اشتراکیت) ملیں۔ شعور کی رو اور اس سے منسلک دیگر تکنیک کا رخ یا بہاو ایک ہی سمت میں بہتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے نظریہ یعنی اشتراکیت کی طرف ہے اور ان تکنیک کو برتنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ دیگر ضمنی باتوں کو اصل اپنی یا نظریہ سے جوڑا جا سکے۔

ج) لندن کی ایک رات، ناولٹ، ہیت اور انفرادیت:

نو آبادیاتی عہد میں ایک طرف تو برصغیر کا براہ راست مغرب سے تعلق استوار ہو گیا اور دوسری طرف ''عالمی گاوں'' کے تناظر میں کوئی بات یا واقعہ محدود نہیں رہ سکا اور وہ جلد یا بادیر پوری دنیا پر پھیل جاتا ہے ایک سطح پر مختلف تحریکوں کا اور سیاسی معاملات ہیں۔ ایک رویہ تو کسی حد تک محدود علاقہ تک رہ سکتا ہے رحجان میں ایک وسیع خطہ آجاتا ہے اور اس سے اگلا قدم تحریک کا ہوتا ہے مثلاً اشتراکیت ایک محدود جگہ سے شروع ہو کر پوری دنیا پر پھیلی اور پوری دنیا کو متاثر کیا۔

جیسا کہ ادب کا معاشرہ سے براہ راست تعلق ہوتا ہے اور جب معاشرہ کسی سوچ یا نظریا سے متاثر ہوتا ہے تو اس کا اثر ادیب پر پڑتا ہے۔ گویا کسی ادب پارے کو پڑھتے ہوئے ہم ایک طرف اس عہد کا بھی مطالعہ کر رہے ہوتے ہیں۔

اصناف ادب کا جائزہ لیا جائے تو یہ ہندوستان میں اکثر مغرب سے آئی ہیں جس طرح مختلف مغربی ملکوں سے اٹھنے والی تحریکوں نے دنیا بھر کے ادب گو متاثر کیا۔ ایسا ہی معاملہ اردو اصناف ادب کے ساتھ

در پیش ہوا۔ اصناف ادب میں چند ایک کو چھوڑ کر اکثر کا بنیادی تعلق یا ان کی بنیادی جڑیں مغرب سے جڑی ہیں اور وہاں ایک پودے نے جب پھل پھول لیا اور خوب بڑا ہوا تو وہ دنیا بھر کی طرح بر صغیر تک پھیل گیا۔ ناول، مختصر کہانی یا طویل کہانی جیسے افسانہ کہتے ہیں ان کا تعلق بھی مغرب سے تھا۔ اسی طرح ایک صنف ناولٹ بھی مغرب سے اردو ادب میں جگہ پاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اردو ادب کی دنیا میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔

ناولٹ چوں کہ مغرب سے آیا اس لیے اردو ادب کے ناقدین یہ فیصلہ کرنے سے ایک مدت تک قاصر رہے کہ اس کو طویل افسانہ یا ناول کہا جائے اور ظاہری طور پر ہی یہی ایک موضوع زیر بحث رہا۔ ناول اور طویل افسانہ سے اس کا تعلق جوڑا جاتا رہا۔ بطور الگ صنف کے اسے پہچان بہت بعد میں ملتی ہے۔

> اس تخلیق (لندن کی ایک رات) کو ناول، ناولٹ یا طویل افسانہ کہنے یا سمجھنے کی تکنیکی بحث بھی خاص اہم ہے۔ خود سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ اس تصنیف کو ناول یا افسانہ کہنا مشکل ہے۔۔۔[۳۳]

ناقدین مسلسل ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کو ناول اور طویل افسانہ کی درمیانی چیز قرار دیتے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ یہی حوالہ زیر بحث آتا رہا ہے ناول کی ضخامت اور کینوس کے تناظرات میں اسے طویل افسانہ کا نام دیا جاتا رہا۔ وحدت تاثر کے معاملے میں جائزہ لیتے ہوئے اس کو طویل افسانہ کا نام دیا جاتا رہا ہے۔

اردو ادب میں اب ناولٹ صنف کے اعتبار سے ایک الگ حیثیت و مرتبہ اور پہچان حاصل کر چکا ہے۔ اس کا تعلق ناول، طویل افسانہ سے جوڑنا مناسب نہیں اور دوسری طرف نہ اس کے لیے الگ نام تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ مجودہ دور میں دنیائے ادب (اردو ادب سمیت) میں ناولٹ ایک الگ حیثیت میں اپنی پہچان کروا چکا ہے۔ بطور صنف جب ناولٹ دنیا میں صنف اپنی پہچان مستحکم کروا چکا تھا تب بر صغیر میں ابتدا ہوتی ہے اور اس دور میں یہ ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' منظر عام پر آتا ہے۔ عتیق احمد جیسے ناقد نے اسے ناول قرار دیا ہے اور اس حوالے سے مختلف دلائل دیتے ہیں۔ موجودہ عہد میں بھی ''لندن کی ایک رات'' کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کا ذہن واقعات کے لحاظ سے اور موضوعات میں وسعت اور اس کے تناظرات کو دیکھتے ہوئے ناول کی طرف جھک جاتا ہے مگر یہصورت حال جزوی طور پر ہے۔ کلی طور پر یہ صنف ناولٹ سے تعلق رکھتا ہے۔

> لندن کی ایک رات کئی اعتبار سے قابل توجہ ناول ہے دراں حالیکہ یہ قطعاً عز روایتی ہے
> اور ناول کی ہیت اور موضوع دونوں کی غیر رسمی اور منفرد ہیں۔۔۔[۳۴]

ایک طرف تو اسے ناول کہا گیا جب یہ مضمون شائع ہوا تو ناول تو بالکل ایک الگ پہچان رکھتا ہے اور ناول ایک طویل ارتقا کے بعد اب ادبی دنیا میں اپنی ایکالگ خاص پہچان رکھتا ہے۔ ہئیت اور موضوع کو مختلف قرار دیتے ہوئے بھی اسے ناول کا نام دینا مناسب نہیں۔

موجودہ عہد میں ناولٹ جہاں اپنی الگ حیثیت منوا چکا ہے وہیں ایک مقبول صنف کا درجہ بھی حاصل کر چکا ہے اور طویل ناولوں کی نسبت ناولٹ مسلسل ترقی کر رہا ہے اور امید ہے کہ مستقبل میں اچھے ناولٹ سامنے آئیں گے۔ ناولٹ بنیادی طور پر ڈھانچے کے لحاظ سے ناول کے قریب ہوتا ہے اس میں بھی لازمی زندگی کے حقیقی واقعات جگہ پاتے پاتے ہیں۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں تو یہ ناول سے مختلف ہوتا ہے اور یہ اپنے ایجازو اختصار میں طویل افسانہ کے قریب آجاتا ہے۔

ایجاز و اختصار ناولٹ کا بنیادی وصف ہے۔ دراصل شعور کی رو سے تخلیق کار مختصر ترین لمحات میں دنیا جہاں کے موضوعات سمیٹ لیتا ہے اور کم سے کم الفاظ میں پورے واقعہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اور بات کم سے کم الفاظ میں مکمل ہو جاتی ہے اور اس طرح الفاظ کی فضول خرچی بھی نہیں ہوتی۔

> اب تک نقادوں اور تخلیق کاروں نے ناول اور ناولٹ میں جو امتیاز قائم کیا اس کا نتیجہ یہ
> نکلتا ہے کہ ناولٹ اختصار ہے ناول کا۔۔۔[۳۵]

ناول اور ناولٹ میں خاص فرق صرف ضخامت کا ہوتا ہے۔ ناولٹ کا تعلق بہت سی مشترک خوبیوں اور تکنیک کی وجہ سے ناول اور طویل افسانہ سے جڑتا ہے ان کو مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ناول کا تعلق زندگی کی حقیقتوں سے ہے اور ناولٹ مختلف ہوتے ہوئے بھی زندگی سے الگ تھلگ نہیں دونوں کا تعلق زندگی کی حقیقت سے بنیادی نوعیت کا ہے۔

ایجاز و اختصاد کے تناظر میں ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ شعور کی رو کے استعمال سے مختصر ترین وقت میں جس میں کرداروں کا ارتقاء بھی نظر نہیں آتا بہت سی باتیں (حالات وواقعات) بیان کر دی گئی ہیں۔ جیسا کہ یہ بات پہلے بھی ہو چکی ہے کہ سجاد ظہیر اپنا نقطہ نظر جلد قارئین تک پہچانا چاہتے تھے۔ اپنا خاص نقطہ نظر قارئین پر واضح کر دینا ہی ان کا مقصد تھا۔

جہاں تک ناول کی خوبی، زندگی سے تعلق ہے ناولٹ بھی زندگی کے واقعات سے بے پرواہ نہیں اور خاص کر ترقی پسند نقطہ نظر سے "لندن کی ایک رات" خاص اہمیت کا حامل ہے۔۔ جیسا کہ یہ بات پہلے بھی ہو چکی ہے کہ سجاد ظہیر بات جلد پہچانا چاہتے تھے اور اپنا خاص نقطہ نظر قارئین پر واضح کر دیناہی ان کا مقصد تھا۔ ناول بھی زندگی کے واقعات کو ہی بیان کرتا ہے۔ اور خاص کر ترقی پسندانہ نقطہ نظر سے "لندن کی ایک رات" کا تعلق براہ راست اپنی سرزمین سے ہے۔ یہاں کے اذہان، حالات و واقعات کی مکمل تصویر اس ناولٹ میں ہمیں نظر آتی ہے۔ کوئی بات یاواقعہ ایسا نہیں اس ناولٹ میں نظر آتا جس کا یہاں (برصغیر) سے تعلق نہ ہو۔

اردو ناولٹ کی مقبولیت کی خاص وجہ اس کا ناول کے مقابلے میں مختصر ہونا ہے اور یہی اس کے عروج کی وجہ ہے۔۔۔[۳۶]

اسی اختصار کے فرق کو دیکھتے ہوئے بہت سے ناقدین اور لکھاریوں نے اسے (لندن کی ایک رات) کو مختصر ناول کا نام دیناہے۔ مگر اب یہ بات رد کی جاچکی ہے اور ناولٹ اپنا الگ وجود منوا چکا ہے۔ عارف کے ساتھ چلنے والی لڑکی کی ایک بات جو وہ لندن میوزیم کے دروازے پر موجود شیروں کے متعلق کرتی ہے اسے مکمل طور پر کئی سو صفحات میں لکھا جاسکتا ہے۔ کہ کیسے وہ دہشت کے مقابلے میں زہریلے ہو چکے ہیں، احسان کیسے مختصر الفاظ میں اپنی پوری بات اپنے طالب علم ساتھیوں تک پہنچا دیتا ہے عرض کہ کرداروں کی تفصیل لکھی جائے تو ایک اچھی خاصی ضخامت پر مشتمل ناول تشکیل پاسکتا ہے۔ جہاں تک ناولٹ کے اسلوب کا تعلق ہے تو یہ بھی کوئی دیگر اصناف سے مختلف نہیں ہوتا اور ناولٹ لکھنے کے لئے اسلوب کے کوئی الگ تھلگ تقاضے نہیں جو اس کے فن و فکر کو پورا کرنے کے بے حد ضروری ہوں۔

ہر فنکار کا اسلوب منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے یہ فنکار کی صلاحیت اور تخلیقی ذہانت اور جدت طبع پر منحصر ہے۔ گویا فنکار پلاٹ، کردار، ماحول اور نقطہ نظر کو جس طرح سے پیش کرتا ہے وہی اس کا اسلوب ہوتا ہے یہی معاملہ ناولٹ کے اسلوب کا ہے۔۔۔[۳۷]

ہمارا سماج کوئی جامد شے نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارا یہ بدلتا رہتا ہے اور اس کے اصول و ضوابط اور تقاضے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں اسی طرح ایک تخلیق کار بھی اپنے ہاں ندرت خیال چاہتا ہے اور وقت اور خاص طور پر حالات کے ساتھ اسلوب بھی بدلتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے قبل اور طرح کے حالات و اقعات اور سماج کی حالت تھی اور خاص قسم کی تخلیقات منظر عام پر آرہی تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے بعد دنیا

کے حالات بدلے اور پرانے نظریوں کی جگہ نئے نظریوں نے لی اور وہ نظریے سماج کی نفسیات کے مرتب تھے تو ادب بھی انہی حالات واقعات میں ڈھلتا گیا۔

ناولٹ نگاری میں جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے ادب معاشرہ کے طابع ہوتا ہے اور جب ہم کسی فن پارے کا مطالعہ کر رہے ہوتے ہیں تو بالواسطہ طور پر اس عہد کے تقاضوں اور حالات و واقعات کو بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ناولٹ کا تعلق بھی ادب کی دنیا سے ہے اور ادب کا تعلق معاشرہ سے ہے اسی میں وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس میں بھی ہر وہ واقع جگہ پاتا ہے جو اس عہد میں جنم لیتا ہے یا معاشرہ پر اچھے برے اثرات مرتب کرتا ہے۔ کوئی خلائی موضوع ناولٹ میں زیر بحث نہیں آتا۔ اور دیگر اصناف کی طرح اس کا تعلق بھی براہ راست معاشرہ سے ہوتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اردو ناول کو موضوعات اور رجحانات کی سطح پر نت نئے موضوعات سے ہم کنار کیا۔۔۔[۳۸]

ایک وقت تھا جب اردو ادب میں ایک خاص قسم کے موضوعات چل رہے تھے (رومانویت)۔ ادب کا اس سطح کا معاشرہ سے براہ راست تعلق نہیں تھا اور ''ادب برائے ادب'' کا نعرہ تھا جس کے تحت ادب تخلیق ہو رہا تھا مگر اشتراکیت نے دنیا بھر کے ادب میں ہلچل مچادی اور ادب کو نئے نئے موضوعات دیے جن کے تحت ادب لکھا جانے لگا۔ ترقی پسند تحریک نے ادب (تخلیق) کا رشتہ سماج اور سیاست سے گہرا کر دیا۔ یہ تحریک ایک ایسی تحریک تھی جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے تھا اور اس کے تحت نئے نئے موضوعات نے جنم لیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں ایک نیچی سطح کے موضوعات سے لے کر بین اقوامی موضوعات تک ادب میں جگہ پاتے ہیں اور ایک عالمی ادب کا منظر پیدا ہوتا ہے۔

''لندن کی ایک رات'' میں جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے یہ ایک ایسی تکنیک ہے جو اپنے خاص تقاضے رکھتی ہے یعنی شعور کی رو کی تکنیک اس کے تحت لکھے جاتے والے فن پاروں میں پلاٹ کی خاص نوعیت ہوتی ہے۔

شعور کی رو کی تکنیک والے ناولوں میں پلاٹ اور قصے کا وہ روایتی اور بیانیہ ترتیب و تسلسل نہیں ہوتا۔۔۔[۳۹]

پلاٹ کی مثال ایک تسبیح کے دھاگے کی طرح ہے اور فن کار کرداروں کے ذریعے اس دھاگے کے گرد کہانی بنتا ہے اور اسے آگے لے کر چلتا ہے۔ یہاں ''شعور کی رو'' کی تکنیک سے کرداروں میں تسلسل اور

ایک ارتقا کا تصور معدوم ہو جاتا ہے اس تکنیک سے کردار ماضی، حال اور مستقبل سے بیک وقت وابستہ ہوتے ہیں اور ان کا ذہن دریا کی طرح مسلسل یک سمت نہیں بہتا۔

''لندن کی ایک رات'' میں بھی پلاٹ کے ساتھ یہی ہوا ہے کہ شعور کی رو سے کردار وقت کے پنجوں سے آزاد اپنی مرضی سے آجا رہے ہیں کہیں آزاد تلازمہ خیال کے تحت یہ رو مسلسل یک طرفہ بہہ رہی ہے اور کہیں سرریئلزم کی صورت حال درپیش ہے۔ ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں کوئی مربوط پلاٹ نہیں۔ بلکہ کرداروں کے ذریعے کہانی اور واقعات کو مربوط کیا گیا ہے۔ دراصل شعور کی رو کے تحت لکھے جانے والے ناولوں میں پلاٹ کے تحت یا ساتھ لے کر چلنا ناممکن ہو جاتا ہے اور پلاٹ کے تقاضے نبھانا تخلیق کار کو پابند کیے رکھتا ہے جب کہ اس تکنیک سے تخلیق کار آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا میں گھوم پھر کر مرضی کے موضوعات اور واقعات بیان کرے۔ عموماً واقعات کا ایک تسلسل سے بیان اور ہر واقعہ کا دوسرے سے جڑا ہونا مربوط پلاٹ کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ لیکن شعور کی رو کی وجہ سے ''لندن کی ایک رات'' میں پلاٹ کی وہ مربوطی نظر نہیں آتی۔ لیکن اس ناولٹ میں ڈھیلا ڈھالا ہی سہی پلاٹ موجود ہے۔

> اس ناولٹ (لندن کی ایک رات) میں بیانیہ سادہ ہے اور تکنیک براہ راست۔۔۔ مصنف نہایت آہنگی کے ساتھ شہر کی فضا سے کردار کے ذہن تک پہنچ جاتا ہے کہ ہمیں نہ دھچکا لگتا ہے اور نہ تھم کا احساس ہوتا ہے تکنیک برتنے میں سجاد ظہیر کی ہنرمندی کا یہ خاص انداز ہے۔[۴۰]

سجاد ظہیر نے کمال مہارت سے مختلف واقعات کو اس طرح لڑی میں پیرو دیا ہے کہ ان میں باہم مطابقت اور مربوطی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ تک کے فرق کو انھوں نے محسوس نہیں ہو نے دیا ایک صرف لندن کے موسم کا ذکر ہے اور دوسرے ہی لمحے میں اعظم کی خود کلامی جس سے ہم جو تصویر دیکھتے ہیں وہ ہمیں پہلی سے باہم جڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ کریمہ بیگم کا ذہن ایک ہی لمحہ میں جدید رویت سے اپنی قدیم روایت کی طرف پلٹ آتا ہے اور اس کے دماغ میں تقابل کے مناظر جنم لینے لگتے ہیں مگر ان مختلف مناظر میں قاری کو کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تکنیکی لحاظ سے اگرچہ پلاٹ مربوط نہ سہی مگر واقعات کے ذریعے بہت حد تک اس بات کی کمی کو پورا کیا گیا ہے۔

ایک طرف سوئٹزرلینڈ کے واقعات دوسری طرف لندن اور پھر پیرس اور اشتراکیت کے حوالہ جات میں روسی حوالہ جات اور آخر میں برصغیر سے وابستگی ان جگہوں سے جڑے ہوئے واقعات اور کرداروں

کو ایک خاص تکنیک (شعور کی رو، سر رئیلزم) سے باہم جوڑا گیا ہے اور یہ سارے واقعات ایک تسلسل میں ایک کے بعد دوسرا ابھرتے ہیں ایک رات کے کم وقت میں بہت سے واقعات کو باہم مربوط کیا گیا ہے اور رات کا آخری پہر نعیم الدین اور شیلا گرین کے نام رہا ہے۔

> سجاد ظہیر نے مغربی Location میں سراسر مغربی صنف کو مغربی انداز اور تکنیک سے برتتے ہوئے وہ اپنی مشرقی حس، طرز احساس سے دستبردار نہیں ہوتے۔[41]

جہاں تک یوسف سرمست کی بات کا تعلق ہے وہ درست ہے کہ انہوں نے شعور کی رو سے متعلق تمام تکنیک کو ناولٹ (لندن کی ایک رات) میں نہیں اپنایا لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ مغربی ذینت تو اسے سمجھ سکے اور پڑھ سکے مگر مشرقی لوگوں کو مشکل ہو اور ترقی پسند یا اشراکیت کا نقطہ نظر رکھنے والا مصنف سادہ انداز میں بات قاری تک منتقل کرنا چاہتا ہے اور لوگوں کو ہم خیال بنانے کے لیے سادہ زبان استعمال کرتا ہے۔ زبان و بیان کے حوالہ سے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کی خاص اہمیت نہیں (جیسا کہ ترقی پسندی میں ہوتا ہے) سجاد ظہیر ادبی لحاظ سے پورا قد کاٹھ رکھتے تھے اور زبان و بیان کو مکمل طور پر جانتے اور اس پر عبور رکھتے تھے۔ انسان جہاں رہتا ہے اس ماحول کا اثر نہ چاہتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر قبول کرتا ہے۔ سجاد ظہیر بر صغیر کے عام مزدوروں اور کسانوں کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور انہی کو ہم خیال بنا کر انہی کی حکومت چاہتے تھے اب وہ ایسے الفاظ کیسے استعمال کرتے تھے جو اس طبقہ فکر کے لوگوں کو سمجھ ہی نہ آتے۔ بہت سے الفاظ انگریزی کے استعمال ہوتے ہیں مگر وہ عام فہم ہیں۔ مثلاً گڈ ڈے، گڈ ٹاک، گائیڈ، ہاؤس، پالٹکیس، ایکٹرس، گڈ ایوننگ ہے اور گڈ مارننگ وغیرہ وغیرہ ایک مصنف مواد کتنا ہی اچھا کیوں نہ لے آئے اور ترتیب کیسی ہی ہو مگر اسے الفاظ کا لباس پہناتے ہوئے بے حد احتیاط اور نفاست (ایسا عموماً ادب برائے ادب میں ہوتا ہے) سے انہیں جوڑتا ہے اور خاص کر جب ان پڑھ یا اوسط کم پڑھا لکھا طبقہ آپ کے مخاطب ہو۔ انسان کو ایک خاص پیرایہ بیان کی بہر حال ضرورت رہتی ہے۔ سجاد ظہیر نے اس ناولٹ میں عمودگی سے اور الفاظوں کو باہم ترتیب سے بیان کیا ہے اور جس طرح کا کردار تھا اسے ویسی ہی زبان دی ہے۔ خان جب شراب سے بد ہوش ہو جاتا ہے تو وہ کہتا ہے۔

> پالیٹکش کی باتیں ختم کرو۔ جہاں جاؤ شالی پالیٹکش دم کے پیچھے لگی ہے اس سے نجات ملنی مشکل ہے۔[42]

خان مدہوشی کے عالم میں ہر لفظ کے آخر پر "ش" کا اضافہ کرتا ہے اور عموماً جیسے شرابی بولتے ہیں سجاد ظہیر نے ویسی ہی زبان اسے دی ہے جیسی ایک نشے میں دھت شخص استعمال کرتا ہے۔ سیاست سیاست بالشویک، جاگیرداری وغیرہ کے مطابق ہیں اور یہ کوئی بناوٹی نہیں انہیں تجربہ ہوگا اپنے شرابی دوستوں سے۔ ایک مصنف اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ اسے بات کس کس طرح، کس انداز اور کن الفاظ میں کرنی ہے اور وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ وہ کن لوگوں سے مخاطب ہوں۔ ان سارے اصولوں کو مدنظر رکھ کر وہ قلم اٹھاتا ہے تبھی وہ اپنے مخصوص مقاصد حاصل کرپاتا ہے ورنہ باتیں ہوامیں کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

کرداروں کے حوالے سے سجاد ظہیر نے مختلف اقسام کردار اکھٹے کیے ہیں اور ان کا" رول" بھی حسب حال ہے کسی نہ کسی حد تک اس کا نو آبادکار یا دوسری طرف نو آبادی سے تعلق ضرور جڑا ہوا ہے۔ ہر مصنف اپنا مخصوص نظریہ رکھتا ہے اور اس کا وہ نظریہ اپنے اردگرد کے ماحول سے ہی تشکیل پاتا ہے ایک معاشرہ میں ہونے والے واقعات لازماً اس میں رہنے والے افراد کو بھی متاثر کرتے ہیں اور مصنف بھی اسی معاشرہ کے اثرات قبول کرتا ہے اور کسی حد اپنے نظریات و افکار سے معاشرہ کو متاثر کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادب کو ابلاغ کے ایک بہت بڑا ذریعہ کے طور پر لیا گیا اور اس کا تعلق مقصد سے قائم کیا گیا اور اشتراکیت کا خاص نقطہ نظر رکھنے والا ایک بندا بھلا کیسے ایک ایسی تخلیق لکھ سکتا ہے جس میں اس کے اپنے نظریات شامل نہ ہوں، جن سے وہ لوگوں کو قائل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس ناولٹ میں جو تکنیک اور اصول و ضوابط شامل ہیں ان کا تعلق بے اختیار اشتراکیت سے جڑتا ہے۔ جب ادب کو بطور ایک آلہ کے اور مخصوص مقاصد کے تحت لیا جائے تو" ادب برائے زندگی" کا تصور جنم لیتا ہے اور ادب پھر بس لوگوں تک اپنی ہی بات پہنچانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کیوں کہ ادب پہلے ادب ہے اس کے بعد کچھ اور ہے۔ اشتراکیت کے تحت یا ترقی پسند تحریک کے تحت لکھے جانے والے ادب میں انداز بیان سے زیادہ مقصدیت مدنظر رہی ہے۔ "لندن کی ایک رات" بھی مقصدیت کے تحت لکھا گیا۔ "شعور کی رو" بھی کرداروں کے اندر جو ایک الجھن یا گھٹن کی کیفیت ہے اسے منظر عام پر لانے کے لیے استعمال ہوئی ہے، دوسری طرف اس کا ایک خاص ایجنڈا (اشتراکی) تھا۔

> شعور کی رو پیش کرنے کا اہم ترین ترقی یافتہ طریقہ بلا واسطہ داخلی کلام ہے۔۔۔ دوسرے الفاظ میں کردار اپنا ذہن خود پیش کرتا ہے۔[۴۳]

ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں تمام کرداروں کے ذہنی کشمکش ہمیں زیادہ تر داخلی خود کلامی سے معلوم ہوتا ہے۔ ۲۰ صدی میں عالمی منظر نامہ بھی دھند چھائی ہوئی ہے۔ تمام کردار اپنے مستقبل سے خوف کا شکار ہیں اور اس خوف کی وجہ پہلی عالمی جنگ (اور دوسری کی لیے ہموار ہوتا ہوا راستا ہے)، انقلاب روس، اشتراکیت اور سرمایہ داری کی کشمکش۔ اسب سے بڑھ کر بر صغیر کی حالت ذار ہے اگر چہ دھند کم ہونا شروع ہو چکی ہے۔ امید کی کرنین نظر آنے لگی ہیں پھر بھی مستقبل کی کوئی واضح تصویر نظر نہیں آرہی۔ ہر کردار ذہنی طور پر انتشار کا شکار نظر آتا ہے۔

ہر ناولٹ ایک مخصوص پس منظر رکھتا ہے جس طرح ایک ڈراما کر کے دکھانے کے لیے ایک خاص ''سیٹ''' کا ہونا ضروری ہے اسی طرح ناولٹ اور ناول میں وہ ''سیٹ'' پس منظر ہوتا ہے لندن کی ایک رات کے پس منظر میں مصنف سجاد ظہیر کی وہ مخصوص سوچ ہے جس کو وہ عمل صورت دیکھنا چاہتے تھے اور پھر تخلیقی راستہ کو چھوڑ کر عملی طور پر میدان میں آگئے۔ اور آہستہ آہستہ تخلیق کی طرف رحجان کم ہوتا گیا۔ سجاد ظہیر نے پلاٹ کو پیچیدہ بنا دیا ہے اور پلاٹ کے مقابلے میں واقعات کو اہمیت دی ہے پانچ، چھ واقعات کسی حد تک ایک دوسرے سے مربوط تو نظر آتے ہیں مگر مکمل طور وہ ایک پلاٹ کی تشکیل نہیں ہو پاتی یا پلاٹ میں ایک وحدت نہیں قائم ہونے دیتے۔

''شعور کی رو'' کی وجہ سے پلاٹ سادہ نہیں رہا یہ دراصل مصنف کا خیال ہے کہ کردار وقت (ارتقا) سے آزاد ہیں اور کردار کو خاص طریقہ سے وقت کی گرفت میں نہیں آنے دیتا اور وہ دنیا جہاں کے موضوعات پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ منظر نگاری میں دو جگہوں پر خاص توجہ ملتی ہے ایک لندن کے موسم کی اور دوسرا نعیم الدین کا کمرا جو کہ ایک ''سیٹ'' بھی ہے زبان وبیان پر مہارت کے ثبوت ''لندن کی ایک رات'' میں جگہ جگہ ملتے ہیں مگر مقصد کے تحت لکھا جانے کی وجہ سے زبان و بیان سے زیادہ نظریہ واضح کرنے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔

تمام تکنیک کے تقابل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سجاد ظہیر کے سامنے اپنا مخصوص نظریہ لوگوں تک پہنچا مقصد تھا۔ نا کہ کوئی شاہ کار تخلیق کرنا۔ ''شعور کی رو'' ناولٹ کو بہت حد تک وسعت دینے میں بھی مددگار ثابت ہوئی ہے۔ اس سے ناولٹ کا دائرہ کار وسیع ہو گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اظہر پرویز، ادب کا مطالعہ، دبستان ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۹

۲۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۶ء ص ۳۲۴

۳۔ ظہیر کاشمیری، ادب کے مادی نظریات، کلاسیک، لاہور، ۱۹۷۵ء ص ۴۳

۴۔ نعیم الدین ازہر، ڈاکٹر، سجاد ظہیر حیات دیہات، مظہر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء ص ۱۸۲

۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، فلیپ، نیا ادارہ: لاہور، ۱۹۷۴ء

۶۔ سید مظہر جمیل۔ انگارے سے پگھلا نیلم تک، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۹

۷۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۹۴

۸۔ یوسف سرمست، داکٹر، بیسویں صدی میں اور ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۳۰۲

۹۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۶

۱۰۔ یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اور ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء ص ۳۲۱

۱۱۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۲۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۹۵

۲۰۔ یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اور ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء ص ۳۲۶

۲۱۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ص ۹۹

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۲۳۔ ایضاً، ص۹۹

۲۴۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۱۰۵

۲۵۔ سید مظہر جمیل، انگارے سے پگھلا نیلم تک، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۵ء ص ۱۱۰

۲۸۔ ایضا، ص ۱۱۲

۲۷۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۱۱۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۲۹۔ یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اور ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء ص ۳۲۶

۳۰۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، ص ۱۱۰

۳۱۔ قمر رئیس، سجاد ظہیر حیات اور ادبی خدمات، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ص ۵۴

۳۲۔ ساجدہ زیدی، لندن کی ایک رات، (مضمون)، سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۴۷

۳۳۔ وضاحت حسین رضوی، ڈاکٹر، ناولٹ کا فن (مضمون) مرتبہ وضاحت حسین رضوی، اور ناولت ہیت اسالیب اور رحجانات، پرکاش پکچر یس لکھنو، ۲۰۱۴ء ص ۳۷

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۳

۳۶۔ انور پاشا، ترقی پسند اور ناول، پش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۶

۳۷۔ انور پاشا، ترقی پسند اور ناول، پش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰، ص ۸۵

۳۸۔ آصف فرخی، لندن کی وہی ایک رات، (مضمون) سجاد ظہیر ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، مرتب گوپی چند نارنگ، سنگ پیل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۶۵

۳۹۔ ایضاً، ص ۷۰

۴۰۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۶۸

۴۱۔ محمد فروز، ڈاکٹر، لندن کی ایک رات خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات و خدمات سجاد ظہیر ساقی بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۷

باب پنجم:

ماحصل

الف) مجموعی جائزہ:

نو آبادیات کا تصور ایک ایسا تصور ہے، جس میں ایک ملک، خطہ کی تاریخ و تقدیر بدل جاتی ہے۔ نو آبادیات میں بنیادی طور پر دو کردار کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک فاتح کی حیثیت سے وارد ہوتا ہے جسے ”نو آباد کار“ کہا جاتا ہے اور دوسرا کردار مفتوح کا جسے نو آبادی (نئی آبادی) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نئی آبادی جس کا اپنا مال و متاع بھی اپنا نہیں ہوتا اور نہ اپنے قوانین ہوتے ہیں۔ پابند ہو جاتی ہے اور نو آباد کار ایک امام کی صورت میں اور نو آبادی مقتدی بن جاتی ہے۔

نو آبادیات کے ابتدائی عرب اور یورپ کے زمانے سے آج تک یعنی ۲۱ ویں صدی میں اس کے طریقہ ہائے کار، طریقہ واردات بدلتے رہے ہیں۔ ابتدائی مسلمانوں کی آمد کے بعد برصغیر میں ایک اور تصویر نظر آتی ہے۔ یورپی اقوام کے تجارتی مقاصد سے سیاسی مقاصد تک دیکھ لیں، وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک ملک یا خطہ میں اگر حالات خراب ہیں تو دوسرے کو مرضی کا اختیار کس نے دے رکھا ہے کہ وہ اس ملک کے اندر مداخلت کرے اور وہاں تباہی مچاتا پھرے۔

برصغیر میں نو آبادیاتی تاریخ مختلف روپ میں ایک طویل عرصہ پر محیط ہے اور ابھی تک (مابعد نو آبادیاتی) یہ تسلسل چل رہا ہے۔ ایک عہد گزر گیا مگر اس عہد کے اثرات ابھی تک رنگ دکھا رہے ہیں۔ برصغیر میں نو آبادیاتی عہد عرب و فارس، پرتگال، فرانس اور برطانیہ تک پھیلا ہوا ہے جو ۱۹۴۷ء میں اختتام کو پہنچا، مگر ہم ایک ایسے قیدی کی صورت میں اب موجودہ عہد میں ہیں جو طویل عرصہ جیل میں گزارنے کے بعد اب باہر کا ماحول اس کے لیے اجنبی ہے اور یہ باہر کی دنیا اسے پسند نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو جیل میں خوش و خرم اور محفوظ پاتا ہے اور یہ زندگی اسے پسند ہے اور قابل قبول ہے۔

برصغیر میں برطانوی نو آبادیاتی عہد، نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی اثرات میں خاصا طویل ثابت ہوا ہے۔ ایک کمپنی کی تجارتی کہانی اور پھر سیاسی مداخلت اور وہاں سے براہ راست تاج برطانیہ کے کنٹرول میں چلے جانا خاصی طویل ہے۔

نو آبادیاتی عہد میں نو آبادی دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے اور اس تقسیم کے ساتھ نو آباد کار نو آبادی کو متحد ہونے سے بچانے کے لیے طرح طرح کے گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اسی طرح نو آبادی میں ایک گروپ وہ ہوتا ہے جو نو آباد کار کی پیروی میں عافیت سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو مکمل طور پر نو آباد کار کے رنگ میں رنگ کر اپنی شناخت تک بھول جاتا ہے۔ یہ گروپ ابتداء میں کم لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور برصغیر میں خاص طور پر پاکستان میں یہ گروہ مابعد آبادیاتی اثراتی کے تحت ابھی تک انہی چکروں میں الجھا ہوا ہے اور مسلسل نشوونما پا رہا ہے اور پھل پھول رہا ہے۔

دوسرا گروپ وہ ہوتا ہے جو اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ ہم غلام ہیں اور ہمیں یہ زندگی جس میں غلامی شامل ہو وہ ناقابلِ قبول ہے اور مختلف مواقع پر وہ آزادی کے حصول کے لیے کوششیں کرتے ہیں اور کامیابی اور ناکامی سے ڈرے بغیر وہ اپنی جدوجہد جاری رکھتا ہیں۔ ابتداء میں ان لوگوں کی بھی تعداد خاصی کم ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ ان میں کمی یا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

پہلا گروپ جو کہ غلامی کو ترجیح دیتا ہے، وہ اپنا سب کچھ بھلا کر اپنی زبان تک کو بے وقعت گردانتا ہے انگریزی بولنا اپنے لیے قابلِ فخر سمجھتا ہے۔ یہ گروپ نو آباد کار کے لیے سود مند ثابت ہوتا ہے اور ان کے لیے بے حد آسانیاں پیدا کرتا ہے اس کے بدلے میں اسے تھوڑے سے اختیارات مل جاتے ہیں۔

ان سے مختلف ایک اور تیسرا گروپ بھی ہوتا ہے، جو نو آباد کار کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی خود مختاری، آزادی اور حقوق کے لیے جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔ برصغیر میں یہ گروپ مارکسی نظریہ کے پیروکار نظر آتے ہیں اور دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح یہاں (برصغیر) میں بھی اشتراکی طرزِ حکومت چاہتے ہیں اور اس کام کے لیے وہ عملی جدوجہد کو اپناتے ہیں۔ سجاد ظہیر کا تعلق اسی تیسرے حلقہ سے ہے جو نو آبادیاتی نظام میں رہتے ہوئے ایک کامیاب زندگی اور سرمایہ دار ہونے کے باوجود آزادی، حقوق کے حصول کے لیے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے ہیں، مگر مقصد سے پیچھے نہیں ہٹتے۔

میرے خیال میں ان مارکسی نظریہ کے پیروکاروں اور ان کی تبلیغ کرنے والوں کے خیال میں تقسیم ہند کا کیا فارمولا تھا، شاید وہ تقسیم سے پہلے ہندوستان میں طرزِ حکومت کی تبدیلی چاہتے تھے اور مزدوروں اور ایسے غریب کسانوں کے ذریعے سرخ انقلاب کو ترجیحی دیتے تھے، جن میں سرمایا داروں کے ہاتھوں سلب شدہ

حقوق کو دوبارہ حاصل کیا جائے سکے۔ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو اور منافع میں سب برابر کے حصہ دار ہوں۔ برصغیر میں تبدیلی کے بارے میں یہ بنیادی طور پر ہر سوچ کار فرما تھی کہ رَدنو آباد کار اور سرمایادار معاشرہ کے ساہوکار اور دیگر بڑے جاگیر دار جن کو انگریزوں نے خاص طور پر نواز رکھا تھا، ان سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور برصغیر میں ایک طرف آزادی ہو، اور دوسری طرف مقامی آبادی اپنے وسائل خود استعمال کر سکے اور دنیا میں آگے بڑھ سکے۔ یہاں کی عام عوام کو اور محنت کرنے والوں کو حکومت کا حق حاصل ہونا چاہیے اور فیصلوں کا اختیار بھی انہی کے ہاتھوں میں ہو۔ دولت چند ہاتھوں میں اکھٹی ہونے کی بجائے معاشرہ یا ملک میں اجتماعی ترقی کے مقاصد کے لیے استعمال ہو سکے۔

سجاد ظہیر اور ادب میں انتہائی اہمیت کا حامل نام ہے۔ ان کا عہد نو آبادیاتی عہد ہے۔ جس میں برصغیر کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی ہے۔ ایک طرف نو آباد کار اسے (برصغیر) مسلسل لوٹ رہا ہے اور دوسری طرف مقامی وڈیرے، جاگیر دار، وکیل، ساہوکار اور دیگر جو انگریزوں کے دست راست ہیں انہوں نے ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور عام عوام سے ان کا کوئی دور پارہ کا بھی تعلق نہیں۔

برصغیر میں انگریز نو آباد کار نے حکومت کا ایک ایسا طریقہ نافذ کیا، جس کو ہم ''مقامی طرزِ حکومت'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ باغیوں اور دوسرے مخالفین کو قابو کرنے کے لیے یہ مقامی راجے، مہاراجے مکمل طور پر انگریز کی حمایت کرتے اور اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ظلم وزیادتی کا رویہ روا رکھتے، بیوروکریسی جو کہ ایک الگ مخلوق سے تعلق رکھتی تھی وہ عام سائلین اور لوگوں کو انسان تک نہیں سمجھتے تھے۔ مابعد نو آبادیاتی عہد میں آج بھی کچھ بدلہ ہوا نہیں معلوم ہوتا سوائے اس بات کے کہ انگریز نو آباد نے برصغیر کو چھوڑ دیا، لیکن ان کے بنائے ہوئے تمام اصول وضوابط زندگی کے ہر شعبہ میں لاگو ہیں۔ آج بھی یوں لگتا ہے کہ ہمارا لندن دارالحکومت ہے۔ ہمارے سیاست دانوں کے تعلق مقامی آبادی سے صرف جمہوریت جمہوریت کے کھیل تماشے تک محدود ہیں۔ ہمارے حکمران، بیوروکریٹس لندن سے خاص انس رکھتے ہیں۔ ہماری (پاکستانیوں) کی دولت کا رخ ۱۶۰۰ء سے اور خاص طور پر ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک لندن کی طرف ہے۔ فلیٹ ہوں یا بنک بیلنس لندن کو مرکزیت حاصل ہے۔ ہماری تعلیمی پالیسی آج بھی گوروں کی مرہون منت ہے۔ خام مال آج بھی لندن اور دیگر یورپی ملکوں میں جارہا ہے اور ہمارے پاس کچھ اپنا نہیں۔ نو آباد کار کا بنایا ہوا اصول کہ برصغیر کو زراعت پر جامد رکھا جائے، آج بھی ہم زراعت پر انحصار کیے ہوئے ہیں۔ برصغیر کی مجموعی صورت حال ابتر ہوتی گئی اور ان حالات میں ہمیں نظامِ حکومت کی تبدیلی کا خیال آتا ہے اور

سجاد ظہیر نے سرمایا دارانہ طرز حکومت کو برصغیر سے ختم کر کے آزادی کے حصول، منصفانہ اصولوں پر معاشرے کو اور ملک کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایک ادیب کے پاس اہم ہتھیار اس کا قلم ہوتا ہے اور اسی سے جہاد کا الم بلند کرتا ہے اور لوگوں میں آگاہی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے اور کمیونزم کے تحت لکھے گئے ادب پر جیسا کہ الزام بھی آتا ہے کہ مقصدی ادب ہے اور" ادب برائے زندگی" کے تحت لکھا گیا ہے۔ اس میں ترقی پسند کی تبلیغ کی گئی اور سیاسی جماعت بنائی گئی تا کہ ۱۹۱۷ء میں روس میں ہونے والی تبدیلی کے عمل کو برصغیر میں دوہرایا جاسکے۔

سجاد ظہیر نے "ادب برائے زندگی" کے تحت لکھے گئے ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا، اگرچہ یہ عہد کی ضرورت کے تحت لکھا گیا، اور خاص کر مارکسی نقطہ نظر رکھنے والوں کی ضرورت تھا۔ اس میں لوگوں کو ہم خیال بنانے کے لیے سجاد ظہیر نے ایک اہم ناولٹ "لندن کی ایک رات" تخلیق کیا گیا۔ "لندن کی ایک رات" نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی نقطہ نظر اور سوچ کے حوالے سے سجاد ظہیر کا بہت اہمیت کا حامل ناولٹ ہے، جس میں انہوں نے ایک طرف دنیا کے منظر نامہ کو پیش کیا ہے تو دوسری طرف برصغیر کی صورت حال واضح نظر آتی ہے۔ جس میں برصغیر میں رہنے والے لوگوں (کالے لوگوں) اور امراء کی اولاد بیرون ملک پڑھتے ہیں وہ کیا سوچ رکھتے ہیں۔

ایک ملک کے اندر رہنے والا ادیب اپنے ملک کے حالات و واقعات کو موضوع تخلیق بنائے گا اور دنیا گھومنے والا دنیا کے دیگر خطوں کے ادیبوں سے ملاقاتیں رکھنے والے کا وژن بھی پہلے کے مقابلے میں وسیع ہوتا ہے اور دنیا بھر کے اہم موضوعات اور ان کے دنیا پر اثرات اور ان کے تناظر میں اپنے ملک کی صورتحال کا جائزہ اور تجزیہ پیش کرے گا اور انہیں زیر بحث لائے گا۔

سجاد ظہیر اسی لیے دنیا بھر کے موضوعات پر دسترس رکھتے ہیں کہ انہوں نے دنیا دیکھی ہے اور دنیا کے اہم ادباء سے سیکھا اور پڑھا ہے۔ "لندن کی ایک رات" کو موضوعاتی حوالے سے دیکھیں تو اس میں ہمیں ایک طرف ہندوستانی مختلف موضوعات ملتے ہیں اور ساتھ ساتھ برطانوی ہندوستان کے مسائل منظر عام پر لاتے ہیں بلکہ خود برطانیہ کے اندر کون سے مسائل ہیں وہاں کے موضوعات کو اپنی تخلیق کی زینت بناتے ہیں اور دونوں خطوں کا تقابل بھی کرتے ہیں۔

کوئی لکھاری ایسے موضوعات نہیں پیش کرتا جن کا معاشرہ سے تعلق نہ ہو کیوں کہ وہ موضوعات زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ پاتے۔ ہر ادیب ایک معاشرہ کا ایک ملک کا رہنے والا ہوتا ہے اور وہاں کے

موضوعات جو خود اس پر اچھا برا اثر ڈالتے ہیں ان پر قلم اٹھاتا ہے۔ ان کو اپنی نظر سے دیکھ کر لوگوں کو دیکھاتا ہے۔ بڑا ادیب مختلف ملکی مسائل اور موضوعات کو اپنے نقطہ نظر کے ساتھ پیش کرتا ہے اس طرح وہ اپنے نظریات بھی لوگوں تک پہنچاتا رہا ہوتا ہے اور ان لوگوں کو ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگوں پر اثر انداز ہونے ان کی رائے اپنے لیے ہموار کرنے میں مقصدی ادب خاص اہمیت رکھتا ہے۔
''لندن کی ایک رات'' میں سجاد ظہیر نے ہندوستان اور پوری دنیا کے اس وقت کے اہم موضوعات کو زیر بحث لایا ہے اور ان موضوعات کو اپنے برصغیر کے سیاسی و معاشی حالات کے تناظر میں دیکھا ہے۔ اس عہد کے اہم ملکی اور بین الاقوامی موضوعات میں ''معاشیات'' کا مسئلہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ معاشرہ میں دولت کی منصفانہ تقسیم ہو یہ مسئلہ ہندوستان اور برطانیہ میں یکساں نوعیت کا تھا کہ وہاں برطانیہ میں صنعت کار دولت سمیٹ رہا ہے اور منافع کا قلیل حصہ بھی مزدور کو دینے کو تیار نہیں۔ یہاں برصغیر میں وڈیرے، جاگیر دار، ساہوکار معاشرہ کو لوٹ رہے ہے۔ اس دور میں مارکسی نظریات پوری دنیا کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دنیا بھر کے انسانوں کی کثیر تعداد اپنے معاشی حالات کی وجہ سے ان نظریات کو پسند کرتی ہے۔ سجاد ظہیر نے معاشی موضوعات میں دنیا کے دونوں خطوں (ہندوستان، برطانیہ) سے تعلق رکھنے والے مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کو پیش کیا ہے اور ان کا تقابلی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور یہ دیکھایا بھی ہے کہ دنیا بھر کے مزدوروں کے بنیادی مسائل ایک جیسے ہیں۔

دوسرا موضوع تہذیبی و ثقافتی ہے۔ ان موضوعات میں دنیا بھر کے رہنے سہنے اور بولنے چالنے کے بہت سے موضوعات سماجاتے ہیں۔ بہت سے مسائل جو ہندوستان کے معاشرہ میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً: زبان کے حوالے سے ہم مکمل طور پر نو آباد کار کے پیروکار ہو چکے ہیں اور بہت سے ہندو، مسلمان انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی گوروں کے لہجے میں۔ انگریزوں نے ان لوگوں کیو چند اختیارات کے عوض خرید لیا۔

برصغیر میں مختلف رسوم و رواج کو موضوع بحث لا کر ان کا برطانوی رسوم و رواج سے تقابل کیا گیا ہے۔ مثلاً: شیلا گرین کی نعیم الدین سے شادی کے معاملے پر گفتگو کرنا اس بحث میں وہ اپنے اپنے معاشرہ میں شادی کے معاملے پر گفتگو کرنا اس بحث میں وہ اپنے اپنے معاشرہ میں شادی سے وابستہ مختلف فرسودہ رسومات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ برطانیہ میں شادی کے معاملے میں لڑکے، لڑکیاں آزاد اور خود مختار ہیں لیکن برصغیر میں اور خاص کر ہندوستان میں وہ مثال دیتا ہے کہ ہم ایسے شادیاں کرتے ہیں جس طرح کبوتروں کے جوڑے ڈبوں میں لگائے جاتے ہیں اور پھر دونوں پرندے اور انسان بچے پیدا کرتے ہیں۔

معاشرتی موضوعات بھی ''لندن کی ایک رات'' میں پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً: لڑکے لڑکیوں کا مل کر پارٹی میں ناچنا، گانا یہاں بھی وہی انگریزوں اور یہاں کے طریقہ کار میں تقابلی تصویر آتی ہے۔ کریمہ بی بی کو جب احسان ساتھ ناچنے کا کہتا ہے تو وہ صاف جواب دیتی ہے کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ہندوستان میں اس طرح کے کام معیوب سمجھے جاتے ہیں۔

نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی موضوعات خاص طور پر زیر بحث آئے ہیں۔ آزادی کے تصورات اور مارکسی نظریہ نے مل کر ہندوستان میں عجیب وصورت حال پیدا کر دی۔ سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' میں نو آباد کار کو سختی سے رد کیا ہے اور گوروں سے آزاد ہندوستان میں کمیونزم کو اپنانے کی سوچ ملتی ہیں کہ گوروں سے آزاد ہندوستان میں ہم اشتراکی طرزِ حکومت کا تجربہ کریں گے۔

سجاد ظہیر نے احسان اور اعظم کے ساتھ ساتھ چند دوسرے کرداروں کی صورت میں نو آباد کار کے بارے میں نو آبادی کی سوچ اور طریقہ کی تصویر کشی کی ہے اور مختلف آئی۔ سی۔ ایس آفیسر اور دیگر، گوروں کے پاؤں چاٹنے والوں کو کیسے نوازا جاتا ہے اور مقامی لوگوں کو تھوڑا سا اختیار مل جائے تو وہ گوروں سے وفاداری نبھانے کے لیے اپنے لوگوں کو گولیوں سے بھُن دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو ہر حال میں نو آباد کار سے وفاداری نبھانا ہوتی ہے۔ اگر ان گوروں کی جگہ کوئی اور بھی نو آباد کار (فاتح) ہوتا تو یہ سورج کے پوجاری اسی طرح کریں گے۔

برصغیر میں جزوی طور پر ۱۸۵۷ء سے پہلے کمپنی کا اختیار تھا، مگر اس سال کے بعد تمام برصغیر کلی طور پر تاج برطانیہ کے تحت آگیا۔ نو آباد کار نے اپنی مخصوص چالاکیوں سے اور حکمت عملی سے اپنے قدم مضبوط کیے اور ابتدائی دور سے ہی دیرپا منصوبہ سازی شروع کر دی تھی، مگر ۱۸۵۷ء کے بعد وہ بحیثیت کلی اختیارات کے مالک ہونے کے بعد تمام حربے استعمال کرنے میں مکمل طور پر آزاد تھے اور نو آباد کار (برطانیہ) نے مقامی طرزِ حکومت کو ہی برقرار رکھا۔ اپنے لوٹے ہوئے تمام وسائل سے تھوڑا سا حصہ ان مقامی راجوں، مہاراجوں، جاگیرداروں کو دے کر انہیں مقامی عام کسانوں پر محدود اختیارات سے نواز دیا گیا۔ یہ ان کا اپنا طریقہ کار تھا۔ برصغیر میں مقامی طرزِ حکومت کی وجہ سے مزدوروں اور عام کسانوں کے لیے دوہری غلامی کا دور تھا۔

نو آباد کاروں نے تعلیمی نظام ایسا اپنایا کہ ہم اسے ''غیر پیداواری'' کہہ سکتے ہیں۔ کمیونسٹوں کا آزادی کا تصور بنیادی طور پر اسی دوہری غلامی سے جان چھوڑانے کے لیے تھا۔ ''لندن کی ایک رات'' میں یہ تمام کہانی اسی تسلسل کے ساتھ موجود ہے۔ نو آبادی (برصغیر) کے لوگ کیا سوچتے ہیں اور اگر ان کو تھوڑا اختیار مل

جائے تو ان کا مقامی لوگوں کے ساتھ کیسا رویہ ہوتا ہے اور کیسے مال اکٹھا کر کے اپنے آقا کے سپرد کیا جاتا ہے۔
سجاد ظہیر نے ناولٹ میں نو آبادی کے احساس کمتری کو اجاگر کیا ہے کہ نو آباد کار نے ایک ایسا جادو کیا جس سے نو آبادی کے ذہن سے پہلے کی تمام تصاویر غائب ہو گئیں اور جب نئی تصاویر ان کے دماغ میں ڈالی گئیں وہ ان لوگوں کی اپنی نہیں تھیں مگر اب نو آباد کار کی منزل یہ تھی کہ یہ دیا گیا نیا ڈیٹا کو نہ صرف محفوظ کریں بلکہ اسے عملی طور پر اپنائیں۔ سجاد ظہیر نے نو آبادی کے رد وقبول کے اثرات کو بخوبی اجاگر کیا ہے سجاد ظہیر نے خان اور عارف کی شکل میں مقامی نو آباد کاروں کے آلہ کاروں کی تصویر کشی کی ہے۔ خان بس ایک بات بخوبی جانتا ہے کہ وہ نسلی طور پر امیر ہے اور اس کے باپ دادا بھی امیر کبیر چلے آرہے ہیں۔ اب اسے کسی کو منہ لگانے کی ضرورت نہیں سجاد ظہیر نے اسے آئینہ دیکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کیسے امیر ہوئے، دولت کی ریل پیل کیسے ہوئی، کیسے گوروں کی غلامی کر کے ان کے بوٹ چاٹ کر کیسے دولت مند ہوئے۔ جیسا کہ اشتراکیت یا ترقی پسند تحریک کے تحت لکھے گئے ادب پر الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ اس میں مقصد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ بات درست ہے مگر ادب میں اگر اس مقصد کا خلاء موجود نہ ہوتا تو بے ضرورت اس کے تحت ادب کوئی ادیب تخلیق نہ کرتا۔

سجاد ظہیر نے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں درج بالا دونوں کرداروں کے تناظر میں برصغیر کے لوگوں کی ذہنیت کا عکس پیش کیا ہے اور پھر انہیں احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دولت وثروت تمہیں اس طرح غلامی کر کے حاصل ہوا ہے، خواہ خان کے باپ دادا نے اورنگ زیب کی غلامی کی ہو، اس کے اصطبل صاف کیے ہوں یا موجودہ عہد کے برطانوی نو آباد کار کے مگر یہ سب حاصل نوکری چاکری سے ہی ہوا ہے۔ یہاں سجاد ظہیر کا اشارہ مسلمان نو آباد کاروں کی طرف ہے۔

برصغیر ایک طویل عرصہ سے غلامی میں چلا آرہا ہے۔ تغلق، لودھی، مغل دور بھی ایک طویل عرصہ پر پھیلا ہوا ہے اور اس کے بعد یورپی اقوام کا عہد ۱۴۹۵ء کے قریب شروع ہوتا ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' کے کرداروں کو سجاد ظہیر نے آزاد تلازمہ خیال اور سرئیلزم کے تحت اتنا خود مختار کر دیا ہے کہ وہ پوری دنیا کے اور خاص کر برصغیر کا عکس اسکرین پر بخوبی پیش کرتے نظر آتے ہیں اور قارئین ان کی باتوں کو سمجھتے ہیں۔ اعظم ایک ایسا طالب علم ہے جو ہندوستان سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن میں موجود ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ ہم نو آباد کار کے سامنے کتنے ذلیل گھٹیا انسان ہیں بلکہ ہمیں (مقامی نو آبادی) کو تو انسانوں کا درجہ بھی حاصل نہیں۔ انہیں تو جب چاہے دونوں آقاؤں میں سے جس کا دل چاہے مار دے۔

اصل میں اعظم کی طرح بہت سے لوگ نو آبادی کی اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی جان کتنی بے وقعت ہے۔ ۱۵، ۲۰ کو مار دینا گوروں کے لیے معمولی بات ہے اور وہ ان ہلاکتوں کے لیے کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔

برصغیر کی نو آبادی کے لیے ''کالے لوگوں''، ''نیٹو'' جیسے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جانوروں کی طرح کا رویہ رکھا جاتا ہے۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ دیکھ لیں، کبھی بھی کسی گورے فوجی نے ڈرانے کے لیے ادھر ادھر گولیاں نہیں چلائیں، تاک کر انسانوں کو ہمیشہ نشانہ بنایا گیا ہے اور اگر کبھی غلطی سے کسی کالے کے ہاتھ سے کسی گورے کا خون ہو جائے تو اس کے بدلے میں ۱۵، ۲۰ کالوں کو اڑا دیا جاتا ہے، پھر بھی صاحب بہادر لوگوں کا جی نہیں بھرتا، کیوں اگر جان قیمتی ہے تو وہ گوری چمڑی والے کی ہے، کالے تو غلام ہیں۔ لندن میں رہنے والے ہندوستانی طالب علم اپنے وطن کی غلامی کا احساس رکھتے ہیں۔ یہاں ''لندن کی ایک رات'' میں بھی واضح طور پر دو گروپ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف غلامی کو ترجیح دینے والے اور دوسری طرف نو آباد کار سے جان چھوڑانے کی کوشش کرنے والے لوگ ہیں، جو آزادی چاہتے ہیں۔

راؤ، اعظم اور احسان ایک مشترکہ کوشش پر یقین رکھتے ہیں کہ اجتماعی کوشش سے ہم ایک طرف برطانوی غلامی سے نکل سکتے اور اس کے بعد منصفانہ اصولوں پر قائم معاشرہ قائم کر سکتے ہیں، کیوں کہ انقلابِ روس عام کسانوں اور مزدوروں کی اجتماعی کوششوں سے لایا گیا تھا اس لیے راؤ نہ تو گاندھی کے چرخہ کاتنے کو ملک کی خدمت گردانتا ہے اور وہ ان سیاست دانوں کی چالیں سمجھتا اور جانتا ہے کہ یہ محض اپنے اپنے مفادات کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس عہد کے سیاست دانوں کے لیے بھی لندن دار الحکومت تھا اور آج بھی پاکستانی سیاست دانوں کے لیے دار الحکومت لندن ہے۔ نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی طرز میں یہاں محدود فرق کے علاوہ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

نو آباد کار نے زبان کے ذریعے بھی جو کھیل کھیلا وہ مابعد نو آبادیاتی دور میں ویسا ہی کھیلا جا رہا ہے۔ آج بھی بیوروکریسی کے لوگ اور سیاست دان انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور یہ بات بھی ان کے لیے کوئی تعجب کا باعث نہیں کہ انہیں اُردو نہیں آتی۔ مسلمان کلکٹر تو اپنے مذہبی تہواروں کو بھی بھلا بیٹھا ہے اور کہتا ہے کہ آج مسلمانوں کا عید ہے، گوروں کی طرح ہی مذکر مونث کو بدل کر بولتا ہے اور ان کی طرح ہی اٹھتا بیٹھتا ہے اور آقا کے حکم کی تکمیل میں سر تسلیم خم کرتا ہے اور اپنے مقامی آنے والے سائلین کو ہمیشہ

زمین پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ نو آبادکار کے بازوؤں میں خود بیٹھ کر دیگر عام لوگوں کو اپنے پاؤں میں بٹھا کر بدلہ لیتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ میں کامیاب ہوں۔

ان کرداروں کے نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی اثرات کا جائزہ لیں تو یہ تسلسل آج تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں آج بھی چل رہا ہے۔ نو آبادکار نے عام پبلک اور کسانوں سے اپنے آپ کو کنارہ کش رکھا۔ آج بھی حکمرانوں کے قریب جانے والوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا ہے اور اس عہد کے سیاست دانوں کی طرح ایک ہی رٹ لگائے ہوتے ہیں کہ ہم عوام کی بھلائی چاہتے ہیں، ہم سیاست کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔

راؤ، اعظم اور خود سجاد ظہیر کا عکس احسان ایک طرف مایوسی کا شکار ہوتے ہیں کہ عوام آگاہ نہیں اور جوتے کھا کر بھی اُف تک نہیں کرتے، الٹا سزا پانے میں مزا محسوس کرتے ہیں اور چپ چاپ بھوکے مرنے کو بولنے کے مقابلے میں بہتر سمجھتے ہیں۔

مختلف کرداروں کے ذریعے یہ چیز عیاں ہوں ہے کہ دنیا بھر کے مزدوروں اور عام کسانوں کے مسائل ایک جیسے ہیں اور اسی لیے وہ مارکسی نظریات کو اپنے لیے خلاصی کا راستہ سمجھتے ہیں۔ ٹام، جم اور دیگر انگریز مزدور جو میں بیٹھے ہیں ان کے لیے میں بھی الگ جگہ ہے اور وہ بھی صنعتی ترقی کے باوجود بھوکے پیٹ سونے پر مجبور ہیں۔ اسی لیے فاشٹ نظریات نے دنیا بھر کے لوگوں کو ہم خیال بنایا۔ ان مزدوروں اور کسانوں کو متاثر کیا اور انہیں جدوجہد کے لیے ''سرخ انقلاب'' کی راہ دکھائی۔

ٹام یہاں ہمیں دو تصویروں میں فرق دکھاتا ہے۔ ایک وہ تصویر ہے جس کو نو آبادکار اپنے مخصوص مقاصد کے تحت دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس تسلط کو الٹا نو آبادی کے لیے ایک نعمت گردانا جاتا ہے کہ اگر ہم چلے گئے تو یہاں ہندو مسلمان فسادات شروع ہو جائیں اور تمام لوگ ایک خانہ جنگی میں پھنس جائیں۔ ہم پر نو آبادکاروں کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے یہاں قبضہ بلکہ امن و امان قائم کر رکھا ہے۔ ورنہ یہاں قتل عام شروع ہو جاتا اور تباہی و بربادی ان لوگوں کا مقدر بن جاتی، اس لیے یہاں ہماری موجودگی بے حد ضروری ہے تاکہ سلامتی کو یقینی بنایا جا سکے، لوگوں کو حقوق مل جائیں۔ مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی یہی حقوق دلانے کے نام پر لوگوں کے حقوق سلب کیے جا رہے ہیں۔ مگر انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔

دوسری تصویر ٹام ہمیں اندر کی دکھاتا ہے کہ اصل اندرونی کہانی کیا ہے؟ اور یہ تصویر پہلی تصویر سے بالکل مختلف ہے۔ ٹام بتاتا ہے کہ میں خود بطور فوجی ہندوستان میں رہا ہوں، وہاں کے (ہندوستان) حالات اس

طرح کے نہیں ہیں، جس طرح برطانوی حکومت اپنی عوام اور دنیا کو بتاتی ہے اور نو آباد کار نے وہاں صرف اور صرف وسائل لوٹنے کے لیے قبضہ کیا ہوا ہے، اگر ان کی باتیں درست ہوں تو برطانوی اختیارات سے پہلے بھی ہندوستانی اکٹھے رہتے تھے اور ان میں کبھی فرقہ پرستی پر خانہ جنگی نہیں ہوئی۔

پراپیگنڈا کے زور پر دنیا میں اس طرح کے کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ طریقہ کار میں تبدیلی کے ساتھ اب مابعد صورت حال میں عراق پر حملہ اور دیگر ممالک پر حملے، کہ ان کے پاس خطرناک ہتھیار ہیں۔ پاکستان پر آج بھی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ پاکستان اپنے ایٹمی ہتھیاروں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ غرض دنیا میں میڈیا کے زور پر ڈرامابازی کرنے والے کامیاب ہوتے رہے ہیں۔

ٹام، جم کو جب اندر کے حالات و واقعات اور عہدے داروں کا دیا گیا سبق بتاتا ہے۔ تو اس کی سوچ بدل جاتی ہے۔ ٹام کہتا ہے کہ مرے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی تھی کہ یہ ''کالے لوگ'' رحم کے قابل نہیں اور ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک روا رکھنا چاہیے۔ ٹام اپنے مطالبات کے لیے کی گئے احتجاج کی مثال دیتا ہے کہ جب ہم احتجاج کرتے ہیں تو اخبارات ہمیں ہمیشہ غلط بتاتے ہیں اور ایک پراپیگنڈا کے ذریعے لوگوں کو حقیقت کی بجائے الٹا ہمیں گناہ گار دکھایا جاتا ہے۔

جب لال ٹماٹر جیسے چہرے والا گورا جس طرح ہندوستانیوں کو مخاطب کرتا ہے اس سے گوروں کی نفرت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور اس کی باتوں سے راؤ اور اعظم محسوس کرتے ہیں کہ یہ تو اس ذلت کا ایک حقیر سا حصہ ہے جو ہندوستانیوں کے لیے گوروں کے دل میں ہے، جب کہ یہ بات عیاں ہے کہ وسائل لوٹنے کے علاوہ برطانیہ کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ خام مال اور دیگر مال و متاع یہاں سے لندن منتقل کیا گیا اور ہندوستان کو زراعت پر جامد رکھا۔

گوروں میں بھی بہت سے ایسے ہیں جو اس بات کا ادراک رکھتے ہیں کہ ہمیں ہندوستان کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے اور انہیں اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے دینا چاہیے اور اس میں وہ مثال دیتا ہے کہ ہم نہیں چاہیں گے کہ ہمارے ملک برطانیہ پر فرانس یا جرمنی اس طرح قبضہ کرے۔ اگر ہم آزادی کو پسند کرتے ہیں اور غلامی کو ناپسند کرتے ہیں تو دوسرے ملکوں اور اقوام کے لیے دوہری پالیسی کیوں ہے۔ شیلا گرین بھی اس طرح ایک جملے میں اظہار کرتی ہے کہ تم ہندوستانی تاریک انگریزی موسم کو گالیاں دیتے ہوئے ہندوستان پر قبضہ تک برطانیہ اور ہندوستان دونوں زرعی ملک تھے اور بعد میں دیکھیں ہندوستان اندھیروں میں گرتا گیا اور برطانیہ

ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا۔ دولت و وسائل ہندوستان سے لوٹ کر برطانیہ منتقل کیے گئے اور وہاں ان سے انقلاب برپا ہوا۔

عارف کی گفتگو سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہندو ممتحن نے اسے مسلمان ہونے کی وجہ سے آئی۔ سی۔ ایس میں فیل کیا۔ یہ بات تو ہندوستان کی تاریخ سے ثابت ہے کہ ہندوؤں نے تعلیم کو ترجیح دی اور مسلمانوں نے انگریزی زبان سے گوروں سے نفرت کی وجہ سے نفرت کی اور ہندوؤں کے لیے تو آقا بدلا تھا انہوں نے اپنے نئے آقا کو وفاداری کا یقین دلا دیا، مگر مسلمان اس طرح کی باتوں سے دور تھے۔

شیلا گرین کو والدین کی طرف سے ایک نصیحت جو اسے بار بار کی گئی کہ ان ''کالے لوگوں'' کے قریب نہ جانا کیوں کہ وہ تو ہاتھ ملانے کے قابل بھی نہیں، گفتگو تو دور کی بات ہے مگر شیلا گرین نے اس نصیحت کے الٹ کیا۔ جب کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی، جو بات اس کے ذہن میں ڈالی گئی ایسی بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا، ہندوستانیوں کا گوری لڑکیوں سے عشق کرنا ایک ماحول کی تبدیلی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستان میں پردے کا سختی سے رواج تھا اور ہندوستان کے مقابلے میں برطانیہ میں ایک کھلا ماحول تو یہ کشش ایک فطری بات تھی۔

برطانوی نو آباد کار نے شروع سے حکمرانوں (نو آباد کار) اور مقامی لوگوں یا عام پبلک کے درمیان ایک فرق رکھا اور اپنے آپ سے عام عوام کو دور رکھنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے گئے تاکہ عوام پر ہمارا رعب قائم رہے اور ممکن ہے، کہ اس میں کالے لوگوں سے نفرت کا عنصر بھی شامل ہو مگر یہی فرق مابعد نو آبادیاتی دور میں بھی اپنے اثرات دکھا رہا ہے۔ موجودہ دور میں بہت سی آئینی شقیں اور قوانین کلی طور پر یا جزوی طور پر نو آبادیاتی دور سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ بیوروکریسی اور عام لوگوں کے درمیان انسانی اور غیر انسانی مخلوق جیسا فرق روا رکھا جاتا ہے۔

''لندن کی ایک رات'' میں کمیونزم کے نظریات اور سوچ کی تبلیغ سے انکار نہیں کیا جا سکتا اپنے عہد اور تخلیق کار کی سوچ کے تناظر میں یہ اپنے عہد کا بخوبی عکس پیش کرتا ہے اور ہم اس دور کے برصغیر اور اس خطہ کے بارے میں نو آباد کار کی سوچ اور مقامی نو آبادی کا عمل اور ردِ عمل اور ہندوستان میں مافیا جو مزدروں اور عام کسانوں کا خون نچوڑ رہی ہے اس کے بارے میں نو آباد کار کی آشیر باد حاصل ہونے یا ان سے اختلاف کی صورت میں نتائج اور ان کے اثرات ردِ قبول کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے کیا ہوتے ہیں اور عام لوگ کیا۔

خان کی سوچ اپنی سطح پر مگر یہ سب کیسے حاصل ہوا، احسان کے جواب پر وہ ہر بات کو ''بالشویک نظریات'' سے جوڑتا ہے۔ نوآبادی کو کنٹرول کرنے میں ظلم کرنے میں ان اپنے مقامی لوگوں نے بھی اپنا کردار بڑی دھوم سے ادا کیا۔ خان یہاں بھی احسان کی ہر بات کو مارکسزم سے جوڑتا ہے کہ یہ سارے سرخے ہیں۔

یہاں اس ناولٹ کے تناظر میں ہم سجاد ظہیر کے نظریات کو مارکسی نظریہ کے تناظر میں بخوبی جان سکتے ہیں کہ احسان جو کہ ہمیں خیالات اور نظریات میں سجاد ظہیر کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ معاشرہ کے لیے ایسے افراد کو بوجھ سمجھتا ہے کہ جو عام عوام کا خون پی کر پھل پھول رہے ہیں۔ ان کو ختم کر دینا چاہیے اور کاٹ کر کھیتوں میں بطور کھاد ان کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ آمدن بڑھے۔

معاشرے کے بڑے بڑے زمین دار، وکیل، مہاجن غرض جو معاشرے کو نقصان پہنچاتا ہے اور عام لوگوں کو لوٹتا ہے، اسے ختم کر دینا چاہیے، مگر سجاد ظہیر نے ان درج بالا لوگوں کی موجودہ دور میں حالت خوب انداز میں بیان کی ہے کہ اکبر اور انگریزوں کے نوازے ہوئے اب دونوں مل کر انہی انگریزوں کے بوٹ چاٹتے ہیں۔

یہ دور اور خاص کر بیسویں صدی کے آغاز میں مارکسی نظریات پوری دنیا میں پھیلتے نظر آرہے ہوتے ہیں اور زندگی کا ہر شعبہ میں ان نظریات کا عمل دخل ہوتا ہے کوئی ملک، کوئی فرد جو سوجھ بوجھ رکھتا ہے وہ لازمی ان سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس لیے آزادی کا تصور کیسے مارکسی نظریات اور کمیونزم کی تحریک سے بچ سکتا ہے۔ خان اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ آج کل سیاست اور خاص کر سیاست میں مارکسی سوچ اور یہ سوچ کثیر تعداد میں لوگوں کو ہم خیال بنا رہی ہے۔ اس لیے وہ اس سوچ سے دور بھاگتا ہے کہ جہان جاؤ یہ سیاست کی باتیں ہو رہی ہیں۔

برصغیر میں ایسے مقامی آلہ کار، سہولت کار بھی سرمایادارانہ طرزِ حکومت کی طرف برابر مزاحمت پر اترے ہوئے تھے کہ یہ نظام نہیں بدلنا چاہیے، کیوں کہ یہ نظام ان کی جھولی بھر رہا تھا اور عام لوگوں کی جھولی خالی ہو رہی تھی اور وہ دو وقت کی روٹی کے لیے بھی ترس رہے تھے۔ یہاں ایک ایسی آزادی کا تصور ہے جس میں مارکسی نظریات کی پیروی کی جائے اور ان پر عمل کیا جائے، لیکن یہ مارکسی سوچ منافع میں برابری اور وسائل کی برابر تقسیم کی باتیں سرمایاداروں کی سمجھ میں نہیں آتیں کیوں کہ وہ سمجھنا نہیں چاہتے۔ جب کہ یہی باتیں غریب مزدوروں اور عام کسانوں کو اچھی طرح سمجھ آجاتی ہیں کیوں کہ ان میں انہی کا مفاد اور بھلا ہے۔

کامیاب انقلاب روس کے بعد انہیں امید نظر آتی ہے کہ ہمیں جاگنا چاہیے اور اپنی بھلائی اور حقوق کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے تا کہ ہمیں بھی اچھی زندگی گزارنے کا حق مل سکے۔

عارف، خان اور دیگر کرداروں اور لوگوں کو جو یہ سوچ رکھتے ہیں وہ ان کے آقا کے لیے سود مند ہے اور آقا کو سرمایا دارانہ طرزِ حکومت پسند ہے اور کمیونسٹ ان دونوں کو سخت ناپسند ہیں، کوئی اپنے آقا کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس نظام میں وہ امیر کبیر ہوئے ہیں، عارف کو محدود اختیارات مل جائیں گے۔ درج بالا لوگ کیوں جائیں گے کہ ان سے مال دولت چھین لینے والا نظام آئے۔ عارف کے ساتھ چلنے والی لڑکی میوزیم کے پاس سے گزرتی ہے تو وہ برٹش شہروں پر بات شروع کر دیتی ہے کہ یہ موجودہ دور میں اپنی دہشت قائم نہیں رکھ پائے، مگر اب یہ سانپ کی طرح زہر سے بھر گئے ہیں۔

اگر ان آخری نو آبادیاتی عہد کے ۵۰ سالوں کا جائزہ لیں تو ہمیں اس لڑکی (شیلا گرین) کی بات درست لگتی ہے کیوں کہ اس دور میں نو آبادی سے سر اٹھانے والوں کو مار دیا جاتا اور کمیونسٹ کو جیلوں میں ڈال دیا جاتا اور بار بار مختلف مواقع پر نو آبادکار نے عام لوگوں کو حق کے لیے آواز اٹھانے پر گولیوں کا نشانہ بنایا اور اگر کبھی کسی گورے کو کوئی نقصان پہنچا تو پھر بھی ایک گورے کے بدلے ۲۰ یا ۳۰ کالے لوگوں کی جان گئی۔ مختلف کرداروں کو احساس ہے کہ ہماری یعنی کالے لوگوں کی جان کیڑے مکوڑوں سے بھی سستی ہے اور آقا کو کون پوچھ سکتا ہے۔ کالوں کے وسائل تو پسندیدہ ہیں مگر یہ کالے لوگ قابل نفرین ہیں۔ ان کے منہ نہ لگنا چاہیے اور نہ ان کو منہ لگانا چاہیے یعنی ایک اچھوت کا تصور قائم کیا گیا۔

شیلا گرین بے مقصد ادب اور رومانوی شاعری کو ہندوستانیوں کے سست ہونے کی وجہ بتاتی ہے اور نعیم الدین اس کی اس بات سے اتفاق کرتا ہے۔ یہاں مقصدی ادب کی طرف اشارہ ہے کہ شاعری انسانوں کو بے عمل کر دیتی ہے اور ہندوستانی اگر شاعری پڑھتے ہیں اور وہ اسی نیم مدہوشی کی کیفیت میں زندگی گزارتے ہیں اسی لیے وہ اسی وجہ سے دنیا سے کٹ گئے ہیں۔ یہاں صرف وہ لیکھا جائے جس سے کوئی فائدہ حاصل ہو۔

ب) نتائج:

'لندن کی ایک رات 'نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ ''موضوع پر کی جانے والی تحقیق میں ابتدائی طور پر پیدا ہونے سوالات کے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

ا۔ نو آبادیاتی نظام سے مراد ایسا نظام ہے جس میں کوئی ملک کسی دوسرے خود مختار علاقہ پر تسلط قائم کر کے اسے اپنی نئی آبادی بنالیتا ہے۔ برصغیر میں انگریز نو آباد کار نے مختلف حوالوں سے اثرات مرتب کیے۔ نو آبادیاتی عہد میں تو وہ اثرات طاقت کے زور پر جب کہ مابعد عہد میں وہ مخصوص ذہن سازی کے تحت اپنا اثر دیکھا رہے ہیں۔

۲۔ لندن کی ایک رات میں سجاد ظہیر نے نو آباد کار اور نو آبادی کے تعلق کی وضاحت مختلف پہلوؤں سے پیش کی ہے جن میں تہذیبی و ثقافتی پہلوں نمایاں ہیں، فاتح کے اثرات ہمیشہ مفتوح پر زیادہ پڑتے ہیں، اس لیے نو آبادی صرف پیروی میں ان اثرات کو قبول کرتی ہے۔

۳۔ لندن کی ایک رات میں نو ابادی کی ذہنی کفیت کو بخوبی اجاگر کیا گیا ہے، کی کیسے وہ صرف تقلید شروع کر دیتی ہے، غلامی اور آزادی کے خواہاں لوگوں کے خیالات کی منظر کشی یا نمائندگی احسن انداز میں کی گئی ہے۔

ج) سفارشات:

''لندن کی ایک رات 'نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ '' مقالہ پر تحقیق کے بعد درج ذیل سفارشات کی جاتیں ہیں۔

ا۔ ''لندن کی ایک رات'' کا الگ سطح پر مارکسی مطالعہ و تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنے عہد اور اشتراکیت کی ذیل میں بہت اہمیت کا حامل ہو گا۔

۲۔ ''لندن کی ایک رات'' کا اپنے عہد کے کسی دوسرے ناول سے تقابلی جائزہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں ہو گا۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۴ء

ثانوی مآخذ:

ایڈوڈ سعید culture and imperialism، مترجم یاسر جواد، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

ایمی سیزر، نو آبادیاتی نظام کا محاکمہ، مترجم، خالد محمود ایڈوکیٹ، فکشن ہاوس، لاہور،

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، س ن

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ۲۰۱۵ء

اے بی اشرف، ڈاکٹر، ادب اور سماجی عمل، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۷۰ء

احتشام حسین، ادب اور سماج، کتب پبلیشرز، بمبئی: ۱۹۴۷ء

اے اے فاطمی، ترقی پسند تحریک سفر در سفر، ادارہ نیا سفر، الہ آباد: ۲۰۰۶ء

انور پاشا، ترقی پسند اردو ناول، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی: ۱۹۹۰ء

باری علیگ، کمپنی کی حکومت، دارالشعور، لاہور: ۱۹۹۹ء

بیورے نکولس، برطانوی ہندوستان کا مستقبل، مترجم، ثمینہ راجہ، عظیم الرحمن فرقان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۰۹ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء

جمال نقوی، ترقی پسند تحریک، ادب اور سجاد ظہیر، احمد برادرز، کراچی، ۲۰۰۶ء

پروین کلو، ڈاکٹر، اردو فکشن پر روسی ادب کے اثرات، روٹشینل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۲ء

جواہر لال نہرو، آپ بیتی، مترجم، اختر حسن، المخزن پرینٹگ پریس، لاہور: ۲۰۰۸ء

حسین احمد، مدنی، برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا، طبع ششم، طیب پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۲ء

حمزہ علوی، جاگیر داری اور سامراج، مترجم، طاہر کامران، فکشن ہاؤس، لاہور: ۲۰۱۲ء

خلیل الرحمن اعظمی۔ اردو میں ترقی پسند ادب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء
رفیق ذکریا، ڈاکٹر، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، اردو ترقی بیورو، دہلی: ۱۹۸۵ء
ریاض ہمدانی، ڈاکٹر۔ اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ، فکشن ہاؤس، لاہور: ۲۰۱۸ء
سید جعفر احمد، سجاد ظہیر. شخصیت اور فکر، مرتبہ، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۵ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء
سجاد ظہیر، راشنائی، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۷۱ء
سجاد ظہیر، انگارے (افسانوی مجموعہ)، مکتبہ دانیال، کراچی: ۱۹۷۹ء
سجاد ظہیر، نقوش زنداں (خطوط)، مکتبہ دانیال کراچی: ۱۹۵۱ء
سجاد ظہیر، ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، تہذیب و ترتیب، گوپی چند نارنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء
سجاد ظہیر، مضامین سجاد ظہیر، اتر پردیش اکادمی، لکھنو: ۱۹۷۹ء
سبط حسن، مغنی آتش نفس سجاد ظہیر، مرتبہ، ڈاکٹر سید جعفر احمد، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۵ء
سبط حسن، مارکس اور مشرق، مکتبہ دانیال، کراچی: ۲۰۱۶ء
صباء عارف، اردو میں ناولٹ نگاری، ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء
قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء
قمر رئیس، ہندوستانی ادب کے معمار سجاد ظہیر، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء
عتیق احمد، سجاد ظہیر تخلیقی اور تنقیدی جہات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء
علی احمد فاطمی، سجاد ظہیر ایک تاریخ ایک تحریک، جوش اینڈ فراق لٹریری سوسائٹی، الہ آباد: ۲۰۰۶ء
عبدل الباری، بیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ. مشرق و مغرب کی تہذیبی اقدار وافکار کی کشمکش کے حوالے سے، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی: ۲۰۱۱ء
علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء
عبد السلام، پروفیسر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۷۳ء
ظہیر کاشمیری، ادب کے مادی نظریے، کلاسیک، لاہور، ۱۹۷۵ء
ظفر امام، مارکسزم ایک مطالعہ، مسلمانوں کا سوشلسٹ سنٹر، دہلی ۱۹۷۱ء

لینن ریاست اور انقلاب، دار الاشاعت ترقی، ماسکو، ۱۹۷۱ء
محمود بریلوی، مختصر تاریخ ادب اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء
محمد فیروز، ڈاکٹر، لندن کی ایک رات خصوصی مطالعہ اور تجزیہ، مع حیات و خدمات سجاد ظہیر، ساقی بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۶ء
مظہر جمیل، سید، انگارے سے پگھلا نیلم تک نئے گوشے نئے تناظر، اکادمی بازیافت، کراچی: ۲۰۰۵ء
محمد رؤف، اردو غزل مابعد نو آبادیاتی مطالعہ، روہی بکس، فیصل آباد: ۲۰۱۵ء
محمد مسعود خالد، نو آبادیاتی معاشی ڈھانچے کا تسلسل، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء
محمد مسعود خالد، نو آبادیاتی نظام کا تعارف، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، س ن
محمد مسعود خالد، نو آباد بادیاتی تعلیمی ڈھانچے کا تسلسل، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء
محمد مسعود خالد، نو آباد بادیاتی انتظامی ڈھانچے کا تسلسل، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، س ن
محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، پاکستان رائٹر کو آپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۶ء
محمد افضل بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳ء
ناصر عباس نیر، اردو ادب کی تشکیل جدید. نو آبادیاتی اور پس نو آبادیاتی عہد کے اردو ادب کے مطالعات، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی: ۲۰۱۶ء
مبارک علی، ڈاکٹر، برطانوی راج، تاریخ پبلیکشنز، لاہور: ۲۰۱۶ء
ناصر عباس نیر، ثقافتی شناخت اور استعماری اجاراداری نو آبادیاتی عہد کے اردو نصابات کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۱۴ء
ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد: ۲۰۰۹ء
نصیر الدین ازہر، ڈاکٹر، سجاد ظہیر حیات و جہات، مظہر پبلی کیشنز، نئی دہلی: ۲۰۰۴ء
یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء
یعقوب نظامی، پاکستان سے انگلستان تک، نگارشات پبلیشرز، لاہور: ۲۰۰۶ء

انگریزی کتب

- Ania Loomba, colonolism, Post-Colonialism, Routledge, New Yark1998.
- Bill Ashcroft,Gareth Griffiths,Helen Tiffin,key concept in post colonial studies,By Routledge 11 ,New Fetter Lane,London, 2010
- Lokangaka Losambe and Devi Sarinjeive,Pre colonial and post colonial Drama and theatre in Africa,New Africa books,Claremont,south Africa 2001

رسائل وجرائد:

ادبیات، سہ ماہی، اکادمی ادبیات، اسلام آباد

اخبار اردو، ماہ نامہ، ادارہ فروغ زبان اردو، اسلام آباد

تخلیقی ادب، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لیگو یجز، اسلام آباد

دنیا زاد ، کتابی سلسلہ، ترتیب، آصف فرخی، کراچی

راوی، سالانہ، جامعہ پنجاب، لاہور

روح ادب، سہ ماہی، (سجاد ظہیر نمبر)، شمارہ ۲۴۔ جلد ۸۸، ۸۷، مارچ:۲۰۰۸

سیپ، سہ ماہی، (ناولٹ نمبر) شمارہ ۲۰۰۱:۱۰ء

مغربی بنگال، سہ ماہی (سجاد ظہیر نمبر) شمارہ، ۲۲، ۲۱۔ جلد ۵۳، نومبر:۲۰۰۶ء